



جواہر شریعت

مجموعہ رسائل
جلد سوم

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیحیہ العلوم ریسنگٹور

مکتبہ مسیحیہ الامت دہلی و بنگلور

محفوظ جميع الحقوق



نام کتاب : جواہر شریعت جلد سوم

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دابر کاہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیحیہ العلوم ریسٹنگ
وفیقہ حضرت آقا محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی علیہ تالیم و تہذیب و تقویٰ و تقویٰ

صفحات : ۶۱۴

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت ایڈیٹرز و پبلشرز

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای میل : maktabahmaseehulummata@gmail.com

جواہرِ شریعت (جلد سوم)
پر ایک اجمالی نظر

- ☆ حقوق القرآن
- ☆ اسلام میں عورت کا کردار
- ☆ شفاء القلوب
- ☆ تحفۃ السالک
- ☆ احکام شعبان و شبِ برأت - تحقیق کے آئینے میں
- ☆ دیوبندیت و بریلویت - دلائل کے آئینے میں
- ☆ منکراتِ رمضان
- ☆ نفحاتِ رمضان

فہرست

صفحہ	عناوین
	حقوق القرآن
۲۴	حرف اول
۲۶	عظمت قرآن
۲۷	فتنہ خلق قرآن اور امام احمد رحمۃ اللہ کا ابتلا
۲۸	قول ثقیل کی تفسیر
۲۸	قرآن کی عظمت کا اثر مخلوقات پر
۲۹	نزول قرآن کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ کی کیفیت
۳۱	ہماری غفلت شعاری
۳۲	عظمت قرآن کے تقاضے
۳۲	عظمت قرآن کا پہلا تقاضا ایمان بالقرآن
۳۳	دوسرا تقاضا - تعلیم القرآن
۳۴	قرآن مجید و حدیث کا تلازم

۳۶	دوزخ سے بچو اور بچاؤ
۳۶	ایک ضروری بات پر تنبیہ
۳۷	عظمت قرآن کا ایک واقعہ
۳۸	قرآن مجید کا احترام کیجئے
۳۹	محبت قرآن
۴۰	کلام خداوندی آئینہ جمال خداوندی ہے
۴۰	عالمگیر رحمۃ اللہ کی صاحبزادی کا واقعہ
۴۱	قرآن سے محبت پر جنت کی بشارت
۴۲	قرآن سے محبت اللہ کی محبت کا ذریعہ
۴۳	ہماری حالت کا جائزہ
۴۴	ایک بڑھیا کا قرآن سے عشق
۴۶	تلاوت قرآن
۴۶	تلاوت کے فضائل و فوائد
۴۸	تلاوت قرآن پر نزول سکینہ
۴۸	تلاوت کے دنیوی فوائد
۵۰	عالموں کے چکر میں نہ پھنسیں
۵۱	ایک غلطی کی اصلاح
۵۲	قرآن سے فال نکالنے کا حکم
۵۲	قرآن کی فضیلت
۵۳	تجوید و ترتیل کی ضرورت

۵۴	تجوید کے غلط معنی اور ایک لطیفہ
۵۵	تجوید کے دو درجہ ہیں
۵۵	چند مثالیں
۵۷	کیا قرآن کی تلاوت بغیر سمجھے درست ہے
۵۸	تدبر قرآن
۵۹	دو انتہا پسندانہ نظریات
۶۰	تدبر قرآن کے فوائد
۶۱	قرآن فہمی کے لیے استاذ کی ضرورت
۶۱	ہر آدمی کو اجتہاد کا حق نہیں ہے
۶۳	اطاعت قرآن
۶۴	قرآن میں ہدایت
۶۴	ایک خطرناک غلطی کا ازالہ
۶۵	اگر ہم سے پوچھا جائے تو
۶۶	اطاعت قرآن کا محدود تصور
۶۷	قرآن پر عمل کرنے کی فضیلت
۶۸	قیامت کے دن قرآن حجت ہوگا
۶۹	مؤمن کی شان یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرے
۶۹	قرآن پر عمل کرنے کا ثواب
۷۰	قرآن پڑھنے والے کیسے ہوتے ہیں
۷۱	قرآن کا نزول عمل کے لیے ہوا ہے

۷۱	حرف آخر
	اسلام میں عورت کا کردار
۷۴	تقریظ
۷۵	تقریظ
۷۷	انتساب
۷۸	التقدیم
۸۰	فصل اول۔ اسلام میں عورت کا مقام
۸۰	عورت بہترین دولت
۸۱	نبی ﷺ کی پسند
۸۲	عورتیں مردوں کے ہم دوش
۸۳	عورتوں کے حق میں خیر کی وصیت
۸۳	عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق کی تلقین
۸۵	فصل ثانی۔ عورت، کتنی اچھی کتنی بری
۸۹	فصل ثالث۔ مومن عورت کے اوصاف، قرآن کے آئینہ میں
۹۰	آیت کا شان نزول
۹۱	مومن عورت کے قرآنی اوصاف
۹۸	فصل رابع۔ مومن عورت کے اوصاف احادیث کی روشنی میں
۹۸	دین داری، عورت کا کمال
۹۹	عفت و پاک بازی
۱۰۰	پردہ وحیا

۱۰۲	کیا عورت کے لیے چہرہ کا پردہ ہے؟
۱۱۲	گھریلو کام کی عادت
۱۱۴	علم دین کی طلب و تڑپ
۱۱۶	عبادت و تقویٰ
۱۱۷	ذکر و تلاوت کی پابندی
۱۲۰	فصل خامس - عورت کے لیے ناپسندیدہ صفات و اعمال
۱۲۰	جاہلی تبرج
۱۲۲	عورت کی امارت
۱۲۳	بے حیائی و بے پردگی
۱۲۵	مردوں سے مشابہت
۱۲۶	باریک کپڑے پہننا
۱۲۷	بلا محرم سفر
۱۲۹	آرائش و زیبائش میں حدود سے تجاوز
۱۳۳	بدن گودنایا گدوانا
۱۳۴	بال نوچنا
۱۳۴	بالوں میں بال ملانا
۱۳۷	دانتوں کے درمیان جگہ بنانا
۱۳۸	سر پر چوٹ اہنانا
۱۳۸	سر کھلا رکھنا
۱۴۱	فصل سادس - عورت اور ازدواجی زندگی

۱۴۲	شوہر کی عظمت و عزت
۱۴۵	شوہر کی اطاعت و خدمت
۱۴۸	شوہر کی رضا و خوشی کا اہتمام
۱۵۱	ایک تنبیہ
۱۵۲	شوہر کی ناشکری و ناقداری سے پرہیز
۱۵۴	شوہر کے لیے زیب و زینت
۱۵۶	گھر اور بچوں کی حفاظت
۱۵۷	بچوں کی تربیت و نگرانی
۱۶۲	شوہر کے والدین اور رشتہ داروں سے سلوک
۱۶۳	گھریلو کام کس کی ذمہ داری ہے؟
۱۶۴	نباہ کی کوشش
۱۶۶	ولادت اور ضبط ولادت
۱۷۴	فصل سابع - عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟
۱۷۴	ایک حدیث کی عجیب تشریح
۱۷۶	ناقص العقل والدین ہونے کی تشریح
۱۷۷	عورت اور تعلیمی سرگرمیاں
۱۸۲	ایک انتباہ
۱۸۳	عورت اور سیاسی و ملی خدمات
۱۸۷	عورت اور ووٹ ایک واقعہ
۱۸۸	عورت اور سماجی خدمات

۱۹۰	عورت اور معاشی سرگرمیاں
۱۹۶	عورت اور دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں
۱۹۸	دعا و اختتام
شفاء القلوب	
۲۰۱	تقریظ
۲۰۲	نقش اولین
۲۰۴	قلبی امراض کا ثبوت
۲۰۷	امراض قلوب کی فہرست
۲۰۹	باطنی امراض — ظاہری گناہوں کا سبب
۲۱۰	مرض کی حقیقت
۲۱۳	فساد قلبی سے شیطانیت، حیوانیت و درندگی پیدا ہوتی ہے
۲۱۴	شیطانیت سے پیدا ہونے والی برائیاں
۲۱۴	حیوانیت سے پیدا ہونے والی برائیاں
۲۱۴	درندگی کے کارنامے
۲۱۴	اصلاح قلب اور اس کی برکت
۲۱۵	ایک حدیث کی تشریح
۲۱۷	قلبی امراض — جسمانی امراض سے زیادہ خطرناک
۲۱۸	اصلاح قلب کی اہمیت
۲۲۰	اصلاح قلب کا طریق
۲۲۲	تفصیلی جواب

۲۲۳	مجاہدہ کی ضرورت
۲۲۵	مجاہدہ کیوں؟
۲۲۶	ایک عمدہ مثال
۲۲۷	ایک عام غلط فہمی کا ازالہ
۲۲۸	نفس کی تین قسمیں
۲۲۹	نفس امّارہ کیا ہے
۲۲۹	نفس نواۓہ کی تعریف
۲۳۰	نفس مطمئنہ کی حقیقت
۲۳۱	مجاہدہ اجمالی
۲۳۱	قلّت کلام
۲۳۳	قلّت طعام
۲۳۴	قلّت منام
۲۳۵	قلّت اختلاط مع الانام
۲۳۷	ضرورتِ شیخ
۲۳۸	شیخ کامل کی پہچان
۲۴۰	شیخ سے استفادہ کا طریقہ
۲۴۵	قلب سے متعلق وارد بعض احادیث مع مختصر تشریح
۲۵۲	دعا و اختتام
تحفۃ السالک	
۲۵۴	حرف آغاز

۲۵۶	ہر مومن قانون شرع کا پابند ہے
۲۵۹	شریعت میں ظاہری و باطنی دونوں قسم کے احکام ہیں
۲۶۴	سلوک کی ضرورت
۲۶۵	سلوک میں مجاہدہ کی اہمیت
۲۶۸	مجاہدہ کی حقیقت
۲۷۲	سالک کا پہلا قدم - توبہ
۲۷۷	سالک کے لیے علم دین ضروری ہے
۲۸۴	شیخ کامل کی تلاش
۲۸۷	شیخ کامل کی پہچان
۲۹۰	شیخ کے حقوق و آداب
۲۹۲	شیخ سے استفادہ کا طریقہ
۲۹۵	راہِ سلوک سے مقصود، رضاء الہی ہے
۲۹۸	احوال و کیفیات مقصود نہیں
۳۰۲	اللہ و رسول کی محبت اس راہ کی کنجی ہے
۳۰۷	قرب فرائض و قرب نوافل
۳۰۹	ایک سوال کا جواب
۳۱۱	سالک نتائج کی فکر نہ کرے
۳۱۲	راہِ سلوک کی رکاوٹیں
۳۱۴	سالک کے لیے اہم کتابیں
۳۱۵	معمولات سالک

۳۱۵	نماز باجماعت کا اہتمام
۳۱۶	نماز تہجد کا اہتمام
۳۱۶	عجر و نیاز، گریہ و زاری
۳۱۸	ذکر اللہ کی عادت
۳۲۰	تلاوت قرآن مجید کا معمول
۳۲۱	درود شریف کا اہتمام
۳۲۲	دعاؤں کا اہتمام
۳۲۳	نفل روزوں کا اہتمام
۳۲۴	اللہ کے راستہ میں صدقہ
۳۲۵	مراقبہ و محاسبہ
احکام شعبان و شبِ برأت - تحقیق کے آئینے میں	
۳۲۷	تقدیم
۳۳۰	ماہ شعبان - فضائل و اعمال
۳۳۰	تمہید
۳۳۱	ماہ شعبان کی فضیلت
۳۳۲	شعبان میں اعمال کی پیشی اور فیصلے
۳۳۳	ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب
۳۳۳	شعبان سے غفلت پر نکیر
۳۳۴	شعبان کی ایک اور فضیلت
۳۳۴	فائدہ علمیہ

۳۳۵	شعبان کے اعمال
۳۳۵	شعبان میں رمضان کی تیاری
۳۳۶	شبِ برأت دلائل کے آئینہ میں
۳۳۷	شبِ برأت کی فضیلت
۳۳۸	شبِ برأت کی فضیلت میں صحیح حدیث
۳۳۹	بعض اور احادیث
۳۴۱	کیا شبِ برأت فیصلے کی رات ہے
۳۴۳	نقطہ اعتدال
۳۴۴	شبِ برأت میں کیا کرنا چاہیے
۳۴۵	شبِ برأت میں دعا کا اہتمام
۳۴۵	شبِ برأت کی بدعات
۳۴۸	شبِ برأت اور نقطہ اعتدال
۳۴۸	شبِ برأت اور قرآن مجید
۳۵۲	ایک ضروری وضاحت
۳۵۳	شبِ برأت اور احادیث
۳۵۴	دوسری حدیث
۳۵۵	تیسری حدیث
۳۵۷	چوتھی حدیث
۳۵۸	پانچویں حدیث
۳۵۸	چھٹی حدیث

۳۵۹	خلاصہ کلام
۳۶۰	عدمہ مبارک پوری کا ارشاد
۳۶۱	عدمہ عبید اللہ مبارک پوری کی وضاحت
۳۶۲	خاتمۃ الکلام
۳۶۳	منکرات شب برأت
۳۶۳	آتش بازی کی رسم
۳۶۶	گھروں کی لیپ پوت
۳۶۶	شب برأت کا حلوا
۳۶۸	روحوں کے آنے کا اعتقاد
۳۷۰	مساجد کو سجانا اور سنوارنا
۳۷۲	مساجد میں اجتماع
۳۷۳	شب برأت کی مخصوص نماز کی بدعت
۳۷۴	زیارت قبور میں غلو
دیوبندیت و بریلویت - دلائل کے آئینے میں	
۳۷۹	افتتاحیہ
۳۸۱	نور اور بشر
۳۸۱	قرآن کیا کہتا ہے؟
۳۸۳	حدیث شریف کا فیصلہ
۳۸۴	حضرات صحابہ کیا فرماتے ہیں
۳۸۵	ایک عام فہم مثال

۳۸۶	بریلوی علما کے ارشادات
۳۸۷	دیوبندی علما اور مقام نبی
۳۸۹	انکار بشریت کی دلیل کا جواب
۳۹۰	خلاصہ تحقیق
۳۹۱	حاضر و ناظر
۳۹۱	ایک اہم نکتہ
۳۹۳	دلائل کی روشنی میں
۳۹۶	قرآن میں ”شاہد“ کا معنی
۳۹۸	علم غیب
۳۹۸	علم غیب کی حقیقت
۴۰۰	مخوق کے لیے علم غیب ممکن نہیں
۴۰۱	قرآنی تصریحات
۴۰۲	نقطہ اختلاف کی تعیین
۴۰۴	کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرہ ذرہ کا علم ہے؟
۴۰۸	ایک شبہ کا جواب
۴۱۰	سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا؟
۴۱۲	مخالفین کے دلائل پر نظر
۴۱۵	مشکل کشا و حاجات روا اور مختار کا
۴۱۵	بریلوی مسلک کی توضیح
۴۱۷	مسلک دیوبند کی ترجمانی
۴۱۸	قرآن کا فیصلہ

۴۲۲	حدیث نبوی کا فیصلہ
۴۲۵	محبوب سبحانی کا زرین ارشاد
۴۲۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۴۲۹	وسیلہ
۴۲۹	وسیلہ کی پہلی صورت
۴۳۱	وسیلہ کی دوسری صورت
۴۳۲	وسیلہ کی تیسری صورت
۴۳۳	ایک وضاحت
۴۳۵	چوتھی صورتِ وسیلہ
۴۳۷	آیت وسیلہ کی تفسیر
۴۳۸	عوام میں وسیلہ کی بنیاد پر جہالت
۴۳۹	شفاعت
۴۳۹	مسئلہ شفاعت ایک اتفاقی مسئلہ
۴۴۰	نقطہ اختلاف کی وضاحت
۴۴۱	اللہ تعالیٰ کسی کی وجاہت و محبت سے مجبور نہیں ہوتا
۴۴۳	شفاعت، اجازت پر موقوف ہے
۴۴۴	شفاعت کس کے لیے ہوگی؟
۴۴۶	اختتام
منکراتِ رمضان	
۴۴۸	تقریظ حضرت مولانا مہربان علی صاحب رحمۃ اللہ

۴۵۰	دیباچہ از مولف عفی عنہ
۴۵۲	تراویح پر اجرت کا مسئلہ
۴۵۹	نماز تہجد میں جماعت کا اہتمام
۴۶۶	شبینہ نماز کا رواج
۴۶۹	رمضان کی بعض راتوں میں بے وجہ روشنی
۴۷۱	ختم قرآن پر مٹھائی کی رسم
۴۷۲	لیلۃ القدر میں مساجد میں اجتماع اور بازاروں میں سیر و تفریح
۴۷۶	ستائیسویں رمضان میں ختم قرآن کا اہتمام
۴۷۸	اجتماع الذکر کی مجالس
۴۸۳	نابالغ بچوں کو روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم
۴۸۶	پندرہویں روزے کی تعظیم
۴۸۷	تراویح میں نابالغ کی امامت
۴۸۹	نمک پر افطاری کی رسم
۴۹۱	مساجد میں افطاری کا رواج
۴۹۲	صبح صادق کے بعد سحری
۴۹۴	تراویح کی مروجہ دعائیں
۴۹۷	سحری میں جگانے کے غیر مہذب طریقے
۴۹۸	رمضان کے آخری جمعہ میں خطبہ الوداع کا التزام
۵۰۰	عید الفطر کی سیویاں
۵۰۱	خطبہ عید کی زبان

۵۰۵	نماز خطبہ عید کے بعد دعا
۵۰۷	عید کا مصافحہ و معانقہ
۵۰۹	عید کے دن نئے کپڑوں، عمدہ کھانوں کا اہتمام
۵۱۳	ضمیمہ مفیدہ
۵۱۳	روزے اور عید کی اغلاط
نفحاتِ رمضان	
۵۱۶	نگاہِ اولین
۵۱۸	رمضان کی فضیلت
۵۲۲	رمضان کی خصوصیات
۵۲۲	اجرو ثواب میں زیادتی
۵۲۳	جنت کے دروازوں کا کھل جانا اور دوزخ کے دروازوں کا بند ہو جانا
۵۲۳	شیاطین کا بند ہو جانا
۵۲۳	قرآن کا اسی ماہ میں نازل ہونا
۵۲۴	لیلۃ القدر کا آنا
۵۲۵	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رمضان
۵۳۰	فائدہ
۵۳۱	عشرہ اخیرہ کی فضیلت
۵۳۲	عشرہ اخیرہ کا ذکر قرآن میں
۵۳۴	رمضان کے مخصوص اعمال
۵۳۵	روزے کا بیان

۵۳۵	روزے کی فرضیت و اہمیت
۵۳۶	روزے کی فضیلت
۵۳۹	روزے کی حقیقت اور قسمیں
۵۳۹	روزے کی پہلی قسم
۵۴۰	روزے کی دوسری قسم
۵۴۲	روزے کی تیسری قسم
۵۴۴	روزے کے احکام و مسائل
۵۴۴	روزہ کن لوگوں پر فرض ہے
۵۴۵	روزہ کب صحیح ہوگا
۵۴۶	نیت کے ضروری مسائل
۵۴۶	روزے کے فرائض
۵۴۷	روزے کی سنتیں اور مستحبات
۵۵۰	روزے کو توڑنے والی چیزیں
۵۵۱	پہلی قسم
۵۵۲	دوسری قسم
۵۵۳	کن چیزوں سے روزہ مکروہ ہوتا ہے؟
۵۵۵	وہ چیزیں جو روزے میں مکروہ نہیں ہیں
۵۵۵	روزے کے چند جدید مسائل
۵۵۷	قضا و کفارے کے احکام
۵۵۹	فدیہ کے احکام

۵۶۱	نماز تراویح کا بیان
۵۶۱	نماز تراویح کی فضیلت
۵۶۵	تراویح کے احکام و مسائل
۵۶۷	تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت
۵۷۳	آٹھ رکعت کی حدیث کا جواب
۵۷۶	اعتکاف کا بیان
۵۷۶	تمہید
۵۷۶	اعتکاف کی تعریف
۵۷۷	اعتکاف کی ضرورت
۵۷۸	اعتکاف کی حکمتیں
۵۷۹	ایک شبہ کا جواب
۵۷۹	اعتکاف کی فضیلت
۵۸۱	اعتکاف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۵۸۲	اعتکاف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
۵۸۳	ایک شبہ کا جواب
۵۸۴	اعتکاف کی قسمیں
۵۸۵	اعتکاف کے احکام و مسائل
۵۸۷	اعتکاف میں ممنوع اعمال
۵۸۸	مکروہات اعتکاف
۵۸۹	تنبیہ

۵۹۰	تلاوت قرآن
۵۹۲	عبادات میں کثرت
۵۹۴	لیلة القدر کا بیان
۶۰۱	عید الفطر اور صدقہ فطر
۶۰۲	عید کے چند احکام و آداب
۶۰۴	انتباہ
۶۰۹	صدقہ فطر
۶۱۰	فوائد و مسائل



حقوق القرآن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرف اول

نحمدہ و نصلى على رسوله الكريم. اما بعد :

گذشتہ چند ماہ سے احقر کے مضامین کا ایک سلسلہ بنگلور کے کثیر الاشاعت و مؤقرا خبر ”روزنامہ سالار“ میں ہر بدھ کو جاری ہے جو دراصل خطبائے رَام کو خطبات جمعہ میں تعاون کے لیے محترم ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب زید لطفہ اور جناب محترم ابراہیم خلیل اللہ خان صاحب زیدت عنایت، کی تحریک و فرمائش پر شروع کیا گیا تھا اور اب تک الحمد للہ جاری ہے۔

انہی مضامین میں سے ایک مضمون ”قرآن مجید کے حقوق اور ہماری کوتاہیاں“ کے عنوان پر چار قسطوں میں شائع ہوا تھا، مضمون کی اہمیت و ضرورت کے پیش نظر خفیف ترمیمات اور معمولی اضافوں کے ساتھ الگ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور نام میں بھی لفظی ترمیم کر کے ”حقوق القرآن“ سے موسوم کیا گیا ہے۔

مرشدی حضرت اقدس مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہر دوئی دامت برکاتہم کا خاص موضوع حقوق قرآن ہے۔ ہر جگہ حضرت والا اس پر توجہ دلاتے ہیں۔ گویا یہ میرا مضمون حضرت والا کے افادات و بسلسلہ حقوق قرآن کی ایک شرح ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کے افادات سے امت کو فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس شرح کو بھی امت کے لئے مفید اور میرے لئے ذریعہ

وتقرب بنائے۔

میں عزیز ی مولوی محسن صدیقی چامراج نگری کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے ان متفرق چار مضامین کی ترتیب کا کام بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ مسیح العلوم بیدواڑی، بنگلور)

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمُهَيِّدُ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان کلام ہے، جو انسانوں کی ہدایت و راہ نمائی کے لئے نازل فرمایا گیا ہے، وہ ان کی ہدایت کا سامان بھی پیش کرتا ہے اور ہدایت کا پروگرام و نظام بھی بتاتا ہے۔ اسی قرآن مجید کے ذریعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی جاہل و وحشی قوم کو دنیا کا ہادی و رہبر بنا دیا۔ ان میں کسی کو صدیقیت کے مقام پر اور کسی کو فاروقیت کے مقام پر فائز فرمایا۔ کسی کو حیا سے ممتاز فرمایا، کسی کو قضا سے امتیاز بخشا۔ غرض قرآن مجید ہمارا ہادی و رہبر ہے جو ہمیں دنیا میں جینے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے اور آخرت میں کامیابی و نجات پانے کا بھی طریقہ بتاتا ہے۔

اس عظیم الشان خدا کی کتاب کا ہم پر کوئی حق بھی ہے یا نہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کے ہم پر کئی حق ہیں۔

عظمت قرآن

سب سے پہلا حق قرآن مجید کا یہ ہے کہ اس کی عظمت و بڑائی کا احساس ہو، اس لئے کہ یہ دراصل حضرت حق جل مجدہ کا کلام ہے اور کلام، اللہ کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح قدیم ہے، ازلی ہے، ابدی ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات قابل تعظیم ہے، اسی طرح اس کی صفت بھی قابل تعظیم ہے، لہذا قرآن مجید کی عظمت بھی ضروری ہے۔

علمائے فرمایا ہے کہ اس پوری کائنات میں سوائے قرآن مجید کے کوئی چیز ایسی

نہیں جس کا تعلق بہ راہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہو، کیوں کہ جتنی چیزیں بھی اس دنیا میں ہیں حتیٰ کہ کعبۃ اللہ بھی وہ سب کی سب اللہ کی مخلوق ہیں؛ لیکن قرآن مجید اللہ کی مخلوق نہیں؛ بل کہ اللہ کی صفت ہے۔ مخلوق تو حادث و فانی ہوتی ہے؛ لیکن اللہ کی صفت ازلی و قدیم ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی جیسے اللہ کی ذات کبھی فنا نہ ہوگی۔

فتنہ خلق قرآن اور امام احمد رحمۃ اللہ کا ابتلا

یہاں تاریخ کا ایک ورق سامنے آگیا جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بارون رشید کا بیٹا مامون رشید تھا، اس کے دورِ خلافت میں ایک عظیم فتنہ نے قرآن مجید کی عظمت کو چیلنج کر دیا، جس کے جواب کے لیے علمائے حق پوری تندہی کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور ان علمائے حق کے سردار حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تھے۔ یہ فتنہ کیا تھا؟ اس زمانے میں ایک گم راہ فرقہ معتزلہ نے یہ کہا کہ قرآن مجید نعوذ باللہ مخلوق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عظمت قرآن کو چیلنج تھا۔ اس لئے علماء اور خصوصاً امام احمد رحمۃ اللہ نے کھل کر اس نظریہ کی تردید و مخالفت کی اور بتایا کہ قرآن مجید مخلوق نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفت مخلوق نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

معتزلی علماء اس دور میں حکومت سے قرب و تعلق کی وجہ سے مامون رشید پر اپنا اثر ڈالنے لگے اور اس نے ان کی گم راہی کو قبول کر کے اسی گم راہ عقیدوں کو حکومت و طاقت کی بنیاد پر پھیلایا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ اس کو قبول کرو۔ علمائے حق کو سزائیں دی گئیں اور خصوصاً امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کے لیے بہت بڑا ابتلا و آزمائش کا موقع تھا۔ آپ کو قید خانے کے حوالے کر دیا گیا اور روزانہ ستر ستر کوڑے پشت پر مارے جاتے تھے اور مجبور کیا جاتا تھا کہ قرآن کو مخلوق مان لو اور عوام میں اسی بات کا فتویٰ دو؛ مگر

آپ نے عظمتِ قرآن کی حفاظت کے لیے جان دینا گوارا کیا، قرآن کو مخلوق کہہ کر اس کی عظمت کو داغ دار کرنا گوارا نہ کیا۔ غرض یہ کہ قرآن مجید اللہ کی عظیم الشان صفت ہے جس کی عظمت کرنا فرض ہے۔

قول ثقیل کی تفسیر

اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (الزمر: ۵)

(ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات وزن دار)

اس سے مراد یہی قرآن مجید ہے اور وزنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت ہی عظمت والا کلام ہے جیسے ہم لوگ بھی کسی کی عمدہ اور اچھی بات کو سن کر کہتے ہیں کیا بھاری بات انھوں نے کہی ہے۔ یہاں بھاری سے مراد عظیم و عمدہ ہے۔ یہی معنی یہاں آیت میں ہیں۔

قرآن کی عظمت کا اثر مخلوقات پر

اور اسی عظمت و بھاری پن نے تمام مخلوقات کو قرآن کے سامنے عاجز کر دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں جیسی بڑی اور بھاری و عظیم مخلوقات پر پیش کیا تو وہ سب گھبرا گئے اور اس کو سنبھالنے سے عذر کر دیا۔ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ

فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ

(الاحزاب: ۷۲)

ظُلُوْمًا جَهُوْلًا﴾

(یعنی ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر

کسی نے قبول نہ کیا، کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھالیا اس کو انسان نے، یہ ہے بڑا بے ترس نادان)
اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾
(الحِجْر: ۲۱)

(کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو تو دیکھتا کہ وہ اللہ کی خشیت اور خوف سے دب گیا ہے اور پھٹ گیا ہے)
اللہ اکبر! پہاڑ کتنی عظیم اور ثقیل چیز ہے؛ مگر اس کے باوجود اللہ کے کلام کی عظمت و ثقل نے اس کو دب جانے اور پھٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

نزول قرآن کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ کی کیفیت قرآن کی عظمت و جلالت اور اس کی بڑائی و بزرگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

«قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيُصِمُّ عَنْهُ وَإِنْ جَبِينُهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا» (۱)

(حضرت عائشہ صدیقہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول کو دیکھا کہ سخت سردی کے دنوں میں آپ پر جب وحی نازل ہوتی تو وحی کے ختم ہونے کے بعد آپ کی پیشانی پر سے پسینہ بہنے لگتا)

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ جعرانہ مقام پر تھے، ایک صاحب نے عمرہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ پر اسی

(۱) بخاری: ۲/۱، ترمذی: ۲/۲۰۵، نسائی: ۱/۱۲۹

دوران وحی نازل ہوئی آپ کو کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اشارہ کیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ میں نے کپڑے میں جھانک کر دیکھا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آپ خراٹے لے رہے تھے۔ (۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آپ پر یہ کیفیت وحی کی شدت کی وجہ سے تھی۔

« عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ : كَانَ النَّبِيُّ إِذَا أُنْزِلَ

عَلَيْهِ الْوَحْيُ كُورِبَ لِذَلِكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ » (۲)

(حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ پر وحی نازل ہوتی تو اس کی وجہ سے آپ کو بوجھ معلوم ہوتا اور تکلیف معلوم ہوتی اور چہرے کا رنگ بدل جاتا۔)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ

« عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : كُنْتُ إِلَى جَنْبِ رَسُولِ

اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَعَشِيَتُهُ السَّكِينَةُ فَوَقَعْتُ فَاخَذَ رَسُولُ

اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَيَّ فَخَذِي فَمَا وَجَدْتُ ثِقَلَ شَيْءٍ

أَثْقَلَ مِنْ فَاخَذِ رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم » (۳)

(حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو تھا کہ آپ کو (نزول وحی کے وقت) سکیںہ

نے ڈھانپ لیا، اور آپ کی ران مبارک میری ران پر پڑ گئی تو میں نے

(۱) مسلم: ۱/۳۷۳

(۲) مسلم: ۲/۶۵

(۳) ابوداؤد: ۱/۳۳۹

محسوس کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہیں ہے)

غور کیجئے کہ اللہ کی وحی اور اللہ کا کلام کس قدر عظیم و ثقیل چیز ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وجہ سے سخت سردی میں پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں اور آپ کا بدن مبارک اس کے وزن سے وزنی ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپ کے وزن کو محسوس فرماتے ہیں۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور خراٹے جیسی آواز زبان مبارک سے نکلتی ہے۔

یہ ہے اللہ کا کلام اس کی عظمت و بڑائی کو دیکھو، اس کی شان و جلالت کا اندازہ کرو، اس کی بزرگی و بلندی کا احساس کرو۔

ہماری غفلت شعاری

اسی کے ساتھ ہماری غفلت شعاری کی طرف بھی ایک نظر کیجئے کہ ایسے عظیم کلام کی ہمارے دلوں میں کتنی عظمت پائی جاتی ہے۔ کیا آج ہم لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو اسکولوں کی تعلیم کو دیتے ہیں۔ عام حالت کے اعتبار سے اس کا جواب یہی ہے کہ نہیں۔ دیکھئے آج اسکولوں کی عصری تعلیم کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اس کے لئے رشوت دے کر سیٹ لی جاتی ہے؛ مگر کیا قرآن پاک کی تعلیم کا بھی ایسا اور اتنا اہتمام ہم لوگ کرتے ہیں؟ بل کہ بعض تو نعوذ باللہ قرآن کی تعلیم کو فضول خیال کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں قرآن کی کوئی عظمت نہیں ہے۔ خیر ایسے تو بہت کم لوگ ہیں؛ مگر قرآن کی تعلیم کا اہتمام نہ کرنے والے تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیوی و عصری علوم کی جتنی اہمیت

لوگوں کو ہے قرآن کی اتنی نہیں ہے۔ لہذا قرآن کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کی تعلیم کی اہمیت اپنے دلوں میں پیدا کی جائے۔

عظمت قرآن کے تقاضے

بہر حال ہمیں قرآن مجید کی عظمت کو محسوس کرنا چاہئے۔ یہ اس کا پہلا حق ہے اور اس حق کے کچھ تقاضے بھی ہیں جس کو پورا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عظمت دل میں ہے۔ وہ تقاضے کیا ہیں۔ ایک تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس لیے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کو ماننا ایک فطری بات ہے۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانا عظمت قرآن کا لازمی تقاضا ہے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم خود بھی حاصل کی جائے اور اپنے بچوں اور ماتحتوں کو بھی اس کی تعلیم دی جائے۔ اسی طرح ایک تقاضا اس کا یہ ہے کہ قرآن مجید کا احترام کیا جائے، اس کی ادنیٰ سی بھی بے ادبی نہ کی جائے۔ ان تینوں تقاضوں کو ذرا تفصیل سے عرض کروں گا۔

عظمت قرآن کا پہلا تقاضا۔ ایمان بالقرآن

عظمت قرآن کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اور جو احکامات نازل کیے گئے ہیں وہ سب صداقت و حقانیت پر مبنی اور ہدایت پر مشتمل ہیں۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی، خلاف واقعہ نہیں ہو سکتی اور کوئی حکم خلاف حکمت نہیں ہو سکتا۔

قرآن پر ایمان لانے کا حکم صاف طور پر قرآن میں دیا گیا ہے:

﴿وَأْمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ (البقرة: ۴۱)

(جو میں نے نازل کیا ہے) (قرآن) جو تمہارے پاس کی کتابوں
(توریت، انجیل) کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔)

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي
نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ﴾ (النساء: ۱۳۶)

(اے ایمان والو! ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی
کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے۔)
غرض یہ کہ قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان بھی
نہیں ہو سکتا۔

دوسرا تقاضا - تعلیم القرآن

عظمت قرآن کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی فکر کی
جائے اور اپنے بچوں اور ماتحتوں کو بھی تعلیم قرآن سے آراستہ کرے، کیوں کہ جب
اس کی عظمت دل میں ہے اور اس کے نتیجہ میں قرآن پر ایمان بھی ہے کہ یہ ساری
صدائقوں کا جامع اور تمام ہدایتوں کا منبع ہے اور یہ معلوم ہے کہ اس پر چلنے میں نجات
مضمّن ہے تو اس کے علوم کو جاننا اور اپنے بچوں کو بھی ان کی تعلیم دینا لازم ہوا۔ ورنہ یہ
کیسی عظمت اور کیسا ایمان ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے علوم کو جاننا نہیں چاہتا۔
اس لیے ہمیں قرآن کو سیکھنے اور اس کے احکام کو معلوم کرنے کی ترغیب و تاکید
فرمائی گئی ہے۔

چنانچہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

«خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ» (۱)

(یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے)

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلَّمُوا النَّاسَ فَإِنِّي مَقْبُوضٌ هَذَا.» (۲)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرائض (میراث کے مسائل) کا اور قرآن کا علم حاصل کر لو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیوں کہ میں دنیا سے جانے والا ہوں۔)

قرآن مجید و حدیث کا تلازم

اور قرآن کے ساتھ احادیث کا علم بھی ضروری ہے، کیوں کہ قرآن و حدیث میں تلازم اور حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

«أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبَّعَانَ عَلَى عَرِيكَتِهِ يَقُولُ عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنَ فَمَا وَجَدْتُكُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوهُ وَمَا وَجَدْتُكُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ. وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ» الخ (۳)

(۱) بخاری: ۵۲/۱، ابوداؤد: ۲۰۵/۱، ترمذی: ۱۱۹/۲

(۲) ترمذی: ۲۹/۲

(۳) ابوداؤد: ۶۳۲/۲، ابن ماجہ: ۳

(خبردار ہو کہ مجھے قرآن اور اس جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے، خبردار ہو کہ عن قریب شکم سیر انسان اپنے تخت پر بیٹھے کہے گا کہ تم پر لازم ہے کہ قرآن کو پکڑ لو، بس جو تم اس میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس کو اس میں حرام دیکھو اس کو حرام سمجھو۔) اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ کا رسول جس کو حرام قرار دے وہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ پر ایک اور چیز بھی نازل ہوئی، وہی حدیث و سنت کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر ایمان اور اس کی عظمت و محبت بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسے قرآن کی عظمت و محبت اور اس پر ایمان ضروری ہے۔

الغرض قرآن کے ساتھ حدیث کا علم حاصل کرنا بھی لازم ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو ضروری قرار دیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ بغیر حدیث کے قرآن کا نہ فہم حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ بہت سی آیات میں اجمال ہے، جس کی تفصیل حدیثوں میں آئی ہے اور بہت سی آیات میں ابہام ہے جس کا بیان حدیثوں میں ہے۔ اب حدیثوں کے بغیر ان آیات کو کس طرح سمجھا جاسکتا ہے اور کس طرح ان پر عمل کیا جاسکتا ہے؟

مثلاً قرآن میں نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ مگر نماز کے ارکان، آداب، اس کی کیفیت و طریقہ، اس کی تعداد و اوقات وغیرہ کا ذکر قرآن میں نہیں ہے؛ بل کہ احادیث میں ہے۔ تو نماز کا حکم بغیر حدیث کے کیسے سمجھا جائے گا اور کس طرح عمل میں لایا جائے گا؟

الغرض قرآن کے ساتھ حدیث کا علم بھی ضروری ہے اور یہ جس طرح اپنے لیے ضروری ہے اسی طرح اپنے ماتحتوں اور بچوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

دوزخ سے بچو اور بچاؤ

چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (التَّحِيُّمُ: ۶)

(اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی

آگ سے بچاؤ)

حضرت علی ؓ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ مراد یہ کہ اپنے اہل و عیال کو دین کا علم سکھاؤ اور ادب کی تعلیم دو۔

بہ ہر حال یہ ضروری ہے کہ خود کو اور اپنے ماتحتوں کو علم دین سے آراستہ کیا جائے اور قرآن پاک اور حدیث شریف کا علم سیکھا اور سکھایا جائے۔ یہ بھی قرآن کی عظمت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

ایک ضروری بات پر تنبیہ

یہاں ایک ضروری بات کی طرف ذہن منتقل ہو گیا وہ یہ کہ قرآن و حدیث اور دین کا علم ماہر استادوں سے حاصل کرنا چاہئے۔ آج لوگ دین کا علم جاہلوں سے حاصل کرتے ہیں کس قدر حیرت و افسوس کا مقام ہے۔ کیا ہم ڈاکٹری کی یا انجینئری کی تعلیم کسی اناڑی سے حاصل کرتے ہیں؟ نہیں! تو پھر دین کی تعلیم کے لیے جاہلوں پر کیوں اکتفا کیا جاتا ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی اور دین کی عظمت نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی

تو اس کے لئے جاہلوں اور ناقصوں کو نہ چنا جاتا۔ پھر یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سستا آدمی مل جائے اور سستا جو ہو گا وہ ایسا ہی ہو گا۔ حالاں کہ یہ لوگ دنیوی تعلیم کے لیے ہزاروں سے گزر کر لاکھوں بھی خرچ کر دیتے ہیں۔ صرف سیٹ حاصل کرنے کے لیے ہزاروں روپے ڈونیشن دیتے ہیں؛ مگر علم دین کے لیے سستا آدمی تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے اور عظمتِ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی عظمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے لیے سب کچھ قربان کر کے صحیح علم حاصل کیا جائے۔

عظمت قرآن کا ایک واقعہ

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک بادشاہ کا لڑکا ایک استاذ کے پاس علم حاصل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ استاذ سے ملنے آئے اور قرآن کی تعلیم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور استاذ کو دس ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی دی۔ استاذ نے بادشاہ سے کہا یہ تو بہت ہیں ہم نے کیا ہی کیا ہے، جو اتنا بڑا انعام ملے؟ بادشاہ واپس ہو گئے اور جا کر حکم بھیجا کہ کل سے آپ میرے بچے کو تعلیم نہ دیں۔ استاذ حیرت میں پڑ گئے کہ کیا قصہ ہے۔ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ کیا خطا ہو گئی کہ آپ نے آپ کے صاحب زادے کو پڑھانے سے منع فرما دیا؟ بادشاہ نے کہا کہ جب آپ نے قرآن کی تعلیم کے مقابلہ میں دس ہزار اشرفیوں کو بھاری سمجھا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ قرآن سے زیادہ اشرفیوں کے قائل ہیں اس لیے میں نے یہ حکم دیا۔

پہلے تو ایسے لوگ ہوتے تھے اور آج سب سے کم تن خواہ ان کی ہوتی ہے جو قرآن پڑھاتے ہیں اس لیے اچھا پڑھانے والے بھی میسر نہیں آتے اور جاہلوں سے پڑھنا پڑتا ہے، لہذا یہ بات قابلِ اصلاح ہے اس پر توجہ دینا چاہئے۔

قرآن مجید کا احترام کیجئے

عظمت قرآن کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ مثلاً قرآن کو نیچے رکھ دینا، اس کی بے حرمتی اور بے ادبی ہے۔ لہذا قرآن مجید کو نیچے نہ رکھا جائے یا مثال کے طور پر قرآن مجید کی طرف پیر کرنا بے ادبی و بے حرمتی ہے۔ لہذا اس سے بھی احتیاط کرنا چاہئے۔ یہاں ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کی طرف حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ متوجہ فرمایا کرتے تھے، وہ یہ ہے کہ آج عام طور پر مساجد و مدارس اور گھروں سب جگہ پر قرآن مجید کو بغیر جزدان کے کھلے رکھنے کا رواج ہو گیا ہے، حالاں کہ چند سال قبل ہر جگہ پورے اہتمام و احترام سے قرآن کو جزدان میں رکھا جاتا تھا؛ مگر آج اس کو لوگوں نے تقریباً ختم کر دیا ہے، جو دلیل ہے اس کی کہ قرآن کا احترام اور عظمت کم ہونے لگی ہے۔ بزرگوں نے دو وجہ سے جزدان کا رواج ڈالا تھا، ایک یہ کہ دھول و غبار سے حفاظت ہو، دوسرے یہ کہ کبھی بے خبری میں ایسا نہ ہو کہ بے وضو کوئی قرآن مجید کو ہاتھ لگا دے۔

بہر حال قرآن کی عظمت و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو جزدان میں رکھا جائے اور جہاں رکھا جائے وہاں نیچے بھی کوئی کپڑا ڈالا جائے۔

میرے شیخ حضرت اقدس شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مساجد میں امام کے لیے الگ مصلیٰ ہوتا ہے؛ بل کہ بعض جگہ دو دو تین تین مصلے ہوتے ہیں۔ یہ کیوں؟ امام کی عظمت کے لیے، اب سوچئے کہ امام کی عظمت زیادہ ہے یا قرآن کی؟ ہر کوئی یہی کہے گا کہ قرآن کی عظمت امام سے زیادہ ہے، تو جب قرآن کی عظمت زیادہ ہے تو امام کی طرح قرآن کے نیچے بھی کپڑا ڈالنا چاہئے۔

ایک جگہ حضرت والا تشریف لے گئے۔ بیان فرمایا، بیان کے بعد ایک قرآن جو

الماری پر رکھا تھا اس پر جا کر ہاتھ رکھا تو ہاتھ پر قرآن پر جمی ہوئی دھول لگ گئی تو کچھ لوگوں نے حضرت کا ہاتھ صاف کرنا چاہا، تو فرمایا کہ افسوس کہ میرے ہاتھ پر دھول لگنے کی فکر ہے؛ مگر قرآن دھول میں اتنا ڈوبا ہوا ہے؛ مگر کسی کو اس کی عظمت کا خیال نہیں۔ غرض قرآن کی عظمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ قرآن مجید پڑھنے کے لیے بزرگوں نے رحل کو تجویز فرمایا تھا؛ مگر آج اس کی جگہ تپائی کا رواج ہو گیا ہے، حتیٰ کہ مدارس میں بھی اسی کا رواج ہو گیا ہے۔ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کے لیے مخصوص کرسی ہونا چاہئے جیسے بادشاہ کی کرسی مخصوص ہوتی ہے۔ اور قرآن کی مخصوص کرسی رحل ہے۔ رہی تپائی تو وہ ایک عام چیز ہے اس پر کتاب بھی رکھ سکتے ہیں، کھانا بھی رکھ سکتے ہیں اور چیزیں بھی رکھی جاسکتی ہیں، تو قرآن کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی کرسی مخصوص ہو۔ لہذا تپائی پر قرآن رکھنا اگرچہ جائز ہے؛ مگر افضل یہ ہے کہ رحل پر رکھا جائے۔ بہ ہر حال یہ چند باتیں عظمتِ قرآن کے سلسلے میں عرض کی گئی ہیں۔

محبت قرآن

قرآن مجید کا دوسرا حق یہ ہے کہ قرآن مجید سے محبت ہو، کیوں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام صاحب کلام کی معرفت کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی محبت ضروری ہے تو اس کی معرفت کے لیے اس کے کلام کی محبت بھی ضروری ہے، اسی طرح کلام ذریعہ تقرب بنتا ہے اور اللہ کی قربت مطلوب ہے، تو اس کا ذریعہ بھی محبوب و مطلوب ہونا چاہئے۔ لہذا کلام اللہ و قرآن مجید سے محبت ضروری ہے۔

کلام خداوندی آئینہ جمال خداوندی ہے

اور یہ جو میں نے کہا کہ کلام صاحب کلام کی معرفت کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ یہ بات نہایت واضح ہے، کیوں کہ عام طور پر کلام ہی کے ذریعہ کسی کے کمالات باطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری، عقل و بصیرت وغیرہ جاننا ہو تو کلام اس کا بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح کلام ہی سے لوگوں کی جہالت و خباثت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تو کلام ایک آئینہ ہے جس سے صاحب کلام کو جانا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کلام اللہ کے کمال و جمال کا آئینہ ہے، تو جس کو یہ خواہش ہو کہ وہ اللہ کو دیکھے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ کے کلام کو پڑھے اور اس کے معانی و مضامین، اس کے اسلوب و انداز، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی حلاوت و لطافت سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔ یہی ہے اللہ کے کلام کی محبت۔

عالمگیر رحمۃ اللہ کی صاحب زادی کا واقعہ

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا وہ یہ ہے کہ حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ شاہ ایران کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرعہ بن گیا جو بے تکا سا تھا۔ شاہ ایران نے درباری شعرا سے مطالبہ کیا کہ اس مصرعہ کا جوڑ لگا کر شعر پورا کرو۔ شعرا حیران ہوئے کہ بے جوڑ اور بے تکے مصرعہ کا کیا جوڑ لگائیں۔ جب ان سے نہ بن سکا تو شاہ ایران نے عالمگیر رحمۃ اللہ کو لکھا کہ ہندوستان کے شعرا اس مصرعہ کا جوڑ بنائیں اور اس پر اس نے انعام بھی رکھا؛ مگر کوئی ہندوستانی شاعر بھی اس کا جوڑ نہ بنا سکا۔ ایک دفعہ اتفاق سے عالمگیر رحمۃ اللہ کی شاہ زادی زینب سے اس کے مناسب ایک مصرعہ بن گیا اور اس مصرعہ نے اس بے معنی مصرعہ کو بھی با معنی بنا دیا۔ حضرت

عالمگیر رحمۃ اللہ نے نام بتائے بغیر یہ مصرعہ شاہ ایران کو لکھ بھیجا کہ ایک ہندوستانی شاعر نے آپ کے مصرعہ کا یہ جوڑ بنایا ہے۔ شاہ ایران بہت خوش ہوا اور وہاں کے شعرا کو بھی سنایا تو وہ بھی خوش ہوئے اور مطالبہ کیا کہ آپ اس ہندوستانی شاعر کو ایران بلائیے کہ ہم اس کی زیارت کریں اور اس سے استفادہ کریں، چنانچہ شاہ ایران نے عالمگیر رحمۃ اللہ کو لکھا کہ اپنے شاعر کو یہاں بھیجیں کہ ہم اس کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔ عالمگیر رحمۃ اللہ کو پریشانی ہوئی کہ اپنی لڑکی کو وہاں کیسے بھیجیں؟ انہوں نے اپنی لڑکی سے اس کا ذکر کیا۔ لڑکی نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں اس کے جواب میں ایک شعر بناتی ہوں وہ شعر آپ ایران کو روانہ کر دیں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے

”یعنی میں میرے کلام میں اس طرح مخفی و پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کے پتوں میں مخفی ہوتی ہے۔ لہذا جو مجھے دیکھنا چاہتا ہے وہ میرا کلام دیکھ لے۔“

اسی طرح اللہ کی محبت رکھنے والا اگر اللہ کو دیکھنا چاہے تو وہ اللہ کے کلام کو دیکھے اور اس میں اس کو اللہ تعالیٰ کا جمال اور اس کا کمال نظر آئے گا۔ غرض اللہ کے کلام کی محبت بھی اس کا ایک حق ہے۔

قرآن سے محبت پر جنت کی بشارت

«عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي أَحَبُّ هَذِهِ السُّورَةِ (قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ) قَالَ إِنَّ حُبَّكَ إِيَّاهَا يُدْخِلُ الْجَنَّةَ.» (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ سے محبت کرتا ہوں آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ تیرا اس سورہ کو محبوب رکھنا تجھے جنت میں داخل کرے گا۔

اللہ اکبر! جب ایک سورت سے محبت پر یہ بشارت ہے تو فرمائیے کہ پورے قرآن سے محبت اور تمام سورتوں سے محبت پر کیا کچھ نہ ملے گا؟ معلوم ہوا کہ قرآن سے محبت جنت میں داخلے کا سبب ہے۔

قرآن سے محبت اللہ کی محبت کا ذریعہ

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن سے محبت ذریعہ ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى سَرِيَّةٍ وَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهِ فِي صَلَاتِهِمْ فَيُخْتِمُ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ فَلَمَّا رَجَعُوا ذَكَرُوا ذَلِكَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ سَلُّوهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذَلِكَ فَسَأَلُوهُ فَقَالَ لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمَنِ فَإِنِّي أَحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبِرُوهُ إِنَّ اللّٰهُ يُحِبُّهُ » (۱)

(نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایک صحابی رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُ کو امیر بنا کر جہاد میں بھیجا۔ ان صحابی کی عادت تھی کہ ہر نماز کی دوسری رکعت کے آخر میں یا ہر رکعت کے آخر میں سورہ قل هو اللہ احد پڑھتے۔ جب یہ فوج واپس

ہوئی تو صحابہ نے ان صحابی کے اس عمل کا ذکر اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان صحابی نے بتایا کہ اس صورت میں رحمن یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس لئے مجھے اس سے محبت ہے۔ آپ نے فرمایا ان صحابی کو بتادو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ یعنی اس سورت سے محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے۔)

اور جو پورے قرآن سے محبت کرتا ہے اس کا تو کیا ٹھکانہ ہے؟ مگر یہاں یاد رکھئے کہ ان صحابی کو صرف ایک سورت سے محبت نہیں تھی؛ بل کہ محبت تو پورے قرآن سے تھی، ہاں زیادہ محبت اس سورت سے تھی۔ غرض یہ کہ قرآن مجید سے محبت رکھنا اس کا حق ہے اور لازم و ضروری ہے۔

ہماری حالت کا جائزہ

اب ہماری حالت کا جائزہ لیجئے کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کے کلام سے محبت رکھتے ہیں اور اس کا یہ حق ہم سے ادا ہو رہا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو کلام مجید سے محبت نہ رکھتا ہو؛ بل کہ بات اکثر کی ہو رہی ہے۔ بعض اللہ کے بندے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جو دین پر چلیں گے؛ مگر اکثر کی حالت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ہم میں قرآن مجید کی محبت نہیں۔ نوجوانوں کو جتنا شوق و ذوق اور جتنی محبت فحش لٹریچر، عریاں ناول اور گندے رسائل سے ہے۔ سوچئے کہ کیا قرآن مجید کا ایسا شوق ہے، ذوق ہے، محبت ہے؟

ٹی وی کا جتنا شوق ہے کیا قرآن کا اس قدر ذوق و شوق ہے؟ فلمی گانوں اور فلمی کہانیوں سے تو محبت ہے؛ مگر قرآن سے ایسی الفت و محبت نہیں ہے۔ اس لیے مشاہدہ

ہے کہ فحش باتیں، گالیاں اور فلمی گانے و کہانیاں، عشقیہ اشعار و نظمیں تو نو جوانوں؛ بل کہ بچوں کو بھی یاد ہیں؛ مگر صحیح قرآن نہیں پڑھ سکتے اور دو چار سورتیں بھی ڈھنگ سے یاد نہیں۔ کیا یہ بات اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم میں قرآن مجید کا شوق و ذوق اور اس کی محبت نہیں ہے؟

اگر محبت ہوتی تو ہم اس کو پڑھتے یاد کرتے اور ہماری زبانیں اس سے تروتازہ رہتیں اور دوسروں کو بھی سناتے اور خود بھی متاثر ہوتے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے۔

ایک بڑھیا کا قرآن سے عشق

اس پر ایک واقعہ یاد آگیا کہ حضرت امام عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر محدث اور رفیع الشان فقیہ اور اکابر صوفیا میں سے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حج کو گئے، حج کے بعد کسی جگہ جا رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ محسوس ہوا کہ کوئی چیز کپڑے میں لپٹی ہوئی ہے۔ قریب جا کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ کوئی انسان ہے، انہوں نے سلام کیا تو اس کپڑے کے اندر سے ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا، امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے مختلف سوالات کئے تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب کہ اس نے ہر سوال کے جواب میں قرآنی آیات پڑھیں، جن سے ان سوالات کا جواب نکلتا تھا۔ واقعہ بہت تفصیلی اور لمبا ہے۔ یہاں چند سوالات اور ان کے جوابات جو ان دونوں کے مابین ہوئے وہ نقل کرتا ہوں۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ: تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

وہ کہنے لگی: ”وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ“

(اللہ جس کو گم راہ کر دے اس کا کوئی رہنما نہیں)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھ لیا کہ یہ راستہ بھٹک گئی ہے۔ اس لئے پوچھا

کہاں جانا چاہتی ہو؟

اس عورت نے قرآن کی آیت پڑھی:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى
الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى﴾

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد
حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی)

آپ سمجھ گئے کہ یہ مکہ سے بیت المقدس جا رہی ہے اور راستہ بھٹک گئی ہے۔

عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ کتنے دن سے یہاں بیٹھی ہو؟
کہنے لگی: ”ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا“ (پورے تین راتوں سے)

آپ نے پوچھا: کیا کچھ کھاؤ گی؟

کہنے لگی: ”اتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ“ (کہ روزوں کو رات تک پورا کرو)

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں راستہ میں ترنم سے شعر پڑھنے

لگا تو اس بوڑھی نے کہا:

”فَافْرُوْا مَا تَيْسَّرُ مِنَ الْقُرْآنِ“ (قرآن میں سے جو ہو سکے پڑھو)

اس طرح جتنے سوالات حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کیے وہ عورت

ہر سوال کا جواب قرآن کی آیات ہی سے دیتی۔ جب وہ اس کے بیٹوں کے پاس اس

کو پہنچا چکے، تو ان سے پوچھا کہ تمہاری ماں کیا قرآن کے سوا کچھ نہیں بولتی؟ تو اس

کے بیٹوں نے بتایا کہ ہماری ماں نے عہد کیا ہے کہ قرآن کے سوا کچھ نہیں بولوں گی

اور یہی حالت ان کی چالیس سال سے ہے۔ اللہ اکبر! کیا عشق و محبت ہے قرآن سے

اس طرح قرآن سے محبت ہو۔ یہ قرآن کا دوسرا حق ہے۔

تلاوتِ قرآن

اور تیسرا حق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یعنی اس کو پڑھا جائے، کیوں کہ قرآن مجید ایک طرف قانونی کتاب ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے نام ایک خط ہے۔ بادشاہ کی طرف سے قانون نامہ یا حکم نامہ آئے یا محبوب کی طرف سے کوئی خط ملے، تو اس کو نہ پڑھنا اور اٹھا کر ایک طرف ڈال دینا کتنا بڑا جرم ہے یا کس قدر بے وفائی ہے؟ اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کا نہ پڑھنا ایک طرف قانونی جرم ہے تو دوسری طرف اپنے محبوب حقیقی سے بے وفائی بھی ہے۔ اس لئے ہمیں تلاوتِ قرآن کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

ایک جگہ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ﴾ (الکہف: ۲۷)

(اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے)

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ قرآن مجید کی تلاوت کیجئے، جب آپ کو حکم ہے تو آپ کے واسطے سے تمام امت کو بھی حکم ہوگا۔

تلاوت کے فضائل و فوائد

پھر تلاوت کے بڑے فضائل ہیں اور کتب حدیث میں مستقل عنوان کے تحت ان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہاں ایک دو فضائل و فوائد ذکر کرتا ہوں۔

ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

«عَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَقُولُ اقْرَأُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا» (۱)

(یعنی قرآن پڑھو، بلاشبہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والے کا

سفارشی بن کر آئے گا۔)

دیکھئے قرآن پڑھنے کی کتنی فضیلت ہے کہ قیامت کے دن قرآن سفارشی بن

کر آئے گا اور پڑھنے والے کی سفارش کرے گا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

« عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالْأُتْرُجَةِ وَالْمُؤْمِنُ
الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالْتَّمْرَةِ » (۲)

(قرآن پڑھنے والے مومن کی مثال ترنج کی سی ہے، جس کی بو بھی

خوش گوار ہے اور مزہ بھی خوش گوار ہے اور قرآن نہ پڑھنے والے مومن

کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور، کہ اس کا مزہ میٹھا ہے؛ مگر خوش بو نہیں ہے۔)

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

”جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملے

گی اور ایک نیکی دس کے برابر ہوگی (یعنی ایک حرف پر دس نیکیاں ملیں

گی) پھر فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ آلم ایک حرف ہے؛ بل کہ الف ایک

حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔“ (۳)

(۱) مشکوٰۃ: ۱۸۴

(۲) مشکوٰۃ: ۱۸۴

(۳) ریاض الصالحین: ۳۲۴

امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ غور فرمائیے کہ جب ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں تو مستقل قرآن مجید کی تلاوت پر کتنا ثواب اور کتنی نیکیاں ملتی ہوں گی؟

تلاوت قرآن پر نزول سکینہ

نیز تلاوت قرآن مجید کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کے وقت اللہ کی طرف سے سکینہ اور فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بخاری وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ قرآن پڑھ رہے تھے، رات کا وقت تھا اور سورہ بقرہ کی تلاوت کر رہے تھے اور ان کا گھوڑا ان کے قریب بندھا ہوا تھا، اچانک وہ اچھل کود کرنے لگا، تو صحابی خاموش ہو گئے تو وہ بھی ٹھہر گیا، پھر انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو وہ بھی اچھلنے لگا، ایسے ہی تین دفعہ ہوا۔ ان کا بچہ گھوڑے کے قریب تھا، جس کا نام مکی تھا۔ ان صحابی کو خوف ہوا کہ کہیں یہ گھوڑا اس بچہ کو روند نہ ڈالے، اس لیے انہوں نے بچہ کو وہاں سے ہٹا لیا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا تو عجیب منظر نظر آیا کہ ایک بادل ہے اس میں چراغ کے مانند بہت سی روشنیاں ہیں۔ انہوں نے یہ قصہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ نے فرمایا کہ اسید! تم پڑھتے رہتے تو اچھا ہوتا، جانتے ہو وہ کیا تھا؟ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، تو آپ نے بتایا کہ یہ اللہ کی طرف سے فرشتے آئے تھے جو تمہاری تلاوت کی آواز کی وجہ سے قریب ہو گئے تھے۔ اگر آپ پڑھتے ہی رہتے تو فرشتے لوگوں کو دکھائی دیتے۔ (۱)

تلاوت کے دنیوی فوائد

حضرات! یہ جو کچھ عرض کیا گیا یہ قرآن مجید کے اخروی فوائد و برکات اور روحانی

فضائل و ثمرات ہیں اور مومن کے لیے یہی اصل سرمایہ ہیں؛ لیکن اسی کے ساتھ اس کی برکات سے دنیوی فوائد و ثمرات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اخروی فوائد کے لیے کرنا نہ چاہتا ہو، تو کم از کم دنیوی فوائد کے لیے ہی سہی تلاوت کا معمول بنالے۔ یہاں چند فوائد کی طرف اشارہ کروں گا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس کو قرآن کی تلاوت نے میرے ذکر اور میرے سے سوال کرنے سے مشغول کر دیا، میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر عنایت کروں گا۔“ (۱)

کتنا بڑا فائدہ ہے کہ تلاوت میں مشغول رہنے والے کو مانگنے والوں سے زیادہ اور بہتر ملے گا اور اس میں دین و دنیا کی سب چیزیں آگئیں۔ ایک مرسل روایت میں ہے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن کے اول حصہ میں سورہ قینین کی تلاوت کر لی، اس کی تمام حاجتیں پوری کی جاتی ہیں۔“ (۲)

اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہر رات سورہ واقعہ پڑھتا ہے، اسے کبھی فاقہ نہ ہوگا۔“ (۳)

(۱) مشکوٰۃ: ۱۸۶

(۲) مشکوٰۃ: ۱۸۹

(۳) مشکوٰۃ: ۱۸۹

بعض روایات میں ہے کہ:

”سورۃ فاتحہ ہر بیماری کے لیے شفا ہے“۔ (۱)

اور بعض روایات میں ہے کہ:

”قرآن اور شہد دو شفاؤں کو پکڑ لو“۔ (۲)

غرض قرآن شفا ہے۔ حاجت و ضرورت کی تکمیل کا باعث ہے۔ فاقہ و مصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے۔ تو اس میں اخروی فوائد بھی ہیں اور دنیوی فوائد بھی ہیں۔

عالموں کے چکر میں نہ پھنسیں

بہت سے لوگ قرآن کو چھوڑ کر جو گیوں، سادھوؤں اور غلط کار عالموں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ قرآن پڑھنا شروع کر دیں تو اس سے ان کی بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں اور دنیوی نعمتیں اور راحتیں بھی حاصل ہو جائیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بعض مسلمان برقعہ پوش عورتیں اللہ کو چھوڑ کر مندروں میں سادھوؤں کے پاس اور چرچوں میں عیسائی پادریوں کے پاس جاتی ہیں اور اپنی ضروریات و حاجات کے لیے کہتی ہیں، اور وہ لوگ کفریہ و شرکیہ اعمال بتاتے ہیں اور بعض لوگ جاہل قسم کے عالموں کے چکر میں پڑ کر کفریہ و شرکیہ اعمال اختیار کرتے ہیں۔

مسلمانوں! ایک خدا کے پرستارو! تم تو دنیا کو دینے کے لیے آئے تھے۔ یہ کیا غضب ہے کہ تم ان کے دروں پر لینے جاتے ہو۔ تمہارے پاس قرآن جیسی عظیم الشان چیز ہے، اس کو پڑھو اور اس پر عمل کرو۔ اس میں تمہاری آخرت و دنیا کا نفع پوشیدہ ہے، گھروں میں روزانہ تلاوت کا معمول بناؤ، گھر میں ہر قسم کی برکتیں و رحمتیں نازل ہوں گی۔

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۱۲/۱

(۲) ابن ماجہ: ۲۲۶

ایک غلطی کی اصلاح

مگر یہاں ایک بات ضرور یاد رہنا چاہئے کہ قرآن کے نزول کا مقصد محض جسمانی بیماریوں سے شفا دینا، مرادوں کو پورا کرنا اور پریشانیوں کو دور کرنا نہیں ہے۔ وہ تو روحانی امراض (کفر و شرک، معصیت و بدعت) کو ختم کرنے آیا اور آخرت کی پریشانیوں کے ازالے کے لیے نازل ہوا۔ ہاں! ضمناً دنیوی پریشانیوں اور جسمانی بیماریوں کے لیے بھی شفا و حل کا کام دیتا ہے؛ مگر اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے کبھی ظاہری بیماری اور پریشانی سے قرآن کو پڑھنے کے باوجود شفا نہ عطا کیا تو نعوذ باللہ قرآن غلط ہے یا بے اثر ہے۔ یاد رکھو! قرآن سے شفا کا حاصل ہونا اللہ کی مشیت و ارادہ پر موقوف ہے۔ جیسے دواؤں سے شفا بھی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن سے ضرور شفا ملے گی اور پھر قرآن کی صداقت کے لئے اس کو دلیل ٹھہرانا غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

بنگور اور اطراف میں ایک صاحب نے عملیات قرآنیہ کا سلسلہ شروع کیا۔ سنا ہے وہ نو مسلم ہیں اور پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی طرف سے لوگوں نے بتایا کہ وہ علاج کرتے ہیں اور شفا کی گیارنٹی دیتے ہیں اور پھر غیر مسلموں کے سامنے اس کو بہ طور دلیل صداقت پیش کرتے ہیں۔ میں نے اس پر مفصل فتویٰ لکھا اور اس میں بتایا کہ یہ دعویٰ بے دلیل بھی ہے اور خطرناک بھی، کیوں کہ اگر خدا کی مصلحت کے تقاضے سے کسی کو شفا نہ ہوئی، تو لوگ پھر قرآن کو نعوذ باللہ غلط قرار دیں گے اور صداقت قرآن پر حرف گیری کریں گے۔ اس لیے قرآن کو امراض جسمانیہ کے لیے بہ اس معنی ماننا چاہئے کہ اگر خدا چاہے تو اس کے ذریعہ سے شفا دے گا؛ مگر اس کو صداقت قرآن کا معیار قرار دینا غلط ہے۔ قرآن کی صداقت و حقانیت تو اس کے روشن دلائل و براہین

اور دل میں اترنے والے اور عقلوں کو اپیل کرنے والے معانی و مضامین اور اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور سحر انگیز اسلوب بیان سے ظاہر ہے۔

قرآن سے فال نکالنے کا حکم

یہاں ایک بات کی وضاحت بھی کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ عامل، قرآن سے فال نکالتے ہیں اور لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ قسمت کی بات قرآن نے بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں اولاً تو یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن تو قسمت کا حال معلوم کرنے فال نکالنے ہی کو ناجائز اور شیطانی عمل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ علم غیب صرف اللہ کو ہے اور حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ غیب کی باتیں بتانے والوں کے پاس جانا بھی گناہ کی بات ہے اور ایسے لوگوں کے پاس جانے سے چالیس دن تک نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔^(۱)

تو سوچئے کہ خود قرآن کو قسمت کا حال اور غیب کی خبر جاننے کے لیے بہ طور فال استعمال کرنا کیسے جائز ہوگا؟ دوسرے یہ کہ اگر کوئی بات اس فال سے نکل آئے تو وہ ایک اتفاقی بات ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اس بات کو قرآن کی طرف منسوب کرنا سراسر قرآن پر ظلم ہے۔ بس یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں نے قرآن کا اصل مقصد نہیں سمجھا، ورنہ ایسے لغو و حرکات نہ کرتے۔ بہر حال ان لغویات کو چھوڑ کر مقصد کی طرف آنا چاہیے۔ ہاں! اس سے ضمناً دیگر فوائد حاصل ہوں تو اللہ کا شکر کرنا چاہئے۔ تو بحث قرآن کی تلاوت پر چلی تھی کہ اس کے دنیوی و اخروی فوائد ہیں۔

قرآن کی فضیلت

پھر اگر اس کو حفظ کر کے دل میں اتار لیا جائے تو کیا پوچھنا؟ حدیث میں فرمایا

(۱) مسلم: ۲/۲۳۳، حاکم: ۸/۱، مسند احمد: ۲/۲۲۹

گیا ہے کہ حافظ قرآن سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور جنت کے درجات چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں پڑھتا تھا۔ بس تیرا درجہ وہی ہے جہاں تو آخری آیت پر پہنچے۔ (۱)

اور ایک حدیث غریب میں ہے کہ حافظ قرآن کی اس کے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کے بارے میں شفاعت قبول کی جائے گی جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔ (۲)
اللہ اکبر! کس قدر اونچا مقام و مرتبہ ہے۔ اس لیے اس کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے۔ اگر پورا نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت جتنا ہو سکے یاد کر لینا چاہئے۔ کیوں کہ ایک حدیث میں ہے:

”جس سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہیں وہ ویران گھر کی طرح ہے“

یہ حدیث صحیح ہے۔ (۳)

غرض قرآن کی تلاوت بھی قرآن پاک کا ایک حق ہے۔

تجوید و ترتیل کی ضرورت

مگر یاد رہے کہ تلاوت جس کی تاکید و ترغیب آئی ہے وہ ایسی تلاوت ہے جس میں تجوید و ترتیل کا لحاظ رکھا گیا ہو۔
قرآن کریم میں حکم فرمایا گیا:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (الزمر: ۴)

(قرآن کو ترتیل سے پڑھو)

(۱) ترمذی: ۱۱۹/۲

(۲) ترمذی: ۱۱۸/۲

(۳) ترمذی: ۱۱۹/۲

یعنی ٹھہر ٹھہر کر اس طرح پڑھو کہ حروف صاف صاف ان کے مخارج سے ادا ہوں اور اس کا لحاظ ہو کہ کہاں ٹھہریں اور کہاں نہ ٹھہریں۔

علمائے فرمایا ہے کہ حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ لفظ کے معنی میں فساد کا اندیشہ ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے زکوٰۃ اور ایک ہے ذکوٰۃ۔ پہلا ز سے ہے اور دوسرا ذال سے ہے۔ ز سے زکوٰۃ کے معنی تو ہیں کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنا جو صدقہ کی ایک قسم ہے۔ اور ذال سے ذکوٰۃ کے معنی ہیں ذبح کرنا۔ اب غور کیجئے کہ کوئی شخص قرآن میں جہاں زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس کو ذال سے پڑھے گا تو کس قدر معنی بگڑ جائیں گے؟ اسی طرح کسی حرف کو اس قدر کھینچنا کہ ایک اور حرف زائد ہو گیا تو یہ حرام ہے، مثلاً ”الحمد“ کو ”الحمدو“ کہنا حرام و ناجائز ہے۔ اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں جس سے یا تو معنی میں خرابی آتی ہے یا لفظ عربیت سے نکل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں سیکھنا، قرآن کو صحیح طور پر پڑھنا واجب و ضروری ہے۔

تجوید کے غلط معنی اور ایک لطیفہ

اب لوگ تجوید و قرأت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ خوب کھینچ تان کر اور آواز بنا کر گایا جائے۔ خواہ اس آواز بنانے اور کھینچ تان کرنے سے معنی ہی بگڑ جائیں اور وہ قرآن قرآن نہ رہے۔ بس لوگوں کو آواز چاہیے اور کھینچ تان چاہیے۔ اور اگر کوئی صحیح قرآن پڑھے؛ مگر بناوٹ نہ ہو اور سادہ انداز سے پڑھے، تو لوگ پسند نہیں کرتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک قاری صاحب مدینہ سے آئے اور کسی علاقے میں قیام فرمایا۔ ان کی تلاوت اور قرأت سے لوگ متاثر ہوئے۔ اس گاؤں کا ایک لڑکا شوق میں آکر ان کی نقل اتارنے لگا اور نقل کرتے کرتے ان کا لب و لہجہ سیکھ لیا؛ مگر نہ اس کو احساس ہوا اور نہ گاؤں والوں کو کہ صرف لب و لہجہ اور آواز کا نام تجوید نہیں

ہے؛ بل کہ اس کو مستقل سیکھنا پڑھتا ہے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کے گاؤں کا لڑکا قاری صاحب کی طرح پڑھتا ہے تو خوش ہو کر اس لڑکے کو قاری صاحب کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ قاری صاحب یہ لڑکا بھی آپ ہی کی طرح قرآن پڑھتا ہے، سن لیجئے۔ لڑکے نے پڑھا تو قاری صاحب نے لاجول پڑھی کہ کوئی حرف بھی ٹھیک نہیں پڑھتا۔ سن کر خاموش بیٹھ گئے۔ تو لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ہمارا لڑکا کیسا پڑھتا ہے؟ تو قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ ایسا ہی قرآن پڑھتا ہے جیسے ہم عرب کے لوگ اردو بولتے ہیں، مکری، مکری، مکری۔ یہ مکڑی مکڑی کی گت بنائی ہے۔ عرب کے لوگ ”ڑ“ نہیں بول سکتے ”ڑ“ کی جگہ ”را“ بولتے ہیں۔

واقعی قاری صاحب نے حقیقت کھول کر رکھ دی کہ جس طرح لڑکی جگہ ر بولنے سے لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کے حرفوں کو غلط پڑھنے سے معنی میں فساد آتا ہے۔ اسی کو سیکھنے کا نام تجوید ہے، نہ کہ آواز بنانے اور الفاظ کو بگاڑنے کا نام۔

تجوید کے دو درجہ ہیں

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ تجوید کے دو درجہ ہیں: ایک درجہ فرض ہے۔ دوسرا مستحب۔ فرض کا درجہ یہ ہے کہ حروف کے مخارج اور ان کی صفات لازمہ کا لحاظ رکھے اور اوقاف کی رعایت کرے۔ اور دوسرا درجہ مستحب ہے اور وہ یہ ہے اخفاء، اظہار ادغام کا اہتمام کرے اور معروف و مجهول کے فرق کی رعایت کرے۔ یہ سب باتیں یوں بیان کرنے سے سمجھ میں نہیں آتیں؛ بل کہ کسی جاننے والے سے سیکھنا پڑھے گا۔

چند مثالیں

البتہ ان کی اہمیت کی وضاحت کے لیے چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

اردو میں ایک لفظ ہے جنگ۔ اس کا نون ناک میں چھپا کر پڑھتے ہیں۔ اسی طرح پلنگ کا نون بھی ناک میں پڑھتے ہیں۔ اس کو ظاہر کرنے سے لفظ کی خوب صورتی میں فرق آ جاتا ہے۔ اسی طرح عربی میں بعض جگہ نون کی آواز کو ناک میں چھپا کر پڑھتے ہیں، اس کو اخفاء کہتے ہیں جیسے اَنْتَ، اس کو ظاہر کرنے سے خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور بات بھی سمجھ سکتے ہیں، وہ یہ کہ قرآن میں حرکات کو معروف آواز سے پڑھنا چاہیے نہ کہ مجہول آواز سے۔ اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ انگریزی میں ایک لفظ ہے شو (shoe) جس کے معنی ہیں جوتا۔ دوسرا لفظ ہے شو (show) جس کے معنی ہیں نمائش اور دکھاوا۔ جب پہلا لفظ پڑھا جائے گا، تو جو آواز نکلتی ہے وہ معروف ہے اور جب دوسرا لفظ پڑھا جائے گا، تو جو آواز نکلتی ہے وہ مجہول ہے۔ اب غور کیجئے کہ کوئی جوتے کے لئے (show) شو کی آواز نکالے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اسی طرح (lift) اور (left) کی آواز کا فرق ہے۔ پہلے کی آواز معروف ہے اور دوسرے کی مجہول؛ مگر غور فرمائیے کہ اس ذرا سے فرق سے معنی کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں؟ اسی طرح قرآن میں معروف آواز پڑھنا چاہیے، جیسے الْمَغْضُوبِ میں ضُو کو معروف پڑھنا چاہیے۔ اگرچہ عربی میں معروف کی جگہ مجہول پڑھنے سے معنی نہیں بدلتے؛ مگر لفظ کا حُسن ختم ہو جاتا ہے۔ غرض یہ درجہ مستحب کا ہے؛ مگر اس کے بغیر قرآن پڑھنے کا لطف نہیں آتا۔ آخر سوچئے کہ ہم انگریزی زبان اور اس کے لب و لہجہ کو سیکھنے کی جب فکر کرتے ہیں تو قرآن کو بہتر سے بہتر انداز سے پڑھنے کی کیوں فکر نہیں کرتے؟

کیا قرآن کی تلاوت بغیر سمجھے درست ہے؟

بعض لوگ قرآن کی تلاوت اور تجوید کی رعایت کو فضول سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل مقصد قرآن کے معانی و مضامین ہیں اور اگر مضمون سمجھ میں آجائے تو کافی ہے، تلاوت کرنا اور بنا کر قرآن پڑھنا فضول ہے۔

مگر یہ بات غلط ہے۔ ان لوگوں نے قرآن کو عام کتابوں پر قیاس کر لیا ہے کہ جیسے عام کتابوں کے مضامین کو سمجھ لیا جائے تو کافی ہے۔ الفاظ کی رعایت کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ قرآن کو بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں؛ مگر معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کے الفاظ بہ جائے خود مقصود و مطلوب ہیں، جیسے اس کے معنی اور مضامین مقصود ہیں۔ اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی کسی کو معلوم نہیں جیسے کہ الم، المر، ص، ق، حم وغیرہ حروف مقطعات، کہ ان کے معنی ہم نہیں جانتے ہیں؛ مگر ان کے پڑھنے پر ثواب ملتا ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن کے الفاظ بھی بہ جائے خود مقصود ہیں۔ ہاں صرف تلاوت پر اکتفا نہ کرنا چاہیے؛ بل کہ اس کے ساتھ قرآن کے معانی و مضامین کو بھی سمجھنا چاہئے؛ مگر اس سے یہ مطلب لینا بھی درست نہیں کہ بغیر سمجھے قرآن پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہ گم راہی کی بات ہے۔ افسوس کہ آج اس ذہنیت کے بہت سے لوگ ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ لوگ نہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور نہ بے سمجھے پڑھتے ہیں، حالاں کہ ان کے نزدیک جب قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی اہمیت ہے تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے تھا؛ مگر یہ دونوں باتوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت بھی مستقل ایک عبادت ہے، اس کو تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

تدبرِ قرآن

قرآن پاک کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کرے اور اس کے معانی اور مضامین کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کلام کا مقصود اصلی یہی ہوتا ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ لہذا قرآن جو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاب فرمایا ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کلام اللہ کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفًا لُّهَا ﴾

(یعنی اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ) یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں

کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔ (مُحَمَّدٌ: ۲۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں تدبر نہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہوں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قرآن میں تدبر و تفکر واجب ہے۔ (۱)

اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ الاکلیل میں فرماتے ہیں کہ آیت ”افلا يتدبرون القرآن“ قرآن میں تدبر کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ (۲)

(۱) تفسیر قرطبی: ۲۹۰/۵

(۲) الاکلیل: ۸۸

غرض یہ کہ قرآن میں غور و فکر کرنا، اس کے معانی و مطالب کو معلوم کرنا ضروری اور لازم ہے۔

دو انتہا پسندانہ نظریات

یہاں ایک بات بہ طور تنبیہ عرض کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عوام میں آج دو قسم کی انتہا پسندانہ نظریات رائج ہیں: ایک یہ کہ بعض لوگ بغیر سمجھے قرآن مجید پڑھنے کو فضول اور لغو کہتے ہیں، یہ ایک انتہا ہے۔ اکثر عوامی طبقہ اس کے بالکل برعکس قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر کو غیر اہم خیال کرتا ہے؛ بل کہ بعض جاہلوں کا عقیدہ یہاں تک فاسد ہو گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن عام لوگوں کو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ دونوں خیالات و نظریات غلط و انتہا پسندانہ ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ بلا فہم تلاوت بے کار ہے، وہ بھی غلطی پر ہیں، کیوں کہ بلا فہم تلاوت پر ثواب ضرور ملتا ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ لینا کہ قرآن سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں یا یہ کہ قرآن سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں یہ بھی غلط بات ہے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ نے ”تقویۃ الایمان“ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے بڑا علم چاہیے، ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں؟ یہ بات غلط ہے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ قرآن نہ سمجھنا اور اس کے لئے یہ بہانہ کرنا صحیح نہیں؛ بل کہ قرآن میں تدبر کرنا چاہیے۔

(۱) تقویۃ الایمان: ۳۰

تدبر قرآن کے فوائد

اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ قرآن کے مضامین و معانی دل میں اترتے ہیں اور انسان کو ہدایت مل جاتی ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی مسلمان بہن و بہنوئی کو مارنے کے لئے ان کے گھر گئے اور وہاں جا کر بہنوئی کو پیٹا، پھر بہن کو بھی مارا، جب تھک کر بیٹھ گئے تو خیال ہوا کہ چلو قرآن کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کیا ہے؟ جب بہن سے لے کر قرآن کی سورہ ظلمنا پڑھی اور عربی تو وہ تھے ہی، شاعر و فصیح اور خطیب و مبلغ بھی تھے، معنی سمجھا اور اس پر غور کیا تو نتیجہ کیا ہوا کہ اسلام میں داخل ہو گئے اور چلے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سر لینے، اب سر دینے کو چلے۔ یہ ہدایت قرآن سمجھنے سے حاصل ہوئی۔ (۱)

اس پر اور ایک واقعہ یاد آگیا جو حدیث میں آتا ہے کہ قریش نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ کو بھیجا کہ وہ آپ سے گفتگو کرے، اس نے آکر کہا کہ آپ نے جو ایمان کی دعوت کا کام جاری کیا ہے، اس سے آپ کا مقصد اگر مال و دولت ہے تو ہم آپ کو مال و دولت وافر طور پر دیں گے، اور حکومت چاہیے، تو ہم قریش مکہ اپنا حاکم بھی بنانے تیار ہیں، اور اگر آپ کو عیش و عشرت چاہیے، تو اس کے اسباب بھی جمع کر دیں گے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اب تم میری سنو، پھر سورہ حم سجدہ کی آیت تلاوت فرمائی اور سجدہ کی آیت پڑھی پھر سجدہ کیا اور عتبہ نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے باندھے ان پر ٹیک لگا کر سنتا رہا۔ پھر جب واپس ہوا تو کفار جو اس کے منتظر تھے، کہنے لگے کہ یہ جس چہرے سے گیا تھا اس چہرے سے واپس نہیں آ رہا

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ متعدد کتب سیر و تاریخ میں ہے، دیکھو: سیرت ابن ہشام، ۳۲۳، ۳۲۶، تاریخ الخلفاء: ۱۰۳ وغیرہ

ہے۔ عتبہ نے آکر ان سے کہا میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے ایسا کلام کبھی بھی نہیں سنا۔ قسم بہ خدا نہ تو وہ شعر ہے اور نہ تو کہانت ہے اور نہ جادو ہے۔^(۱)

قرآن فہمی کے لیے استاذ کی ضرورت

مگر یاد رکھو کہ قرآن فہمی بغیر استاذ کے حاصل نہیں ہوتی جیسے دنیوی علوم و فنون بغیر استاذ کے حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے خود قرآن سمجھنے کے بہ جائے اس کو جو اس کا ماہر ہے، استاذ بنا لینا چاہیے، ورنہ وہی حال ہوگا جیسے ایک صاحب نے خود بہ خود قرآن کا ترجمہ دیکھا اور پڑھا اور اس میں ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو! تم ”را عنا“ مت کہو ”انظرنا“ کہو۔ اس دن سے انہوں نے قرآن کی آیت سے ”را عنا“ کا لفظ نکال دیا اور کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ہی تو فرمایا کہ ”را عنا“ مت کہو، حالاں کہ یہ ایک خاص موقعہ کی آیت ہے۔ پھر اتنا بھی نہ سوچا کہ اگر قرآن سے اس کو نکال دیا جائے تو پھر دوسرے پڑھنے والوں کو اس حکم کا پتا کیسے چلے گا؟ غرض خود ہی قرآن میں تدبر کے بہ جائے کسی باقاعدہ عالم سے اس کو سیکھے اور اس کو سمجھے۔

ہر آدمی کو اجتہاد کا حق نہیں ہے

قرآن فہمی کا بیان آپ کے سامنے آگیا؛ مگر ایک بات یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں احکام کی آیتیں ہیں، ان میں اجتہاد کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں؛ بل کہ اس کے لیے متعدد علوم پر مہارت کی ضرورت ہے۔ اس لیے قرآن پڑھ کر اس کے عام مضامین سے فائدہ تو اٹھائے؛ مگر خود ہی اپنی عقل سے ان میں اجتہاد نہ کرے،

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲۹۴/۱

یہ کام فقہائے کرام کا ہے۔ اگر ہر آدمی اجتہاد کرے گا تو نہ معلوم کس بات سے کیا نتیجہ نکالے گا اور کیا گڑبڑ کر دے گا؟۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک گاؤں میں ایک شخص درخت پر چڑھ گیا؛ مگر چڑھنے کو تو چڑھ گیا، اترنا نہیں آتا تھا۔ بہت چینا، چلایا، لوگ جمع ہو کر سوچنے لگے کہ کس طرح اس کو اتارے، اتنے میں ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں اس کو اتاروں گا، تم رسی لے آؤ، لوگ رسی لے آئے، اس نے رسی کو درخت پر اس آدمی کی طرف پھینکا اور کہا کہ اس کو پکڑ کر اپنی کمر کو باندھ لے، اس کے بعد اس شخص نے نیچے سے زور سے جھٹکا دیا، وہ آدمی تو نیچے آ گیا؛ مگر اس کی روح اوپر چلی گئی، یعنی بے چارہ مر گیا۔ اب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، تو نے یہ کیا کیا؟ تو کیا جواب دیتا ہے کہ میں نے اس طرح سے کئی آدمیوں کو کنویں سے نکالا ہے۔ واہ کیا اجتہاد ہے؟ کہ کنویں کے مسئلہ پر درخت کو قیاس کر لیا ہے۔ اس طرح ہر آدمی احکام کی آیت میں اجتہاد کرے گا، تو سوائے گڑبڑی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

غرض یہ کہ ایک حق ہے مذہب قرآن؛ مگر کسی استاذ کی رہنمائی میں ہونا چاہیے؛ مگر آج جدت پسندوں اور ماڈرن اسلام کے داعیوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا ہے، جو قرآن کی من مانی تشریح و تفسیر اور احکام قرآن میں بے موقعہ اجتہاد و استنباط کرتا ہے اور تمام علمائے سلف و خلف کے خلاف رائے دیتا ہے۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ طبقہ علمائے اسلام کو الزام دیتا ہے کہ انھوں نے قرآن و شریعت کو نہیں سمجھا۔ افسوس کہ علماء پر الزام رکھنے والے ان جدید مفسرین و جدید مجتہدین کی علمی حالت یہ ہے کہ قرآن صحیح پڑھنا بھی نہیں آتا۔ اور ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عربی زبان سے اور شرعی علوم سے بالکل جاہل ہیں، پھر بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے۔

غرض یہ کہ ساری باتیں جاہلانہ ہیں۔ لہذا عوام کو چاہیے کہ قرآن کو ضرور سمجھیں،

مجتہد بننے کی کوشش نہ کریں۔ یہ فقہائے کرام کا کام ہے۔ ہاں! فقہا سے پوچھ کر ان کے احکام کو جو قرآن میں آئے ہیں سمجھیں۔

اطاعت قرآن

قرآن مجید کا آخری اور سب سے بڑا حق یہ ہے کہ قرآن کی اطاعت کی جائے کیونکہ قرآن کا نزول ہوا ہی ہے اسی مقصد کے لیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام و قانون بیان فرمایا ہے اور جن جن باتوں کی تعلیم و ترغیب دی ہے، ان پر عمل کیا جائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا اور جن چیزوں کی مذمت و برائی بیان کی ہے، ان سے پرہیز کیا جائے۔

چنانچہ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لَأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾

(الأنعام: ۱۹)

یہ قرآن مجید مجھ پر نازل ہوا تا کہ میں تم کو اور جن جن لوگوں تک یہ

پہنچے ان کو اس کے ذریعہ ڈراؤں۔

یعنی اس کے احکام پر نہ چلنے اور اس کی اطاعت نہ کرنے کا وبال و عذاب سنا کر ان کو ڈراؤں۔ معلوم ہوا کہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ نیز قرآن میں متعدد مقامات پر قرآن کو ہدایت دینے والی کتاب کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا:

﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ (البقرة: ۲)

(کہ تمام انسانوں کو ہدایت دینے والی کتاب ہے)

قرآن میں ہدایت ہے

معلوم ہوا کہ قرآن ایک ہدایت نامہ ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے ہدایت کا مکمل سامان جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ہدایت کے معنی ہیں: اداء الطریق (راستہ دکھانا) قرآن انسانوں کو زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ دکھاتا ہے، اور ہر شعبہ زندگی میں ان کی رہنمائی کا کام کرتا ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ہو، پھر اجتماعی زندگی میں عائلی و قبائلی زندگی ہو، یا شہری و مدنی زندگی ہو، پھر ان زندگیوں کا کوئی پہلو و رخ کیوں نہ ہو، قرآن ہر جگہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہ اسی لئے تو کرتا ہے کہ ہم اس کی ہدایت کے مطابق عمل کریں۔ اگر عمل مقصود نہ ہوتا تو یہ ہدایت نامہ بھیجا ہی کیوں جاتا؟

ایک خطرناک غلطی کا ازالہ

یہاں ایک عام و خطرناک غلطی کا ازالہ بھی ہو گیا، جو اچھے اچھے پڑھے لکھے؛ بل کہ دین دار لوگوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے، وہ یہ کہ بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں قرآن مجید کے بارے میں یہ تصور قائم ہو گیا ہے کہ قرآن محض پڑھنے کی چیز ہے اور اس پر ثواب مل جاتا ہے، جو ہم کو آخرت میں کام آئے گا۔ گویا کہ قرآن کا فائدہ صرف یہ ہے کہ اس کی تلاوت کا ثواب آخرت میں مل جائے گا۔ باقی دنیا میں قرآن کا کوئی فائدہ ذہنوں میں نہیں ہے، حالاں کہ یہ ایک نہایت خطرناک غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ قرآن کی تلاوت پر ثواب ملتا ہے جیسا کہ پہلے میں نے خود عرض کیا ہے؛ مگر یہ خیال باطل ہے کہ قرآن کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں، حالاں کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک ہدایت نامہ بنا کر نازل فرمایا ہے اور حکم ہے کہ ایک مؤمن کی پوری زندگی قرآن مجید کے قانون و اصول کے عین مطابق ہونا

چاہیے۔ عبادت ہو، معاشرت ہو، معیشت ہو، اخلاقیات ہوں، سیاست ہو، معاملات ہوں، تمام کے تمام قانونِ قرآن کے احاطہ اور دائرہ میں ہونا چاہیے؛ مگر اب لوگ اس کے بہ جائے اپنی پوری زندگی کافروں، فاسقوں، مشرکوں، یہودیوں، عیسائیوں، انگریزوں، ہندوؤں کے قانون کے مطابق گزارتے ہیں۔ معاشرت و تہذیب انگریزوں کی اختیار کرتے ہیں، تقریبات، شادی و غم میں ہندوؤں کے رسوم کو اپناتے ہیں۔ تجارت و معاملات میں یہودیوں کی اسکیموں پر ایمان رکھتے ہیں۔ سیاسی معاملات میں کفار و فساق کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ کبھی خیال تک نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم الشان کتاب قرآن مجید میں ہماری زندگی کے تمام شعبوں کے لیے جب ہدایت فرمادی ہے تو ہم اس کے مطابق زندگی گذاریں، بس قرآن کو آخرت میں ثواب جمع کرنے کے لیے تلاوت تک محدود کرکھا ہے کیا یہ خطرناک غلطی نہیں ہے؟

اگر ہم سے پوچھا جائے تو

سوچئے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھ لے کہ میں نے زندگی گزارنے کے لئے قرآن کو رہنمائی و ہدایت کا سامان بنایا اور تم تک پہنچایا، تا کہ اپنی زندگی اس کے مطابق بناؤ؛ مگر تم نے میرا قانون چھوڑ کر کبھی یہود کا، کبھی نصاریٰ کا، کبھی ہندوؤں کا، کبھی مجوسیوں کا قانون اپنایا۔ بتاؤ! کیا اسی واسطے میں نے اس کو نازل کیا تھا؟ اگر ہم سے یہ پوچھا جائے تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ کیا اس وقت ہمارا دین دار طبقہ یہ کہہ کر چھٹکارا پاسکتا ہے کہ اے اللہ! ہم نے روزانہ اتنے پارے پڑھ کر ثواب جمع کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہ جواب کچھ کام نہ آئے گا۔ لہذا ذہن سے یہ نکال دینا چاہئے کہ قرآن صرف پڑھنے اور آخرت میں ثواب جمع کرنے کے لیے ہی ہے؛ بل کہ قرآن دنیا میں زندگی گزارنے اور اپنے آپ کو اس قانون و اصول

پر ڈھالنے کے لیے بھی ہے، جس کا نتیجہ ضرور بالضرور آخرت میں نجات ہوگا؛ مگر کوئی صرف میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں تلاوت کو غیر مفید قرار دے رہا ہوں۔ نہیں؛ بل کہ میرا منشا یہ ہے کہ جس طرح قرآن کا ایک حق تلاوت ہے، اسی طرح؛ بل کہ اس سے بڑا حق اطاعت ہے۔ اطاعت سے غفلت؛ بل کہ ایک درجہ میں اعراض اور غیروں کے قوانین پر رضا، یہ خطرے کی بات ہے اور قرآن کو ہدایت نامہ نہ سمجھنا، محض تلاوت کے لئے مخصوص کرنا سخت خطرناک غلطی ہے۔

اطاعت قرآن کا محدود تصور

اسی سلسلہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض حضرات قرآن کی اطاعت کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور عمل بھی اس پر کرتے ہیں؛ مگر ان کے ذہنوں میں اطاعت قرآن چند مخصوص چیزوں تک محدود ہے۔ چند عبادات اور چند دیگر معاملات میں، تو قرآن پر چلتے ہیں؛ مگر بے شمار اور چیزوں میں اطاعت قرآن سے غفلت کرتے ہیں۔ گویا بعض حصہ پر عمل کرتے ہیں اور بعض پر نہیں کرتے اور ان دوسری چیزوں میں غیروں کے قانون پر راضی ہیں۔ مثلاً عبادات میں تو اللہ کا قانون لیتے ہیں؛ مگر جب مسئلہ آتا ہے معاشرت کا، معاملات کا، سیاسیات کا تو غیروں کا قانون اپناتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک قرآن کی اطاعت یہ ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکاۃ ادا کرو اور حج کرو۔ اسی طرح چند امور باقی زندگی من مانی گزارتے ہیں، حالاں کہ قرآن کا مطالبہ تو یہ ہے کہ مکمل اطاعت و اتباع ہو اور ہر معاملہ میں اتباع و اطاعت ہو۔

قرآن میں صاف حکم دیا گیا ہے:

﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ﴾ (الأنعام: ۱۵۵)

(یہ) قرآن) مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے۔ پس
تم اس کا اتباع کرو۔)

ظاہر ہے کہ یہاں اس کی اتباع سے مراد پوری کتاب کی اتباع ہے، کچھ حصہ یا
چند اجزا کی اتباع نہیں۔
دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (الْأَنْعَامُ: ۳)

(جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا

گیا ہے، اس کی اتباع کرو۔)

یہاں ”ما انزل“ میں جو ”ما“ ہے اس کا عموم بتا رہا ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کی
طرف سے نازل کیا گیا وہ سب قابل اتباع ہے۔ لہذا اتمام قرآن پر عمل کرنا چاہئے۔
قرآن پر عمل کرنے کی فضیلت

قرآن مجید پر عمل کرنے کی بڑی فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے۔ بخاری
وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ:

”حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ جو مؤمن قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس
کی مثال ایسی ہے جیسے ترنج؛ جس کا مزہ بھی عمدہ ہوتا ہے اور خوش بو بھی
عمدہ ہوتی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اور اس پر عمل نہیں کرتا اس
کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور؛ کہ اس کا مزہ عمدہ ہے؛ مگر اس میں کوئی
خوش بو نہیں ہوتی۔“ (۱)

اس حدیث میں قرآن پر عمل کرنے والے مؤمن کو ترنج سے تشبیہ دی گئی ہے کیوں کہ ترنج خوش منظر بھی ہوتا ہے، خوش بودار بھی ہوتا ہے اور مزے دار بھی ہوتا ہے۔ پھر پھل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مختلف امراض میں دوائی کا کام بھی کرتا ہے، حتیٰ کہ اس کا چھلکا بھی دوا کے کام آتا ہے۔ اس کے بیج سے تیل نکالا جاتا ہے، جس کے بہت سے طبی فوائد ہیں۔ اس کا کھانا معدہ کی صفائی کا باعث اور ہاضمہ کا نظام اس سے درست ہو جاتا ہے۔^(۱)

اس طرح مؤمن جو قرآن پر عمل کرتا ہے، اس کا ظاہر و باطن دونوں عمدہ ہوتے ہیں اور اس کی ہر ادا اور عمل مفید ہوتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اور روحانی خوش بوؤں سے روح کو معطر کر دیتا ہے۔ کس قدر بڑی فضیلت ہے اس مؤمن کی جو قرآن پڑھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔

قیامت کے دن قرآن حجت ہوگا

نیز حدیث میں ہے کہ:

«الْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ أَوْ عَلَيْكَ» (۲)

”یعنی قرآن تیرے حق میں حجت ہوگا یا تیرے خلاف حجت ہوگا۔“

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح فرماتے ہیں کہ یعنی تجھ سے فائدہ ہوگا، اگر تو نے اس پر عمل کیا۔ ورنہ تیرے خلاف حجت ہوگا۔
نیز ایک حدیث میں ہے کہ:

(۱) فتح الباری: ۶۲/۹

(۲) مسلم: ۱/۱۸

”قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی: ان میں سے

ایک قرآن ہوگا جو بندوں کے بارے میں حجت کرے گا“ (۱)

یعنی جن لوگوں نے اس کے احکام پر عمل کیا، اس کے موافق گواہی دے گا۔
اور جن لوگوں نے عمل نہیں کیا، ان کے خلاف گواہی دے گا۔ معلوم ہوا کہ قرآن کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

مؤمن کی شان یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرے

بل کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کی شان ہی یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن کی حرام

کردہ چیزوں کو حلال کر لیا (یعنی حرام کاموں کو حلال کی طرح اختیار

کر لیا) اس نے قرآن پر ایمان نہیں رکھا“۔ (۲)

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم ترغیب کے لئے بیان کرنے کی گنجائش ہے،
جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی حرام کردہ
چیزوں سے نہ بچنا مؤمن کا کام نہیں ہو سکتا، یہی ہے کہ عمل کی تاکید کی گئی۔

قرآن پر عمل کرنے کا ثواب

پھر قرآن پر عمل کرنے کا ثواب بتا کر اس طرف راغب کیا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(۱) مشکوٰۃ: ۱۸۶

(۲) مشکوٰۃ: ۱۱۸

« قَالَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ الْبَسَ وَالِدَاهُ تَاجًا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءٌ هَا أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ
الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ بِكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهِذَا » (۱)

(جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا، اس کے ماں باپ کو
قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا، جس کی روشنی اس سورج سے
بہتر ہوگی جو تمہارے گھروں میں لا کر لگا دیا جائے۔ اب تمہارا اس شخص
کے بارے میں کیا گمان ہے جس نے خود اس پر عمل کیا؟
یعنی اگر سورج کو گھر میں لا کر لگا دیا جائے تو جیسی روشنی ہوگی اس سے زیادہ اس
تاج کی روشنی ہوگی۔ یہ تاج قرآن پر عمل کرنے والے کے والدین کو پہنایا جائے
گا۔ اب اندازہ کرو کہ خود عمل کرنے والے کا کیا مقام و مرتبہ ہوگا؟
غرض معلوم یہ ہوا کہ محض قرآن پڑھنا کافی نہیں؛ بل کہ عمل بھی ضروری ہے۔
قرآن پڑھنے والے کیسے ہوتے ہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بڑی عجیب بات فرمائی:
”حامل قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی رات کی (عبادت
سے) پہچانا جائے، جب کہ سب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ اور وہ اپنے
دن (میں قانون خدا پر عمل) سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ حد سے گزر
ہے ہوں۔ اور وہ اپنے غم سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ تفریح بازی
میں مشغول ہوں۔ اور وہ اپنے رونے سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ
ٹھٹھا مار رہے ہوں۔ اور وہ اپنی خاموشی سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ

باتوں میں مشغول ہوں۔ اور وہ اپنے خشوع سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ فخر و غرور میں مبتلا ہوں۔ (۱)

یہ ہے صحیح معنی میں حامل قرآن جس کی ہر ادا قرآن کے مطابق ہوتی ہے۔

قرآن کا نزول عمل کے لئے ہوا ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نزول ہوا ہی ہے عمل کرنے کے لیے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا کہ اس پر لوگ عمل کریں؛ مگر لوگوں نے اس کے پڑھنے ہی کو ایک عمل بنا لیا۔ تم میں سے ایک آدمی قرآن کو شروع سے آخر تک اس طرح پڑھ جاتا ہے کہ ایک حرف بھی ساقط نہیں کرتا؛ مگر اس پر عمل کو ساقط کر دیتا ہے۔ (۲)

اور سلف کا یہی طریقہ تھا کہ قرآن میں جو پڑھا، اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تم سے پہلے لوگ (صحابہ تابعین) قرآن کو اپنے رب کے خطوط سمجھ کر پڑھتے، رات میں اس پر غور و فکر کرتے اور دن میں اس کو نافذ کرتے۔ (۳)

غرض قرآن مجید کا یہ بڑا حق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس کے احکامات میں سے اوامر پر پابندی کی جائے اور ممنوعات اور محرمات سے پرہیز کیا جائے۔

حرف آخر

یہ پانچ حقوق ہیں قرآن کریم کے، جن کی تفصیل آپ کے سامنے رکھی گئی: پہلا

(۱) احیاء العلوم: ۱/۲۷۴

(۲) احیاء العلوم: ۱/۲۷۵

(۳) احیاء العلوم: ۱/۲۷۵

عظمت، دوسرا محبت، تیسرا تلاوت مع الصحتہ، چوتھا تدبیر، پانچواں اطاعت۔ جو شخص ان کو ادا کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جگہ کام یابی عطا فرمائے گا اور جو ان حقوق کو ضائع کرے گا وہ کام یابی سے محروم ہوگا۔
لہذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ ان حقوق کو پورے طور پر ادا کرنے کی کوشش کرے تاکہ کام یابی و سرخ روئی حاصل ہو۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام اہل اسلام کو حقوقِ قرآن ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

احقر محمد شعیب اللہ خان
ناظم مدرسہ مسیح العلوم



اسلام میں عورت
کا کردار

التقریظ

حضرت اقدس مفتی نصیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سابق صدر مفتی مفتاح العلوم جلال آباد (یوپی)

بانی و مہتمم ادارہ فیض مسیح الامت، بڑوت (یوپی)

حمداً و سلاماً:

اما بعد: احقر نصیر احمد غفرلہ مظہر مدعا ہے کہ مولانا شعیب اللہ خان، جوان صالح، مہتمم مدرسہ مسیح العلوم بنگلور کا رسالہ ”اسلام میں عورت کا کردار“ بعض حصہ سنا اور اس کے مضامین کا اجمالی مطالعہ کیا بہت جامع اور بڑا نافع معلوم ہوا، طبقہ نسوان کے لیے بہ راہ راست اور طبقہ رجال کے لیے من حیث التبلیغ و التعليم و الترویة سہل زبان اور فصاحت بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سب کو مطالعہ و عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین

(مفتی) نصیر احمد غفرلہ

واردِ حال

مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور

۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ

التقریظ

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب دامت برکاتہم

خلیفہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم
و مہتمم مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور سہارنپور، یوپی

حامدًا و مصلیًا:

اما بعد: جو لوگ اسلامی احکام سے نا آشنا ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی سے محروم ہیں اور وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی آزادی سلب کر لی ہے، اسے گھر کی چار دیواری میں محصور کر دیا ہے، ایسے لوگوں کے لیے صاحب فضل و کمال حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان مدظلہ العالی نے جن کا مزاج ہے ے

آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

”اسلام میں عورت کا کردار“ تصنیف فرمائی ہے، جس میں قرآن و حدیث کے آئینہ میں عورت کا مقام دکھلایا ہے۔ وہ مذہب اسلام ہی ہے جس نے عورت کو عزت کا مقام عطا فرمایا۔ اسلام آنے سے قبل عورت کا یہ حال تھا ے

اگر جن بیٹھتی دختر کوئی نقدیر کی ہٹی
چھو ندر سے بری معلوم ہوتی تھی اسے بیٹی
گڑھا ایک کھود کر دختر کو زندہ گاڑ دیتے تھے
کوئی بچھو تھا دامن میں کہ دامن جھاڑ دیتے تھے

قرآن پاک نے ”وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ“ (النح) کہہ کر عورت کو حیات بخشی۔ حضرت مولانا موصوف نے کتاب ہذا میں عام فہم انداز میں عورت کے حقوق، تعلیم و تربیت، آداب زندگی قلم بند فرمائے ہیں۔ یہ کتاب ایک نسخہ ہے جس کے استعمال سے بگڑا ہوا معاشرہ درست ہو سکتا ہے۔ خدا کرے یہ کتاب ہر گھر میں پہنچ جائے اور امت کو استفادہ کی توفیق ہو۔

دعا ہے رب ذوالجلال قبول فرما کر مصنف کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔

محمد اسلم

خادم جامعہ کاشف العلوم، چھٹمل پور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

انتساب

اس مشفق و مہربان ہستی کے نام، جن کی مشفقانہ تعلیم و تربیت، مصلحانہ رہبری و ہدایت، دُور رس فکر سازی اور حقیقت پسندانہ ہمت افزائی نے ایک ایسے نامبارک ماحول و معاشرے سے، جو مادیت کا پجاری، تہذیب جدید کا شیدائی اور اسلام کا باغی ہے، جس کی رگ رگ میں حقائق سے چشم پوشی، مزاج میں مظاہر پرستی اور ایمان میں کم زوری ہے۔ اور غفلت شعاری، دین کے معاملے میں سہل انگاری اور آخرت سے اعراض و بے التفاتی جس کی شرست بن گئی ہے، فیشن پرستی، عریانی و بے حیائی جس کے نزدیک ترقی کی علامت و دلیل ہے، مجھ حقیر و فقیر کو نکالا اور اس قابل بنایا کہ تہذیب جدید کے متوالوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال سکوں اور فیشن پرستی اور بے حیائی و عریانی کے علم برداروں کو اسلام کے سامنے سرنگوں ہونے کی برملا دعوت دوں۔

میری مراد اس سے میری والدہ ماجدہ ہیں جنہوں نے ۱۸ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۹۸ء بروز پیر ایک طویل علالت کے بعد اللہ کا ذکر کرتے کرتے اس دار الفنا سے منہ موڑ کر دار البقا کی طرف کوچ فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ ان کی قبر کو نور سے منور کرے اور جنت الفردوس میں ان کو ٹھکانا عطا فرمائے۔ آمین۔

عمر بھرتیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

۷/ جمادی الاول ۱۴۱۹ھ

تقدیم

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

(اقبال)

مغربی تہذیب و تمدن نے جہاں اور بہت ساری برائیوں کو اپنی شیطانی ملمع کاری سے دل فریب و دل چسپ بنا کر پیش کیا ہے، وہیں اس نے عورت کی بے حیائی و عریانی و فحش کاری کو آزادی نسوان اور مساوات کے خوش کن نعروں اور خوش نما دعوؤں سے دل چسپ بنا دیا، جس کے نتیجہ میں بے حیائی و عریانی اور فحش کاری کا بازار ایسا گرم ہوا کہ موجودہ معاشرہ، شہوت کی ایک بھڑکتی بھٹی کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور زن، اس تعلیم و تہذیب کی تاثیر سے زن کی اُن صفات و خصوصیات سے خالی و عاری ہو چکی ہے جو اس کی معصوم نسوانیت کا طبعی و فطری اقتضا تھا، یہی وہ جدید تعلیم و تہذیب ہے جس کو بہ قول اقبال ”ارباب نظر موت کہتے ہیں“

موت کے اس خوں خوار و خوف ناک پنجے سے کوئی چیز عورت کو بچا سکتی اور اس کو دوبارہ نئی زندگی دے سکتی ہے، تو وہ صرف اور صرف اسلام کی وہ تعلیم ہے جس نے جاہلی دور کے وحشی انسانوں کو انسانیت کا سبق پڑھایا، بھٹکتی ہوئی انسانیت کو راہ ہدایت پر گام زن کیا، بے حیائی کے حیا سوز جہنم کو عفت و عصمت کی پاکیزہ تعلیم سے

بجھایا، بد اخلاقی و بد تہذیبی کے بدترین سیلاب پر اپنے انمول اخلاقی اسباق سے روک لگائی۔

اسی کے پیش نظر زیر نظر رسالے میں عورت کا اصل مقام و مرتبہ، اس کی عزت و عظمت اور اس کی اصل صفات و خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے؛ تاکہ وہ تہذیب جدید کی لعنت کا طوق اپنے گلے سے اتار کر اسلام کی تعلیم و تلقین اور نصیحت و ہدایت کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرے۔

امید ہے کہ خاتون اسلام، اسلام کی ان تعلیمات کی قدر پہچانتے ہوئے، اپنے آپ کو ان سے آراستہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

۷/ جمادی الاول ۱۴۱۹ھ

یکم/ ستمبر ۱۹۹۸ء

احاطہ جامعہ مسیح العلوم، منگلور

فصل اول

اسلام میں عورت کا مقام

اسلام میں عورت کو بلند ترین مقام عطا فرمایا گیا ہے اور دیگر معاشروں کی بہ نسبت اسلامی معاشرے میں اس کو زیادہ تحفظ دیا گیا ہے۔ عام طور پر عورتوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اسلام میں عورت کا کوئی مقام نہیں، اس کی عزت و عظمت نہیں اور اس کی جان و مال کو تحفظ نہیں، حالاں کہ واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ ہم اس فصل میں اختصار کے ساتھ اسلام میں عورت کا مقام بتائیں گے۔

عورت بہترین دولت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الْ دُنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ

الصَّالِحَةُ» (۱)

(یہ پوری دنیا ایک سامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان ”صالح

عورت“ ہے۔)

(۱) المشكاة: ۲۶۷، النسائی: ۱۷/۲

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«حُبِّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا النَّسَاءِ وَالطُّيْبِ وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِي

فِي الصَّلَاةِ ①

(دنیا کی چیزوں میں سے مجھے عورتیں اور خوش بو محبوب ہے اور میری

آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔)

یہ ارشاد مبارک اللہ کے رسول ﷺ کی نظر میں عورتوں کی عزت و

عظمت اور آپ کے قلب میں ان کی محبت و شفقت پر صاف طور پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ یہ حدیث دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے دو اوصاف و کمالات کی طرف اشارہ ہے:

ایک یہ کہ آپ انتہائی درجے کی عبدیت کے حامل ہیں، اس کا ظہور نماز کے

ذریعے ہوا۔

دوسرے یہ کہ آپ غایت درجہ شفقت کے حامل ہیں، اسی شفقت کی ایک فرع

یہ ہے کہ آپ کے دل میں عورت کی محبت ڈالی گئی؛ کیوں کہ عورت ضعیف و نازک

مخلوق ہے، جس سے شفقت لازم تھی۔

(١) النسائي، ٩٣/٢، مسند أحمد: ١٢٨/٣

برخلاف اسلام عورت کو مردوں کے ہم پلہ قرار دے کر اس کے حقوق کو تحفظ بخشتا ہے۔

عورتوں کے حق میں خیر کی وصیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا.»

(عورتوں کے بارے میں مجھ سے خیر کی وصیت قبول کرو۔) (۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ عورتوں کے بارے میں خیر و بھلائی کی وصیت فرما رہے ہیں اور امت کو حکم فرما رہے ہیں کہ میری یہ وصیت قبول کرو اور عورتوں سے بھلائی کرو۔ کیا اب بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کا کوئی مقام نہیں، ان کا کوئی حق نہیں؟

عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق کی تلقین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں، جن

کے اخلاق سب سے عمدہ ہوں اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں، جو اپنی

عورتوں کے ساتھ اچھے ہوں۔“ (۲)

دیکھیے اس ارشادِ مبارک میں ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں کو سب سے بہتر قرار دیا ہے، جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔ اس طرح اس میں مردوں کو تعلیم و تلقین ہو گئی کہ عورتوں کے ساتھ عمدہ اخلاق

(١) البخاري: ٣١٥٣، مسلم: ١٢٦٨، المشكاة: ٢٨٠، ابن ماجه: ١٣

(٢) رياض الصالحين: ٢٢٠

سے پیش آنا چاہیے۔ کیا اس سے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی رعایت و حفاظت کا علم نہیں ہوتا؟

غرض اسلام نے عورتوں کے درجے کو بلندی و عظمت کی انتہائی منزل تک پہنچایا ہے اور اس کے حقوق کو پورا پورا تحفظ عطا فرمایا ہے۔ یہ چند امور نمونے کے طور پر عرض کیے گئے ہیں؛ ورنہ اس موضوع پر مواد جمع کیا جائے، تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے۔

فصل ثانی

عورت کتنی اچھی، کتنی بری؟

عورت اگر اچھی ہو جائے، تو اس سے دنیا میں اچھائیاں اور خوبیاں پھیلتی ہیں اور اگر وہ خراب ہو جائے، تو فساد کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ اگر عورت اچھی ہو، تو کوئی چیز اس سے اچھی نہیں اور اگر وہ بری ہو، تو اس سے بری بھی کوئی چیز نہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم اور حضرت آسیہ کو مؤمنین کے سامنے مثال میں پیش فرمایا ہے اور ان کی تعریف فرمائی ہے۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ عَلَیْہَا السَّلَام کی والدہ اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی۔ فرعون کی خباثت و شرارت، تو سب کو معلوم ہے؛ مگر دیکھیے اس کی بیوی جب نیکی پر آئی، تو اس درجے تک پہنچ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی مقدس اور ہمیشہ رہنے والی کتاب میں بہ طور خاص اس کا ذکر فرمایا اور اس کی تعریف کی۔

ان کے برخلاف دو اور عورتوں کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہے: ایک حضرت لوط عَلَیْہَا السَّلَام کی بیوی کا، دوسری حضرت نوح عَلَیْہَا السَّلَام کی بیوی کا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اور برائی کی ہے اور ان کا جہنمی ہونا بیان کیا ہے۔

(التَّحْوِیْلُ: ۱۰-۱۱)

غور فرمائیے ایک طرف فرعون جیسے سرکش اور مردود کی بیوی آسیہ ہیں، جنہوں نے اچھے اوصاف و اخلاق اختیار کیے اور نیکی کی راہ کا انتخاب کیا، تو قرآن مجید میں ان کی تعریف بیان کی گئی اور دوسری طرف حضرت لوط و حضرت نوح علیہما السلام جیسی مقدس ذوات کی گھر والیاں ہیں، جن کی مذمت و برائی ہمیشہ کے لیے قرآن میں ثبت کر دی گئی ہے، حالاں کہ حضرت لوط و نوح علیہما السلام وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں کہ دنیا کا کوئی انسان بھی ان کے نقش قدم پر چلتا، تو فلاح پا جاتا؛ مگر ان کی بیویاں ان کے نقش قدم پر نہ چلیں، تو عذاب میں گرفتار ہوئیں۔

جب عورت نیکی پر آتی ہے، عمدہ اخلاق سے اپنے کو آراستہ کرتی ہے اور صلاح و تقویٰ کی زندگی گزارتی ہے، تو نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک پر۔ جس سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔ عورت کے حق میں یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں:

» وَلَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَيْءٌ أَفْضَلُ مِنَ الْمَرْأَةِ

الصَّالِحَةُ (١)

(دنیا کی چیزوں میں ”نیک عورت“ سے افضل و بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔)
اور جب عورت نیکی کا راستہ چھوڑ کر اخلاقِ رذیلہ سے اپنے آپ کو ملوث کرتی
اور شر و فساد کی زندگی گذارتی ہے، تو اسی ترجمانِ حق زبان سے عورت کے حق میں یہ
الفاظ صادر ہوتے ہیں:

«وَاطْلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا نِسَاءً» (٢)

(میں نے دوزخ کو دیکھا، اس میں جانے والی اکثر عورتیں تھیں)

(۱) ابن ماجه: ۱۳۳

(۲) بخاری: ۷۸۲/۲، مسلم: ۳۵۲/۲، ترمذی: ۸۷۲/۲

چناں چہ فرمایا:

» مَا اسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَى اللَّهِ خَيْرًا لَهُ مِنْ زَوْجَةٍ

صَالِحَةٌ» (١)

(اللہ سے تقویٰ کے بعد نیک عورت سے زیادہ بہترین چیز سے

مؤمن نے استفادہ نہ کیا ہوگا۔)

تو دوسری طرف عورت کو سب سے زیادہ فتنہ کا سبب بھی بتایا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

«مَا أَدْعُ بَعْدِي فِتْنَةٌ أَضُرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ» (٢)

(میرے بعد میں نے مردوں کی حق میں کوئی فتنہ ”عورتوں“ سے

زیادہ نقصان دہ نہیں چھوڑا ہے۔)

وجہ کیا ہے؟ وہی کہ جب عورت ان اوصاف و اخلاق، خصوصیات و کمالات سے

آراستہ ہوتی ہے جو اس کے لیے ضروری ہیں، تو وہ دنیا کی سب سے بہترین چیز قرار

یاتی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں بلندی کی انتہائی منزلوں میں جگہ یاتی

ہے اور ایک مومن کے حق میں ”تقویٰ کی صفت“ کے بعد اگر کوئی چیز اعلیٰ و افضل اور

سب سے زیادہ خیر کا باعث ہو سکتی ہے تو وہ عورت ہی ہے؛ مگر یہی عورت جب سیدھی

راہ سے ہٹ کر برائی کے راستہ پر پڑ جاتی ہے اور ان کمالات و خصوصیات سے ہاتھ

(۱) ابن ماجه: ۱۳۳

(۲) بخاری: ۷۲۳/۴، مسلم: ۳۵۲/۴، ترمذی: ۱۰۶/۲، ابن ماجہ: ۲۸۸

فصل ثالث

مؤمن عورت کے اوصاف قرآن کے آئینہ میں

ایک مؤمن عورت میں وہ کیا اوصاف و کمالات ہونے چاہئیں جو اس کو اللہ اور رسول کی نظروں میں عزت و عظمت عطا کرتے ہیں اور وہ ان کی بنا پر اجر عظیم کی بشارت کی مستحق، اخروی سرخروئی اور سرفرازی کی حامل اور جنت اور اس کی نعمتوں کی وارث قرار پاتی ہے۔ قرآن مجید نے ان اوصاف و اخلاق کو بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ
وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ
وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ
وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً
وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (الْأَحْزَابُ: ٣٥)

(تحقیق کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد اور محنت جھیلنے والی عورتیں اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں اور خیرات کرنے

آیت کا شان نزول

حضرت ام سلمہ ؓ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمارا یعنی عورتوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا اور صرف مردوں کا ہی ذکر کیوں فرمایا؟ حضرت ام سلمہ ؓ کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔ (۱)

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا، جو ایک انصاری خاتون تھیں، انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ ہر بات مردوں ہی کے بارے میں آئی ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جاتا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے اوصاف و اخلاق بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے؛ اس لیے کہ یہ آیت جیسا کہ عرض کیا گیا عورتوں کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی، اس میں اگرچہ مردوں کا بھی ذکر ہے؛ مگر اصل

(۱) ابن کثیر: ۵۰۳/۳، روح المعانی: ۲۲/۲۲

(٢) روح المعاني: ٢٢/٢٢، قرطبي: ٥٨١/٢١

مقصود عورتوں کا تذکرہ ہے۔

مؤمن عورت کے قرآنی اوصاف

اس آیت میں جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ان پر غور کرنا چاہیے؛ کیوں کہ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ نہ مردوں سے ہے اور نہ عورتوں سے؛ بل کہ ان لوگوں سے ہے جو ان اوصاف و اخلاق کے حامل ہیں۔ یہ کل دس (۱۰) اوصاف و اخلاق ہیں جو یہاں بیان کیے گئے ہیں (۱) اسلام (۲) ایمان (۳) قنوت یعنی اطاعت (۴) صدق یعنی سچائی (۵) صبر (۶) خشوع (۷) صدقہ و خیرات (۸) روزہ (۹) شرم گاہ کی حفاظت (۱۰) ذکر اللہ۔

ان اوصاف کی مختصر تشریح و توضیح ذیل میں دی جاتی ہے؛ تاکہ ان اوصاف کی حقیقت و اصلیت معلوم ہو جائے۔

(۱) اسلام: اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ بندوں کی بھلائی و بہبودی کے لیے، جو احکامات و قوانین نازل فرمائے ہیں، ان کو قبول کر کے ان کی اطاعت و اتباع کی جائے؛ کیوں کہ اسلام کے اصل معنی ہیں ”اپنے کو کسی کے سپرد کر دینا اور بالکل اسی کے تابع فرمان ہو جانا“ اور ظاہر ہے کہ یہاں مراد اللہ کے سپرد ہو جانا اور اسی کے فرمان کے تابع ہو جانا ہے اور اللہ کا فرمان وہی ہے جو حضرت نبی کریم ﷺ نے لے کر آئے، لہذا اسلام کی حقیقت و روح یہی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور ہر بات میں اسی کے قانون کا یا بند بن جائے۔

اس تشریح کو سامنے رکھ کر خواتین حضرات کو غور کرنا چاہئے کہ کیا ہم میں یہ صفت پائی جا رہی ہے اور کیا ہم اسی طرح اللہ کے حوالے ہو گئے ہیں اور اس کے قانون پر ہر

موقعہ پر عمل کرتے ہیں؟

(۲) ایمان : ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ نبی و رسول کی خبر پر ان حقائق کو مان لینا اور دل سے قبول کر لینا، جو ہماری عقلوں اور شعور و ادراک سے معلوم نہ ہو سکیں اور جو ہمارے حواس سے دور ہوں، جیسے اللہ کا وجود، توحید باری تعالیٰ، جنت و دوزخ، رسول کی رسالت، نبی کی نبوت، وحی کا سلسلہ، قبر و حشر کے احوال وغیرہ، ان سب باتوں کو نبی و رسول کی خبر کی بنیاد پر دل سے مان لینا ایمان ہے، ان کے بارے میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ ذرا سا بھی ان میں شک کیا جائے؛ بل کہ اپنی نظر سے زیادہ نبی کی خبر پر اعتبار و اعتماد ہونا چاہیے۔

(۳) **قنوت**: ”قنوت“ کے اصلی معنی ”اطاعت“ کے ہیں۔ اس سے مراد مکمل اطاعت و فرماں برداری ہے، اس طرح کہ کسی بھی حکم میں ذرا برابر خلل نہ پڑے اور پوری یکسوئی اور دل کی مکمل آمادگی کے ساتھ اطاعت بجالائے۔ یہ کیفیت دراصل اوپر کی دو صفات ”اسلام و ایمان“ کے راسخ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) **صدق:** ”صدق“ سچائی کو کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم زبان کی سچائی کہ جو بات زبان سے نکالے وہ سچائی رکھتی ہو، حدیث میں ہے:

«إِنَّ الصَّدَقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ»

اور فرمایا:

«إِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى

النَّارُ» (١)

(سچائی نیکی کا راستہ بتاتی ہے اور نیکی جنت کا راستہ بتاتی ہے۔ بلاشبہ

(۱) بخاری: ۵۶۳۹، مسلم: ۴۷۱۹

جھوٹ فسق و فجور کا راستہ بتاتا ہے اور فسق و فجور جہنم کا راستہ بتاتا ہے۔

دوسری قسم عمل کی سچائی، وہ یہ کہ نیکی کے کاموں میں کاپلی و سستی سے پرہیز کرے، نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھ لے، روزوں کے دن آئیں، تو روزہ رکھے، اسی طرح اور عبادات اور نیکیوں کے وقت ان عبادات اور نیکیوں کو ادا کرے۔ یہ عمل کی سچائی ہے؛ کیوں کہ بندہ مؤمن ایمان لا کر اللہ سے وعدہ کر چکا ہے کہ میں عبادت و اطاعت کروں گا، تو جب اس وعدہ پر عمل ہوگا، تو عملی سچائی ظاہر ہوگی ورنہ وہ عمل کا سچا نہ ہوگا۔ تیسری قسم دل کی سچائی، وہ یہ ہے کہ ایمان میں پختگی ہو، نفاق نہ ہو۔ یہاں صادقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان تینوں سچائیوں کے حامل ہوں۔

(۵) **صبر** : لغت میں ”صبر“ کے معنی جس کے ہیں، یعنی روکنا، اس سے مراد اپنے نفس کو روکے رکھنا اور کنٹرول میں رکھنا ہے۔ صبر بھی تین قسم کا ہوتا ہے:

(۱) ایک یہ ہے کہ نفس کو اطاعت و عبادت پر لگائے رکھے۔

(۲) دوسرے یہ ہے کہ نفس کو گناہوں سے باز رکھے۔

(۳) تیسرے یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو مصائب و پریشانیاں پیش آتی ہیں، ان پر بھی نفس کو سنبھالے رکھے کہ وہ اللہ کی کوئی شکایت نہ کر پائے۔

پہلی قسم کو ”صبر علی الطاعة“، دوسری کو ”صبر عن المعصية“، اور تیسری قسم کو ”صبر علی المصيبة“ کہتے ہیں۔ ان تینوں میں مشترکہ بات یہ ہے کہ نفس کو کنٹرول میں رکھنا پڑتا ہے، تب ہی وہ نیکی پر قائم ہوتا اور گناہوں سے بچتا اور مصیبت پر بے قابو ہونے سے رکتا ہے۔

خواتین حضرات اس پر خصوصیت سے توجہ فرمائیں کہ کیا اس قسم کے صبر کا مادہ ان میں پیدا ہو گیا ہے؟ اگر نہیں تو کوشش کریں۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں داڑھی سے کھیلتا ہوا دیکھا، تو فرمایا کہ اس کے دل میں اگر خشوع ہوتا، تو اس کے اعضا میں بھی خشوع ہوتا۔ (۱)

(۳) ایک شخص نماز میں داڑھی سے کھیل رہا تھا، حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ نے دیکھا، تو فرمایا کہ اس کے دل میں اگر خشوع ہوتا، تو اس کے اعضا میں بھی خشوع ہوتا۔ (۳)

اور یہاں صرف نماز میں خشوع مراد نہیں ہے؛ بل کہ ہمہ وقت اللہ کی طرف توجہ اور دل کا جھکاؤ مراد ہے۔

(۷) **صدقہ و خیرات :** اس سے مراد سخاوت کا مادہ اور جذبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنا مال لٹا دیا جائے، خواہ زکاۃ کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح مساکین و فقرا پر خرچ کیا جائے۔ صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس پر اللہ کی طرف

(۱) نوادر الاصول: ۳/۲۱۰

(٢) تعظيم قد الصلاة: ١٩٢/١

(۴) ایضاً

(۴) سنن بیہقی: ۲/۲۸۵

سے دیا جانے والا ثواب، قرآن وحدیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ بار بار بیان کیا گیا ہے؛ اس لیے مسلم عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر سخاوت کا جذبہ پیدا کرے اور بخل و کنجوسی سے بچے۔

(۸) **صوم:** یعنی روزہ، ”صوم“ روزہ کو کہتے ہیں جس میں محض اللہ کے واسطے انسان اپنی خواہشات اور لذات کو چھوڑ دیتا ہے جب اللہ کے لیے اللہ کے حکم پر جائز خواہشات اور لذات کو بھی چھوڑ دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ حرام و ناجائز کاموں اور حرام لذتوں اور خواہشوں میں، تو ہرگز کبھی بھی نہ پھنسے گا، یہی جذبہ اس صفت سے مقصود ہے۔

(۹) **عفت و عصمت:** ایک اہم صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شرم گاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس سے مراد عفت و عصمت ہے اور یہ صفت عورتوں کی تمام صفات میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے؛ بل کہ یوں کہنا سجا ہوگا کہ عورت نام ہی ہے سراپا عفت و عصمت کا، جس میں عفت و عصمت کا عنصر نہ ہو، وہ عورت کی تعریف سے خارج ہے۔

(۱۰) **ذکر اللہ** : آخری وصف ”ذکر اللہ“ بتایا گیا ہے، یعنی اللہ کی یاد۔ اس میں زبانی ذکر بھی داخل ہے اور قلبی ذکر بھی داخل ہے اور عملی ذکر بھی داخل ہے۔ زبانی ذکر یہ ہے کہ زبان سے اللہ کو یاد کرے مثلاً تلاوت کلام اللہ کرنا، کلمہ طیبہ پڑھنا، یا اور کوئی تسبیح و ذکر کرنا۔ اور قلبی ذکر یہ ہے کہ دل اللہ کی طرف متوجہ ہو اور ہر کام کے موقع پر خدا کے حکم کو سوچ کر اس کے مطابق کام کیا جائے۔ اور عملی ذکر جیسے نماز، حج وغیرہ عبادات کا ادا کرنا ہے۔ یہ ہیں وہ صفات، جو ایک مؤمن عورت کے اندر ہونی چاہئیں۔ اور مرد بھی مستحق انعام اسی وقت ہوگا، جب کہ وہ ان صفات کا حامل ہو۔ آیت کریمہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

البتہ آیت کا نزول خصوصیت کے ساتھ چوں کہ عورتوں کے لیے ہوا ہے؛ اس لیے یہاں خواتین کو خصوصیت کے ساتھ ان صفات کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

سُورَةُ التَّحْوِيْمِ (آیۃ: ۵) میں بھی اچھی عورت کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں: مسلمات ، مؤمنات ، قانتات ، تائبات ، عابدات ، سائحات ، یعنی اسلام ، ایمان ، قنوت ، توبہ ، عبادت اور سیاحت۔ پہلی تین کا ذکر اوپر آچکا ہے، آخری تین کی شرح یہ ہے:

توبہ: یعنی اپنے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہونا اور معافی مانگنا، اپنی تقصیر کا اعتراف اللہ کو بہت پسند ہے اور تقصیر کر کے بھی اعتراف نہ کرنا اور معافی کی جگہ ضد و بہٹ سے کام لینا مسلمان کی شان سے بعید ہے۔

عبادت: اس کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے سامنے عاجزی و انکساری بھی بندہ مؤمن کا خاص وصف ہے۔ (اسلام میں بعض عبادات کی شکلیں مقرر ہیں؛ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ اور بعض عبادات کی شکلیں مقرر نہیں ہیں، ان کو حسب حال کیا جاسکتا ہے، جیسے ذکر و تلاوت وغیرہ، بہر حال یہ بھی مؤمن کی ایک خاص شان ہے۔)

سیاحت : اس کی ایک تفسیر روزے سے کی گئی ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن، ابن جبیر سے مروی ہے۔ اس صورت میں ”سائحات“ کے معنی وہی ہوں گے جو پچھلی آیت میں ”صائمات“ کے معنی ہیں۔

اور دوسری تفسیر ہجرت سے کی گئی ہے اور ہجرت کے معنی ہیں، اللہ و رسول کی خاطر اور اپنے دین کی حفاظت کی خاطر اپنے وطن اور گھر بار اور رشتے داروں کو چھوڑ کر

کسی دوسری جگہ چلا جانا، تو یہ صفت دراصل خدا کی محبت میں اور رسول کے عشق میں ہر چیز کو قربان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اوصاف ایک مؤمن و مسلمان عورت میں ہونے چاہئیں۔ جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں سنورتے ہیں اور وہ دونوں جہاں میں کام یاب ہوتی ہے۔

فصل رابع

مؤمن عورت کے اوصاف احادیث کی روشنی میں

قرآن کے بعد احادیث نبویہ کی طرف آئیے، ان میں دیکھیں کہ عورت کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن اوصاف و خصوصیات کو لازم قرار دیا ہے، یا مستحسن گردانا ہے۔

دین داری، عورت کا کمال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا:

« تَنْكِحُ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ لِمَا لَهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا
وَلِدِينِهَا فَاطْفَرُ بِذَاتِ الدِّينِ » (١)

(عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ مال کی وجہ سے، حسب و نسب کی وجہ سے، جمال و حسن کی وجہ سے اور دین داری کی وجہ سے، پس تو دین دار کو پسند کر کے کام یاب ہو جا۔)

اس حدیث سے یہ سبق دیا گیا ہے کہ نکاح کے لیے ایسی عورت کو پسند کیا جائے جو دین دار ہو۔ وہیں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے کہ عورت کا کمال

(۱) بخاری: ۷۲/۲، مسلم: ۴۳/۱، ترمذی: ۲۰۷/۱، نسائی: ۷۱/۲، ابوداؤد: ۴۸۰/۱، ابن ماجه: ۱۳۳، احمد: ۴۲۸/۲

اور اس کی خوبیوں کا معیار نہ مال و دولت ہے، نہ حسن و جمال اور نہ خاندانی عزت و عظمت؛ بل کہ اس کا کمال ”دین داری“ ہے۔ جس عورت میں یہ کمال ہو وہ واقعی صاحب کمال ہے اور جس کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ چاہے کتنی حسین کیوں نہ ہو اور حسب و نسب اور خاندانی شرافت میں کتنی ہی آگے کیوں نہ ہو اللہ اور اس کے رسول کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں؛ اس لیے تاکید کی گئی ہے کہ دین دار عورت سے نکاح کرو، اس میں کام یابی ہے۔

عفت و پاک بازی

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَأُحْصِنَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ»

(عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھتی رہے اور رمضان کے روزے رکھ لیا کرے اور اپنی آبرو کی حفاظت رکھے اور اپنے خاوند کی تابع داری کرے، تو ایسی عورت جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔) (۱)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری عورتوں میں سب سے اچھی وہ عورت ہے، جو اپنی آبرو کے بارے میں پارسا ہو۔ (۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت کے اندر اپنی آبرو کی حفاظت اور عفت و

(۱) مشکاة: ۲۸۱

(۲) کنز العمال: ۴۵۱۵۷

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ وہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے پوچھا کہ عورت کے حق میں سب سے بہتر چیز کیا ہے؟ صحابہؓ سب خاموش رہے، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ جب میں گھر واپس آیا، تو حضرت فاطمہؓ سے سوال کیا کہ عورت کے حق میں سب سے بہتر بات کیا ہے؟ تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھے اور نہ مرد اس کو دیکھے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ جواب میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کیا، تو آپ نے فرمایا ہاں! فاطمہ تو میرا جز ہے۔ (۱)

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ (الْأَحْزَابُ: ۳۳)
(اپنے گھروں میں ٹکی رہو)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو بلا ضرورت گھر کے باہر نہ جانا چاہیے؛ بل کہ اپنے گھر میں ٹکی رہنا چاہئے اور اگر بہ ضرورت باہر جانا ہو، تو حکم ہے کہ اپنے آپ کو پردہ میں ڈھانپ کر باہر جائے۔

1 ♦ ♦

چناں چہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِئِهِنَّ﴾ (الْأَحْزَابُ: ۵۹)

(اے پیغمبر! اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحب زادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر ڈال لیا کریں اپنی چادروں میں سے)

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ عورت اپنے اوپر چادر ڈال لیا کریں، یہی برقعہ کہلاتا ہے۔ غرض بلا ضرورت، تو گھر کے باہر ہی نہ جانا چاہیے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے، تو اپنے آپ کو پوری طرح برقعہ سے ڈھانپ کر جانا چاہئے؛ نیز احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پردہ کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

«إِنَّ الْمَرْأَةَ تُقْبَلُ فِي صُورَةِ شَيْطَانٍ وَتُذَبِّرُ فِي شَيْطَانٍ» (۱)

عورت (جب باہر نکلتی ہے تو) شیطان کی صورت میں سامنے آتی

ہے اور شیطان کی صورت میں واپس جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت کے باہر جانے آنے سے اس کو دیکھنے والے مردوں کے دلوں میں وسوسہ اور برائی آتی ہے، جیسا کہ شیطان وسوسہ و برائی کا باعث بنتا ہے؛ لہذا عورت کو بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلنا چاہیے۔ (۲)

دوسری حدیث میں فرمایا:

(۱) مسلم: ۴۴۹/۱

(۲) شرح مسلم للنووی: ۴۴۹/۱

ہاں! اگر ضرورت پر نکلے، تو اجازت ہے؛ مگر پردہ کے ساتھ نکلنا چاہئے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

کیا کہ بعض عورتوں کے پاس چادر نہیں ہوتی، وہ کیا کریں؟ فرمایا کہ اس کی دوسری بہنیں اپنی چادر میں اس کو چھپالیں، (۲)

معلوم ہوا کہ عورت برقعہ یا چادر اوڑھ کر بہ ضرورت باہر جاسکتی ہے بغیر برقعہ و چادر کے نہیں جاسکتی۔ اور چادر اوڑھنے کا حکم جیسا کہ اوپر گذرا خود قرآن نے بہ صراحت دیا ہے۔

کیا عورت کے لیے چہرہ کا پردہ ہے؟

عورت کے حجاب میں چہرہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اس میں بعض جدت پسند لوگوں نے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے چہرہ کو حجاب سے خارج قرار دینے کی ایک فضول کوشش شروع کر رکھی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ جدت پسندوں کا طبقہ ہر کام میں غیروں کی تقلید کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے؛ اسی لیے ان کے طور طریقوں کو اپنانا چاہتا ہے اور پھر ان میں سے جو لوگ کچھ دین داری کی طرف آ جاتے ہیں، وہ اپنی دین داری کو بھی اسی معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو علما کا بتایا ہوا دین پسند نہیں آتا؛ بل کہ وہ دین میں بھی وہی جدت

(۱) ترمذی: ۱/۱۲۰، مشکاة: ۲۶۹

(۲) مسلم: ۱/۲۹۱، ابوداؤد: ۱/۱۶۱، ابن ماجه: ۹۲، ترمذی: ۱/۱۲۰

چاہتے ہیں، جس میں پوری نہیں، تو ذرا سی بے حیائی کی گنجائش ہو، بالکل نہیں، تو کم از کم تھوڑا سا حرام جائز ہو۔

چنانچہ آج کل مغربی ذہن رکھنے والے بعض لوگ مغرب کی ہر بات کو اچھی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے لیے قرآن و حدیث کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، تاکہ مغربی طرز معاشرت پر چلنے کے لیے قرآن و حدیث سے دلیل فراہم ہو جائے، اسی طرح یہ لوگ اولاً اپنے ذہن میں مغربی بے حیائی و عریانی کو جگہ دے لیتے ہیں، پھر قرآن و حدیث میں اپنے اس ذہنی و مزمومہ جواز کو تلاش کرنے لگتے ہیں اور موقع بے موقع آیات و احادیث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح تو قرآن و حدیث سے ہر غلط سے غلط بات بھی کوئی غیر معقول آدمی ثابت کر سکتا ہے اور تاریخ میں ایسے افراد اور جماعتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں، جنہوں نے اپنے زمانے کے حالات اور فلسفوں سے مرعوب و متاثر ہو کر قرآن و حدیث کی تفہیم و تشریح کو ان کے تابع بنا دیا اور بہت سی بے تکی باتیں قرآن و حدیث سے ثابت کرنے لگے تھے خوارج، معتزلہ، جبریہ وغیرہ باطل فرقوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے اور اس طرح کے استدلال کا ایک انبار آپ کے سامنے آ جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے اولاً جزئیات سے بحث کرنا اصولاً غلط ہے؛ بل کہ صحیح اصول یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے مقاصد اور شریعت کے منشا کو پیش نظر رکھنا چاہئے، پھر تمام جزئیات کو اس منشا و مقصد پر منطبق کرتے چلے جانا چاہئے، اس نقطہ نظر سے جب ہم مصادر شریعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ قرآن و حدیث کا منشا یہ ہے کہ عورتیں غیر مردوں سے بالکل الگ تھلک رہیں اور ان سے ان کا کسی طرح نہ اختلاط ہو، اور نہ آ منسا منسا ہو۔

چنانچہ قرآن پاک کی یہ آیت پڑھئے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ (الْأَحْزَابُ: ٣٣)

(اے نبی کی عورتو! تم اپنی گھروں میں ٹکی رہو)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے اصل یہ ہے کہ بلا ضرورت گھر کے باہر ہی نہ نکلیں۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾

(اور جب تم ان سے (ازواجِ مطہراتِ رضی اللہ عنہن سے) کچھ

ضرورت کا سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے سوال کرو۔)

(الْأَخْرَاجُ: ٥٣)

اس میں مردوں سے کہا گیا ہے کہ جب تم عورتوں سے کچھ مانگو، تو پردہ کے پیچھے سے مانگو، غور کیجئے کہ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی ناکہ عورت مرد کے سامنے ہی نہ آئے اور مردوں کو ضرورت پڑے، تو وہ پردہ کی آڑ سے ہی ان کے ساتھ معاملہ کرنے کے روادار ہیں۔

نیز قرآن کریم کہتا ہے:

﴿وَلَا يَضُرُّنَّ بِأَرْجُلَهُنَّ لِيُعْلَمَ مَا يَخْفَيْنَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾

(النور: ۳۱)

(عورتیں پیر مار کر نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہوگی)

مفسرین میں سے متعدد حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عورتیں پیروں میں ایسا زیور نہ پہنیں، جو چلنے سے آواز پیدا کرتا ہو اور لوگ عورتوں کی طرف

منوجہ ہوں۔ (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو بختا زبور بھی پہن کر نہ چلنا چاہیے کہ اس سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ان نکات قرآنیہ؛ بل کہ احکامات الہیہ کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ عورت کا چہرہ کھلا رکھ کر گھومنا پھرنا کیا ان احکامات سے میل کھاتا ہے؟ یا ان سے ٹکراتا ہے؟ اگر عورت سے بہ ضرورت بات چیت بھی پردہ سے ہونا ہے اور زیور بختا ہوا پہننا ممنوع ہے؛ کیوں کہ اس سے لوگ عورت کی طرف متوجہ ہوں گے، تو کیا چہرہ کھلا ہوگا، تو لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہوگی؟

اس نقطہ نظر سے جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

يُذْنِبِينَ عَلَيْهِنَ مِنْ جَلَابِئِهِنَّ ﴿الْأَخْرَابُ: ٥٩﴾

(اے نبی! آپ اپنی عورتوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے

فرمادیں کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں کھینچ لیں)

تو معاً یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ اپنے سروں، چہروں اور اپنی پوری شخصیت کو ڈھانپ لیں اور اس سے یہ مفہوم نکالنا کہ ”چہرہ چھوڑ کر اپنے اوپر چادر ڈال لیں“ ہو سکتا ہے کہ کسی مغربی تہذیب کے دل دادہ کے ذہن کے خراش و تراش کا نتیجہ ہو تو ہو؛ لیکن قرآن و سنت کے مجموعی فکر اور اسلامی مقاصد و منشا کو سامنے رکھنے والے کے ذہن میں کبھی یہ مفہوم ذہن میں نہیں آ سکتا۔

چنانچہ حضرات صحابیات نے اس آیت کو سنا، تو چہرہ کا بھی پردہ ضروری سمجھا۔
حضرت عبیدہ السلمانی رحمۃ اللہ نے خود اپنے شاگردوں کو بتایا کہ اس طرح چادر ڈالی

(۱) دیکھو طبری: ۱۰/۹

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتیں چہرہ اور سر چھپالیں۔ (۲)

اس آیت کا یہی مطلب متعدد مفسرین نے صراحت سے بیان کیا ہے۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ صحابیات کا کیا معمول تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ جس میں آپ پر منافقین نے تہمت لگائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک طرف کو اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، ادھر سے حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے مجھے پیچن لیا؛ کیوں کہ وہ حجاب کے نزول سے پہلے مجھے دیکھ چکے تھے، پس میں نے ان کو دیکھا تو:

« فَخَمَرْتُ وَجْهِي بِجِلْبَابِي. » (۳)

(میں نے اپنا چہرہ اپنے جلاباب یعنی چادر سے ڈھانک لیا۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث پر فوائد بیان کرتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کو اپنا چہرہ نیک و بد ہر ایک سے چھپانا ہے۔ (۴)

نیز ابوداؤد و نسائی نے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے پردہ کے پیچھے سے ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا چاہا، تو آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور فرمایا کہ

(۱) طبری: ۲۲/۴۶، ابن کثیر: ۳/۵۳۵

(۲) طبری: ۳۳۲

(۳) بخاری: ۵۹۴/۲

(۴) شرح مسلم: ۴/۳۶۰

معلوم نہیں کہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اور اس عورت نے عرض کیا کہ عورت کا، تو فرمایا کہ اپنے ناخنوں کو مہندی سے رنگ لو۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چہرہ کھول کر نہیں آیا کرتی تھیں؛ بل کہ وہ پردہ کے آڑ سے گفتگو کرتی تھیں۔

نیز حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام پہننے والی عورت کو نقاب پہننے سے منع فرمایا۔ (۲)

اور ”لا تنقب“ (نقاب نہ پہنیں) کا مطلب علمائے حدیث نے یہ بتایا ہے کہ

”لا تستسر وجہها“ کہ اپنا چہرہ نہ ڈھانپیں۔ (۳)

اب غور کرنا چاہیے کہ جب اللہ کے نبی صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے احرام کی حالت میں عورت کو چہرہ ڈھانپنے سے منع فرمایا، تو اس سے مطلب یہی ہوگا اور ہونا چاہئے کہ عام حالات میں عورت کو چہرہ ڈھانپنا ہے، تبھی تو احرام کی حالت میں اس سے منع فرمایا اور اس منع سے بھی یہ مراد ہے کہ کپڑا چہرہ پر ڈال لیا جائے اور اگر چہرہ پر کپڑا لگائے بغیر چہرہ کو حالت احرام میں بھی چھپایا جائے، تو یہ منع نہیں ہے؛ بل کہ صحابیات کا عمل یہی تھا کہ وہ اس حالت میں بھی غیر مردوں سے اپنا چہرہ چھپاتی تھیں۔

چناناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ مُحْرِمُونَ، فَإِذَا مَرَّ بِنَا الرَّاكِبُ سُدَّلْنَا الثُّوبَ عَلَى وَجْهِنَا وَإِذَا جَاوَزْنَا

(۱) ابو داؤد: ۴۱۶۶، نسائی: ۵۰۸۹

(۲) بخاری: ۱۷۴۱، ابوداود: ۱۸۲۷، ابن خزیمہ: ۲۵۹۰، ترمذی: ۸۳۳، نسائی: ۲۶۷۳ وغیرہ

(٣) فتح الباری: ٥٢/٢، تحفة الاحوذی: ٢٨٢/٣، عون المعبود: ١٩٠/٥

کَشْفَنَاهُ « (۱)

(ہم اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے ساتھ حالت احرام میں ہوتے تھے پس جب کوئی سوار ہماری طرف سے گزرتا، تو ہم اپنے چہرہ پر کپڑا کھینچ لیتے اور جب وہ آگے بڑھ جاتا، تو ہم چہرہ کھول لیتے تھے) اور یہی بات بھی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ (۲)

معلوم ہوا کہ عام حالات میں تو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی ہی اور احرام کی حالت میں بھی اس طرح وہ اپنا چہرہ چھپائے گی کہ کپڑا چہرہ سے نہ لگے، تاہم احرام کی حالت میں چہرہ چھپانا علما میں مختلف فیہ ہے، جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اکثر یہی فرماتے ہیں کہ چہرہ پر کپڑا ڈالنا تو منع ہے؛ لیکن غیر مردوں سے اس طرح چہرہ چھپانا چاہئے کہ چہرے کو کپڑا نہ لگے۔ ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ ہے۔

اب رہا یہ استدلال کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں؛ لہذا یہ اس لیے حکم ہے کہ عورت کا چہرہ کھلا ہوتا ہے؛ اس لیے مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کو نہ دیکھیں، ورنہ ان کو کیوں اس کا مکلف کیا جاتا؟ یہ استدلال اگرچہ بعض بڑے حضرات جیسے قاضی عیاض وغیرہ سے منقول ہے تاہم یہ انتہائی مخدوش ہے کیوں کہ:

اولاً یہ کیا ضروری ہے کہ اس سے صرف مسلمان عورتوں سے نظریں بچانے کا

(۱) ابن خزیمہ: ۲۰۴/۳، ابو داؤد: ۱۸۳۳، بیہقی فی السنن: ۵/۲۸، ابن ابی شیبہ:

۲۸۴/۳

(۲) معجم کبیر طبرانی: ۲۸/۲۳، مجمع الزوائد: ۲۴۰/۳

”اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس اور اس حصہ کے سوا کچھ اس میں سے نظر آئے، اور آپ نے ہاتھ کی ہتھیلیوں اور چہروں کی طرف اشارہ کیا۔ (۱)

اولاً تو یہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، ایک تو اس لیے کہ اس کے راویوں میں سعید بن بشیر ایک راوی ضعیف ہے، دوسرے امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو خالد بن دریک نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور خالد کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات نہیں ہے، لہذا روایت منقطع ہے۔ (۲)

دوسرے اس حدیث میں عورت کے حجاب کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ اس کے ستر کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کو تنہائی میں بھی اور گھر میں بھی جس طرح کے کپڑے پہننا ہے وہ یہ ہے، اس حدیث میں حجاب کا مسئلہ نہیں بیان کیا گیا ہے، کہ عورت باہر

(٢) عون المعبود: ١١/١٠٩، والدراية: ١/٢٣، التلخيص الحبير: ٣/٢٣

جانے اور غیر مردوں کے سامنے ظاہر ہونے کی صورت میں چہرہ اور کھلا رکھ سکتی ہے۔ اور معلوم ہونا چاہئے کہ ستر اور حجاب میں فرق ہے، ستر تو مرد و عورت دونوں کے لیے ہے؛ حتیٰ کہ مثلاً نماز تنہائی میں بھی پڑھتے ہوئے ستر کو چھپانا ضروری ہے، مرد کے لیے بھی عورت کے لیے بھی، البتہ مرد کے لیے ستر کے حدود الگ ہیں اور عورت کے ستر کے حدود الگ ہیں۔ مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنے تک ستر ہے اور عورت کے لیے سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے پورا جسم ستر ہے۔ اور بعض نے قدموں (پیروں کو بھی) ستر سے خارج مانا ہے۔ جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔ تو مذکورہ حدیث میں اسی ستر کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کا حجاب والے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور حجاب صرف عورت کے لیے ہوتا ہے ہاں! حجاب میں چہرہ داخل ہے یا نہیں اس پر تین ائمہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ہاں داخل ہے اور ہر حال میں اس کو چھپانا غیر مردوں سے ضروری ہے، چاہے فتنہ کا خوف ہو یا نہ ہو اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ چہرہ کا چھپانا اس صورت میں ضروری ہے کہ جب کہ فتنہ کا خوف ہو، ورنہ ضروری نہیں۔ (۱)

مگر کون نہیں جانتا کہ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا قول اپنے زمانہ کے لحاظ سے ہے جو خیر القرون تھا، شر کے بہ جائے خیر کو غلبہ تھا، اور آج شر کو غلبہ ہے اور شہوتوں کی بھٹی بھڑکا دی گئی ہے، اس صورت حال میں چاروں ائمہ کے نزدیک ایک ہی مسئلہ ہو گیا کہ عورت کو چہرہ چھپانا ضروری ہے۔

لہذا ان دلائل کی روشنی میں بالتفصیل یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں عورت کو چہرہ بھی چھپانا لازم و ضروری ہے۔

گھریلو کام کی عادت

عورت کے لیے گھریلو کام کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے اور بلا لحاظ مذہب و ملت، ہر قوم اور مذہب کے لوگوں میں اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو اس کی مشق و عادت ڈالی جاتی ہے؛ مگر یورپ و مغرب کے حیا سوز کلچر نے جہاں اور بہت سارے حقائق بدل دیئے ہیں، اس حقیقت کے اوپر بھی پردہ ڈال دیا ہے اور اب لڑکیاں گھریلو کام اہم واقفہ سمجھنے کے بہ جائے غیر اہم؛ بل کہ اپنی شان سے گرا ہوا خیال کرنے لگی ہیں اور گھریلو کام کے بہ جائے دفتری و بازاری کام کو ترجیح دینے لگی ہیں اور انتہائی بے حیائی و بے غیرتی پر اتر آئی ہیں۔

اسلام نے عورت کے لیے گھریلو کام کی اہمیت و فضیلت بیان کی ہے۔ حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عورت کا اپنے گھر میں گریہ و گناہ کا کام کرنا اس کو جہاد کے رتبے کو پہنچاتا ہے۔ (۱)

اللہ اکبر! کیا فضیلت و اہمیت ہے، اللہ کے نبی ﷺ کی نظر میں گھریلو کام کی، کہ اس کو جہاد کے برابر قرار دیا ہے۔ لہذا عورتوں کو چاہئے کہ وہ گھریلو کاموں کو فوقیت دیں اور اپنی بچیوں کو اس کی تربیت دیں؛ ورنہ جو عورتیں گھریلو کام کو ترک کر کے باہر کے کاموں کو ترجیح دیتی ہیں، وہ آخر کار شکمی ہو جاتی ہیں اور ان سے گھریلو زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مغربی مصنف و مفکر ٹول سلیمان نے لکھا ہے:

”آج عورتوں نے پارچہ بانی کی مشینوں اور چھاپہ خانوں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ حکومت نے ان سے اپنے کارخانوں میں کام

(١) كنز العمال: ٢٥١٣٨

تھیں؛ حتیٰ کہ چکی پیستی تھیں اور دیگر گھریلو کام کرتی تھیں، جس سے ان کے ہاتھ سخت ہو گئے تھے، کندھے پر پانی اٹھالاتی تھیں، جس سے ان کی گردن پر نشان پڑ گئے تھے۔ اور جب انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ فاطمہ! صبر کر اور بہترین عورت وہ ہے، جو اپنے گھر والوں کے کام آئے۔ (۱)

علم دین کی طلب و تربیت

علم دین کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد ہو؛ مگر عام طور پر عورتوں میں علم دین کی کمی اور علم دین کے طلب کی کمی پائی جاتی ہے۔ صحابیات و تابعات کو دیکھوان کے اندر علم دین کی طلب اور اس کے لیے ٹرپ کس قدر تھی؟

حدیث ہی میں ہے کہ صحابیات نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مرد (دین کے بارے میں) غالب آگئے یعنی دین کی باتیں سننے اور علم حاصل کرنے کے مواقع ان کو زیادہ ملتے ہیں؛ لہذا آپ ہمارے لیے ایک دن مقرر فرما دیجئے (اس میں آپ ہم کو دین کی باتیں سکھائیں) چنانچہ آپ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمالیا (ایک دن مقرر کر دیا۔) (۲)

اس حدیث سے حضرات صحابیات کا ذوق و شوق علم و دین کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر انصاری عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

”بہترین عورتیں، انصار کی عورتیں ہیں، کہ حیا و شرم نے ان کو دین

(۱) دیکھو فتح الباری: ۱۱/۱۱۹-۱۲۱

(۲) بخاری: ۲۰/۱

میں تفقہ اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے سے باز نہیں رکھا۔“ (۱)

دیکھئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انصاری صحابیات کی تعریف میں فرمایا کہ حیا و شرم کے باوجود دین کا علم حاصل کرتی تھیں؛ اس لیے وہ بہترین عورتیں ہیں۔ چنانچہ بہت سے مسائل کی تحقیق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں نے کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات دیئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تمام صحابیات میں سب سے زیادہ احادیث روایت فرمائی ہیں۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے۔ اور تمام صحابہ کرام میں کثرت روایت کے لحاظ سے ان کا چھٹا نمبر ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں سے جلیل القدر حضرات بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مشکل مسائل پوچھا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر فقہ اور طب (ڈاکٹری) اور شاعری کا جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ حضرت امام زہری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تمام صحابیات کا علم ایک جگہ رکھا جائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم سب پر بھاری ہو جائے گا۔ (۲)

مثال کے طور پر یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیا گیا، ورنہ تاریخ میں حضرات صحابیات و تابعات کی زندگیوں کا جو نقشہ دیا گیا ہے، وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ وہ سب کی سب علم دین کی طلب و جستجو میں لگی رہتی تھیں اور اس طلب اور جستجو نے ان کو

(۱) بخاری: ۲۴/۱

(۲) تہذیب التہذیب: ۵۳۵/۱۲

عبادت و تقویٰ

لہذا عورت کو چاہئے کہ عبادت و اطاعت اور تقویٰ اور پرہیزگاری کا شوق اپنے اندر پیدا کرے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ اس مرد پر رحم کرے جو رات میں اٹھ کر نماز (تہجد) پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی جگائے، اگر وہ نہ اٹھے، تو اس کے چہرہ پر پانی چھڑکے۔
اور اللہ اس عورت پر رحم کرے جو رات میں اٹھ کر نماز (تہجد) پڑھے اور اپنے شوہر کو بھی اٹھائے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرہ پر پانی چھڑکے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی

(۱) ابو داود: ۱/۱۸۵، ابن ماجه: ۹۴، نسائی: ۱/۲۳۹

عورت کے لیے تہجد کی ترغیب ہے، تو پھر فرض کی کتنی اہمیت ہوگی، اس کا اندازہ خود لگائیے۔

الغرض اپنے آپ کو عبادت و اطاعت کے لیے مستعد کرنا چاہیے۔

ذکر و تلاوت کی پابندی

عورت کے لیے ذکر و اذکار، تسبیح و تلاوت کی پابندی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے اس کے دنیوی و گھریلو مشاغل میں بھی نورانیت و روحانیت نیز سہولت و آسانی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت فاطمہ ؓ نے جب اپنے مشاغل اور گھریلو کام کی مشقت کا ذکر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ایک خادم عطا فرمانے کی درخواست کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسبیح و ذکر کی تلقین فرمائی تھی۔

چنانچہ روایات میں اس کی تفصیل اس طرح آتی ہے:

”حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ نے چاہا کہ چوں کہ گھریلو کاموں کی زیادتی اور سختی سے بہت پریشانی ہے، حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ چکی پیس پیس کر سخت ہو گئے اور حضرت علیؓ کنویں سے پانی بھرا کرتے ہیں، اس سے ان کے سینے میں درد کی شکایت پیدا ہو گئی۔ اور حضرت فاطمہؓ بھی پانی اٹھایا کرتیں، جس سے ان کی گردن میں نشان ہو گئے۔ اور دیگر گھریلو مصروفیات سے ان کے کپڑے بھی خراب

(۱) ابو داود: ۱/۱۸۵، ابن ماجه: ۹۴

و خستہ ہو جاتے۔ اور روٹیاں پکانے کی وجہ سے (دھوئیں نے) چہرہ کا رنگ بدل دیا؛ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک غلام یا خادم مانگ لیں۔ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچے، تو آپ وہاں موجود نہ تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کر کے واپس چلی آئیں اور جب رات ہو چکی اور یہ حضرات بستر پر چلے گئے، تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لائے۔ اور ان دونوں کے درمیان میں آپ بیٹھ گئے اور معلوم کیا کہ بیٹی! کیا بات تھی، جو تم آئی تھیں؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے عرض کرتے ہوئے شرم آئی، اس لیے کہہ دیا کہ سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی، پھر بعد میں بتایا کہ یہ پریشانی تھی، تو آپ نے یہ پریشانی و مشقت سن کر فرمایا کہ کیا میں تمہیں خادم سے بہتر چیز نہ بتاؤں؟

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ! تم جس چیز کا مطالبہ کر رہی ہو وہ تمہیں زیادہ پسند ہے یا وہ جو اس سے بہتر چیز ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چٹکی لی اور (آہستہ سے) کہا کہ تم یہ بولو کہ خادم سے بہتر جو چیز ہے وہ پسند ہے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم بستر پر جاؤ، تو چونتیس (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر، تینتیس (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس (۳۳) دفعہ الحمد للہ پڑھو، یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔ (۱)

اس میں گھریلو کام کی مشقت سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ذکر و تسبیح کی تعلیم دی ہے، اس کی وجہ بعض علما نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو اللہ کے ذکر پر پابندی کرتا ہے، اس کو اس سے زیادہ قوت ملتی ہے جتنی کہ خادم کے کام کرنے سے ملتی ہے؛ نیز اس کا کام کرنا آسان و سہل ہو جاتا ہے۔^(۱)

فصل خامس

عورت کے لیے ناپسندیدہ صفات و اعمال

عورت کے لیے جس طرح بعض اعمال و اوصاف پسندیدہ ہیں، اسی طرح بعض اعمال و اوصاف اس کے لیے ناپسندیدہ بھی ہیں، جن سے اس کو بچنا اور پرہیز کرنا چاہئے۔

جاہلی تبرج

قرآن پاک کے اندر عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

﴿وَلَا تَبْرَجْنَ تَبْرُجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ (الاحزاب - ۳۳)

(تم عورتیں قدیم جاہلی طریقہ پر (اپنی زینت) دکھاتی ہوئی نہ پھرا کرو)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عورتیں بے پردہ پھرتی اور اپنے بدن اور لباس کی زیبائش کا علانیہ مظاہرہ کرتی تھیں۔ اس بد اخلاقی و بے حیائی کی روش کو مقدس اسلام کب برداشت کر سکتا ہے؟ اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ گھروں میں ٹھہریں اور زمانہ جاہلیت کی طرح باہر نکل کر حسن و جمال کی نمائش کرتی نہ پھریں۔ (۱)

(۱) فوائد بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ: ۵۶۱

اس آیت اور اس کی تفسیر سے واضح ہوا کہ اسلام کی نظر میں عورت کا بے حیائی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنا اور باہر گھومنا پھرنا ناپسندیدہ عمل ہے۔ مگر افسوس کہ آج یہ جاہلی رسم و طریقہ ”فیشن“ کے نام سے پوری بے حیائیوں اور انتہائی درجہ کی بے شرمیوں کے ساتھ معاشرہ میں رواج پایا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کے اندر بھی اب یہ کوئی نئی و منکر بات نہ رہی، بے شمار خاندان ایسے ہیں جن میں اس بے حیائی و بے شرمی کو تہذیب و شائستگی کا قائم مقام سمجھ لیا گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط، آپس میں بے شرمی و بے حیائی کا مظاہرہ اور غیر محرم کے سامنے زیب و زینت کا اظہار ایک ”فیشن“ کی حیثیت اختیار کر لیا گیا ہے؛ مگر معلوم ہے کہ اس کے نتائج کیا ظاہر ہو رہے ہیں؟

خدا کی قسم اس کو بیان کرنے کی قوت و طاقت نہ زبان میں ہے اور نہ قلم میں ہے، لکھنے والوں نے ہمت کر کے اس پر بہت کچھ لکھا ہے نہ صرف مسلمانوں نے؛ بل کہ مغربی و یورپی اہل قلم نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ امریکہ کا ایک مصنف لکھتا ہے۔

”ہماری آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ آج کل جن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس قدر غیر فطری ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو دس پندرہ برس کی عمر ہی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہایت افسوس ناک ہوتا ہے۔ اس قسم کی قبل از وقت صنفی دلچسپیوں سے بہت برے نتائج رونما ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں۔ ان کا کم از کم نتیجہ یہ ہے کہ نو عمر لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں یا کم سنی میں شادیاں کر لیتی ہیں۔ اور اگر

محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، تو خودکشی کر لیتی ہیں۔ (۱)
اس افسوس ناک نتیجے کو مزید قوت پہنچانے کے بہ جائے اس کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے
کی کوشش کرنا چاہئے۔

عورت کی امارت

اسلام میں عورت کے حقوق اور حدود مرد کے حقوق و حدود کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ہاں کم نہیں ہیں۔ حقوق کا مختلف ہونا اور بات ہے اور حقوق کا کم ہونا بالکل دوسری بات؛ مگر اکثر لوگ اپنی نا سمجھی سے ان دونوں کو ایک خیال کرتے ہیں اور اسلام پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کو پورے حقوق نہیں دیتا، حال آں کہ یہ سراسر غلط ہے۔

اسلام نے عورت کے لیے کام کا ایک دائرہ مقرر کیا ہے اور مرد کے لیے دوسرا دائرہ، عورت گھر کی ملکہ ہے اور مرد گھر سے باہر کے امور پر دسترس رکھتا ہے۔ لہذا ان تمام کاموں کو جو عورت کے دائرہ سے خارج ہیں، اسلام ان کو عورت کے حق سے خارج قرار دیتا ہے۔ اسی میں سے عورت کی امارت اور ولایت کا مسئلہ بھی ہے۔

جمہور علما؛ بل کہ سبھی علما کا اس پر ہمیشہ سے اتفاق چلا آ رہا ہے کہ عورت کسی قومی و ملی کام کی متولی و والی و حاکم و سردار نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے امور کی والی عورت کو مقرر کرے۔ (۲)

جگہوں پر عوام الناس عورتوں کو کام یاب بنانے، ان کے حق میں ووٹ بھی دیتے ہیں۔ حالاں کہ عورت کو ووٹ دینا دراصل اس کو والی بنانا ہے، جو حدیث کی رو سے صراحۃً ممنوع ہے۔ اور ایسی قوم کو اللہ کے نبی ﷺ نے ناکام قوم قرار دیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ بعض اسلامی ممالک میں عورتیں وزیراعظم بنی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ناجائز تھا، تو وہاں یہ کیوں کر ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام ہوتے ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی، اچھے بھی اور برے بھی، اس سے اس بات پر استدلال کرنا کہ شرعاً یہ جائز ہے، اصولاً غلط اور بے موقعہ ہے اور جن اسلامی ممالک کا حوالہ اس سلسلے میں دیا جاتا ہے وہ درحقیقت اسلامی ممالک کہلانے کے مستحق ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو مسلم ممالک کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اسلامی ملک وہ ہے جہاں اسلامی قوانین اور شریعت کو آئین و دستور قرار دیا گیا ہو اور ان ممالک میں شریعت کو آج تک بہ حیثیت دستور تسلیم ہی نہیں کیا گیا، تو وہاں کے کسی قانون اور طریقہ کو بہ طور حجت پیش کرنا سادہ لوحی اور اصول سے عدم واقفیت ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

بے حیائی و بے پردگی

عورت کی عمدہ صفات میں بتایا گیا ہے کہ اس کو باحیا اور باپردہ ہونا چاہئے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اس کے حق میں بے حیائی اور بے پردگی اچھی چیز نہیں۔ اس سلسلے کے چند احکامات سن لیجئے۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بَارِجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفَيْنَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾

(النور: ۳)

نیز حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت جب عطر لگا کر کسی مجلس پر سے گزرے، تو وہ ایسی اور ایسی یعنی زانیہ ہے۔ (۱)

ان ساری تعلیمات کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ عورت ہر طرح کی بے حیائی و بے پردگی سے مکمل پرہیز کرے یہی عورت کی شان اور اسی میں اس کا کمال ہے۔

مردوں سے مشابہت

عورت کا اصل حسن و جمال اس میں ہے کہ عورت عورت رہے۔ اللہ نے عورت کو جن خوبیوں اور کمالات سے ممتاز کیا ہے، اس کا حق ہے کہ عورت اپنی ان خوبیوں و کمالات کو باقی رکھے۔ اس لیے شریعت نے حکم دیا کہ عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار نہ کریں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (۲)

افسوس کہ آج یورپ و امریکہ کی تہذیب جدید نے جہاں اور بہت سی بے حیائیوں کو جنم دیا اور پھیلایا ہے، وہیں مردوں اور عورتوں میں فرق و امتیاز کو بھی ختم کر دیا ہے۔ عورتیں لباس و پوشاک، وضع قطع، طرز و انداز سب چیزوں میں مردوں کی نقالی و مشابہت اختیار کرنے لگی ہیں اور اس غیر فطری روش و طریقے کو فیشن کا نام دے کر بہ طور فخر اختیار کیا جاتا ہے۔

(۱) ترمذی: ۲/۱۰۷، ابو داؤد: ۲/۵۷۵، نسائی: ۲/۲۸۲

(۲) ترمذی: ۱۰۶/۲، ابو داؤد: ۶۷۵/۲، بخاری: ۸۷۴/۲، ابن ماجه: ۱۳۷

عورت کے لیے حیا و پردہ کی ضرورت و اہمیت اور بے حیائی و بے پردگی کی برائی و مذمت اوپر عرض کی گئی ہے۔ اسی میں سے یہ بھی ہے کہ عورت اتنا باریک کپڑا نہ پہنے، جس سے اس کا بدن ظاہر ہو۔ حدیث میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس وقت ان کے بدن پر باریک کپڑے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منہ موڑ لیا اور فرمایا:

اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جائے، تو اس کو لائق نہیں کہ اس

کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے؛ مگر چہرہ اور ہاتھ۔ (۱)

ایک حدیث میں بہ طور پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخیوں کی دو قسم ایسی ہیں، جن کو میں نے دیکھا نہیں، یعنی میرے بعد ظاہر ہوں گی، ان میں سے ایک یہ فرمایا کہ ایسی عورتیں جو کپڑے پہنی ہوں گی؛ مگر ننگی ہوں گی۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنت میں نہ داخل ہو سکیں گی اور نہ جنت کی خوش بو یا نہیں

(١) ابو داؤد: ٢/٥٦٤، المشكاة: ٣٧٧

گی، حالاں کہ جنت کی خوش بو اتنی اتنی دور سے محسوس کی جاسکے گی۔ (۱)
اس حدیث میں جو فرمایا گیا کہ کپڑے پہنی ہوں گی؛ مگر ننگی ہوں گی۔ اس کا
ایک مطلب علما نے یہ بیان کیا ہے کہ اتنے باریک کپڑے پہنے کہ بدن اندر سے جھلکنے
لگے۔ (۲)

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ ایسا لباس
پہننے والی عورتیں جنت میں داخل نہ ہو سکیں گی اور نہ جنت کی خوش بو پائیں گی۔
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی
پوتی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بنت عبد الرحمن حاضر ہوئیں اور باریک و پتلا دوپٹہ اوڑھے
ہوئی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس دوپٹہ کو لیا اور پھاڑ ڈالا، پھر ایک موٹی اوڑھنی
ان کو اوڑھائی۔ (۳)

دیکھئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے باریک دوپٹہ کو کتنا برا سمجھا کہ اس کو پھاڑ ڈالا
اور موٹا دوپٹہ ان کو اوڑھایا۔ لہذا عورت کو چاہئے کہ باریک لباس نہ پہنے جس سے
بدن جھلکنے لگے۔ یہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔

بلا محرم سفر

بغیر محرم کے سفر کرنا عورت کے لیے جائز نہیں، اگرچہ کوئی مقدس سفر ہی ہو جیسے
حج کا سفر۔

(۱) چنانا چہ حدیث میں ہے:

(۱) مسلم: ۲/۲۰۵

(۲) شرح مسلم: ۲/۲۰۵

(۳) المشکوٰۃ: ۳۷۷

کسی ایسی عورت کے لیے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں کہ محرم کے بغیر ایک دن ایک رات کا سفر کرے۔ (۲)

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے اور بعض روایات میں یوں ہے کہ

عورت کے لیے حلال نہیں کہ بغیر محرم کے سفر کرے۔ (۳)

(۴) ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

عورت ایک برید (یعنی بارہ میل) کا سفر نہ کرے؛ مگر یہ کہ اس

کے ساتھ اس کا شوہر یا محرم ہو۔ (۴)

ان روایات میں بہ ظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ کہ کسی میں عورت کو بغیر محرم سفر سے مطلقاً منع کیا گیا ہے، کسی میں ایک برید یعنی بارہ میل سفر سے منع کیا ہے، بعض میں ایک دن کی مسافت سفر سے منع کیا ہے۔ بعض فقہانے فرمایا کہ عورت بغیر محرم کے نہ قریب کا سفر کر سکتی ہے نہ دور کا۔ اور روایات میں جو مختلف باتیں ہیں، یہ سوال کرنے والوں کے لحاظ سے ہیں کہ کسی نے تین دن کا سوال کیا، کسی نے ایک دن کا اور کسی نے ایک برید کا، تو جو سوال تھا اس کے مطابق جواب دیا گیا، لہذا عورت کو بغیر

(۱) بخاری: ۱/ ۱۴۷، مسلم: ۱/ ۲۳۳، طحاوی: ۱/ ۳۰۲، مسند حمیدی: ۲/ ۲۴۰

(۲) بخاری: ۱/۱۲۸، مسلم: ۱/۴۳۳، طحاوی: ۱/۳۰۲

(۳) طحاوی: ۱/۳۰۱، مسلم: ۱/۲۳۲، مسند حمیدی: ۱/۲۲۲

(۴) طحاوی: ۳۰۲/۱

محرم نہ دور کا سفر جائز ہے، نہ قریب کا، بعض نے روایات مذکورہ میں ترجیحی عمل سے کام لیا ہے اور اس میں بھی فقہاء کے مختلف نظریات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور پر فتن میں جہاں ایک طرف شرم و حیا کی چادر کو تار تار کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف فحش لٹریچر، گندے ناول، حیا سوز پوسٹر، ٹی وی کے شرم ناک مناظر اور دیگر عوامل نے شہوت کی بھٹی ہر طرف بھڑکار رکھی ہے۔ عورت کے لیے اسی میں عافیت و خیریت ہے کہ وہ نہ بڑا سفر بغیر محرم کے کرے نہ چھوٹا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا منشا بھی یہ ظاہر یہی ہے کہ عورت عافیت و خیریت میں رہے اور اس کی عزت، عفت و عصمت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

آرائش و زیبائش میں حدود سے تجاوز

آرائش و زیبائش اور بناؤ سنگار، حسن و جمال کے لوازمات میں سے ہے اور عورت جو کہ سراپا جمال ہے، اس کی فطرت میں داخل ہے؛ اس لیے شریعت نے عورت کو بناؤ سنگار کی اجازت ہی نہیں؛ بل کہ ترغیب بھی دی ہے۔ مثلاً:

(۱) عورت کو مہندی سے اپنے ہاتھوں کو زینت دینے کی اجازت و ترغیب حدیث میں آئی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے بیعت کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو فرمایا کہ اپنی ہتھیلیوں کو جب تک (مہندی سے) نہ بدلوگی، میں بیعت نہ کروں گا اور ایک روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے اپنے ہاتھ سے ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کیا، تو آپ نے اپنے ہاتھ سکھینچ لیے اور فرمایا کہ مجھے کیا پتہ کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ عورت کا ہاتھ ہے، فرمایا کہ اگر تو عورت ہوتی تو اپنے ناخنوں کو (مہندی سے) رنگ

دیتی۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مہندی سے اپنے ہاتھوں کو زینت دینا مستحب و پسندیدہ امر ہے اور اس کی تعلیم و ترغیب دی گئی ہے۔

(۲) ریشمی لباس و پوشاک اور سونے کے زیورات مردوں کے لیے حرام و ناجائز قرار دیے گئے؛ مگر عورت کو اس کے ذریعے زینت اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ چنانچہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ میری امت کی عورتوں کے لیے ریشم اور سونا حلال کیا اور

مردوں پر حرام کیا ہے۔ (۲)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔ (۳)

(۳) کانوں میں اور گلے میں، ہاتھوں اور پیروں میں زیورات سے اپنے کو آراستہ کرنے کی اجازت دی گئی اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عام صحابیات میں اس کا رواج موجود تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک عید کے موقع پر نبی کریم ﷺ نماز عید کے بعد عورتوں میں جا کر وعظ فرمایا اور اس میں صدقہ کی فضیلت بیان کی اور اس کا حکم دیا تو عورتیں اپنے کانوں سے قرط (بالیاں) اور گلوں سے ہار، ہاتھوں سے انگوٹھیاں اور پیروں سے چھلے نکال کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ (۴)

(۱) ابو داؤد: ۵۷۴:۲، نسائی: ۲۷۹:۲

(۲) نسائی: ۲: ۲۹۳

(۳) ترمذی: ۱: ۳۰۲، ابن ماجه: ۲۵۷، طحاوی: ۲: ۲۸۸

(۲) بخاری: ۲/۸۷۳/۴، ۹۷۴/۲، نسائی: ۱/۲۳۵، ابن ماجه: ۹۱

اور امام بخاری تعلیقاً اور ابن سعد نے موصولاً روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ (۲)

ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ چاندی کی بڑی بڑی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ (۳)

اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھی چاندی کے پازیب تھے جن کو استعمال فرماتی تھیں۔ (۴)

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ اسلام نے عورت کو زیب و زینت کے اختیار کرنے کی اجازت و ترغیب دی ہے؛ مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آرائش و زیبائش میں حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بل کہ غیر شرعی زیبائش و آرائش سے بچنا چاہیے۔

چنانچہ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔

(۱) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بدن کو گودنے والی اور

(۱) ترمذی: ۱/۱۳۸

(۲) بخاری: ۸۷۳/۲، فتح الباری: ۳۳۰/۱۰

(۳) ابو داود: ۲۱۸/۱

(۴) ابو داود: ۱/۲۱۸

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے بال میں دوسروں کے (بال جوڑنے والی) اور جڑوانے والی اور بدن گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت کی ہے۔ (۲)

(۳) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری بیٹی کے چچک نکلی تھی، جس سے اس کے بال جھڑ گئے اور میں نے اس کی شادی کر دی، تو کیا میں اس کے بالوں میں دوسرے بال جوڑ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے بالوں میں جوڑ لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت کی ہے۔ (۳)

(۴) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے آخری سفر حج کے دوران مدینہ تشریف لائے اور وہاں خطبہ دیا۔ آپ نے ایک سپاہی سے (جو آپ کا محافظ تھا) بالوں کا ایک گچھا لیا۔ اور فرمایا کہ کہاں ہیں تمہارے علما؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی لیے ہلاک ہوئے (کہ ان کی عورتوں نے بالوں میں بال ملانے کو) اختیار کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرا خیال یہ تھا کہ یہ کام (بالوں میں بال ملانا)

(۱) بخاری: ۸۷۹/۲، نسائی: ۲۹۲/۲، مسلم: ۲۰۲/۲، ابوداؤد: ۵۷۳/۲

(۲) بخاری: ۸۷۹/۲، ترمذی: ۳۰۶/۱، ابوداؤد: ۵۷۲/۲، نسائی: ۲۹۲/۴، مسلم: ۲۰۴/۲

(۳) مسند حمیدی: ۲۵۳/۱، بخاری: ۸۷۹/۲، مسلم: ۲۰۲/۲، نسائی: ۲۹۲/۲

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل دوزخ کی دو قسمیں ایسی ہیں کہ میں نے ان کو نہیں دیکھا (یعنی آئندہ پیدا ہوں گی) ایک وہ قوم جن کے پاس گائے کی دم کے مانند کوڑے ہوں گے، جن سے وہ لوگوں کو ماریں گے۔ دوسرے وہ عورتیں جو کپڑے پہنی ہوں گی؛ مگر نگلی ہوں گی۔ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی اور خود دوسروں کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی۔ ان کے سر سختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ یہ لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ جنت کی خوش بو پائیں گے، حالاں کہ اس کی خوش بو اتنی اتنی دور سے محسوس کی جاسکے گی۔ (۲)

ان احادیث میں چند مسائل ہیں ہم ان کی توضیح و تفصیل یہاں پیش کریں گے۔

بدن گودنایا گدوانا

بدن گودنیا گدوانا حرام ہے اور جاہلیت کے دور کی رسم ہے۔ اس کو عربی میں وشم کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہتھیلی کی پشت پر یا کلائی یا بازو یا مونڈھے وغیرہ پر سوئی سے نقش بنا کر اس میں سرمہ یا نورہ بھر دیتے ہیں۔ جس سے وہ نقش ابھر کر دکھائی دیتا ہے، کبھی اس نقشہ میں کوئی پھول یا کسی جانور کی شکل بناتے ہیں۔ ہندوؤں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ حرام ہے۔ گودنے والی اور گدوانے والی دونوں پر لعنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر چھوٹی بچی کو اس کے ذمے دار

(۱) بخاری: ۸۷۸/۲، مسلم: ۲۰۵/۲، ابوداود: ۵۷۳/۲

(۲) مسلم: ۲/۲۰۵

گودوائیں تو یہ ذمے دار گناہ گار ہوں گے، بچی پر گناہ نہ ہوگا اور چوں کہ اس میں خون باہر آنے کے بعد وہیں سوراخوں میں جم جاتا ہے۔ لہذا علما نے فرمایا کہ وہ بدن کا حصہ ناپاک ہو جاتا ہے اس کو زائل کرنا واجب ہے۔ بشرطے کہ بلا حرج و تکلیف اس کو ضائع کیا جاسکے۔ (۱)

غرض یہ کہ زیب و زینت کی یہ صورت قطعی اسلام میں حرام اور ناجائز ہے، لہذا اس سے احتراز لازم و ضروری ہے۔

بال نو چنا

دوسری چیز جس سے ان احادیث میں ممانعت کی گئی ہے وہ ہے بال نوچنا اور اس سے مراد یہ ہے کہ زینت و خوب صورتی کے لیے اپنی بھنویں بنائیں اور اس کے بال نوچیں۔ اسی طرح چہرے کے اطراف اور سر کے کناروں کے بال نوچیں یہ بھی حرام ہے۔ البتہ عورت کے داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو اس کو زائل کرنے کے بارے میں علما نے اختلاف کیا ہے۔ امام ابن جریر نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ مگر جمہور علما نے فرمایا کہ داڑھی اور مونچھ کو نوچ کر نکال دینا عورت کے لیے مستحب ہے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو عورتوں میں بالوں کو کاٹنے اور پھنوس بنانے کا رواج ہے، وہ اس حدیث کی رو سے صریحاً ناجائز ہے۔

بالوں میں بال ملانا

تیسری چیز ان احادیث میں وصل شعر ہے۔ یعنی بالوں میں بال ملانا۔ یہ بھی

(۱) فتح الباری: ۳۷۲/۱۰، شرح مسلم نووی: ۲/۲۰۵

(۲) ایضاً

حرام اور ناجائز ہے اور اس میں اتنی سختی برتی گئی ہے کہ چچک کی وجہ سے ایک لڑکی کے بال جھڑ جانے پر بھی اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ بال میں بال ملائے جائیں۔ جب کہ اس لڑکی کی شادی بھی ہوئی تھی اور شوہر کے لیے زیب و زینت کے لیے ضرورت بھی تھی جیسا کہ حدیث نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ اپنے بالوں میں اضافہ کے لیے خواہ بال استعمال کریں یا اور کوئی چیز سب حرام و ناجائز ہے جیسے دھاگے، ریشم، صوف وغیرہ کے بنے ہوئے کپے ہوتے ہیں اور اس کے ناجائز ہونے کی دلیل مسلم کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زجر منع کیا کہ عورت اپنے بالوں میں کوئی چیز بھی ملائے۔ (۱)

چوں کہ اس حدیث میں بالوں میں کسی بھی چیز کا ملانے سے منع فرمایا گیا ہے، لہذا جمہور علما نے اس بات کو ناجائز قرار دیا کہ عورت اپنے بالوں میں ریشم، صوف، نیلون وغیرہ کسی بھی چیز کو ملائے اور بالوں کو بڑھائے۔ لہذا احتیاط یہی ہے کہ عورت اس سے پرہیز کرے۔

البتہ بعض علما و بہت سے فقہا نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ بالوں میں کسی انسان کے بال ملانا، تو حرام و ناجائز ہے؛ لیکن دوسری کسی چیز سے اپنے بالوں میں اضافہ کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اور ان کی دلیل حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا یہ قول ہے:

” لا باس بالقراصل “ کہ قر اٹل میں کوئی حرج و مضائقہ نہیں ہے۔

اس قول کو امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ

اس کی سند صحیح ہے۔ (۱)

قراں قراں کی جمع ہے اور یہ ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس میں لمبی لمبی بالیاں ہوتی ہیں اور یہاں اس سے مراد ریشم یا صوف وغیرہ کے دھاگے ہیں، جن کو عورتیں اپنے بالوں میں لگا کر چوٹیاں بناتیں ہیں۔ (۲)

اس قول کے پیش نظر بعض علما و فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ عورت اپنے بالوں میں بال تو نہیں ملا سکتی؛ مگر صوف، ریشم وغیرہ کے بنے ہوئے کھجے استعمال کر سکتی ہے۔ امام احمد کا یہی قول ہے جیسا کہ امام ابوداؤد نے اپنے سنن میں نقل کیا ہے۔ (۳)

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور علمائے حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ بالوں کے علاوہ کوئی اور مصنوعی چیز بالوں میں ملانے اور لگانے کی اجازت ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

”لَا بَأْسَ أَنْ تَتَّصِلَ الْمَرْأَةُ شَعْرَهَا بِالصُّوفِ أَنْمَا يَنْهَى بِالشَّعْرِ.“

اس میں حرج نہیں کہ عورت اپنے بال کو صوف میں ملائے ممنوع تو بال سے ملانا ہے۔ (۴)

اس کو نقل کر کے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی کو ہم لیتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ عورت کو زینت کے لیے اپنے بالوں میں بال ملانے کی تو اجازت نہیں ہے، البتہ کوئی اور چیز ملائے، تو درست اور

(۱) فتح الباری: ۱۰/۳۷۵

(۲) فتح الباری: ۱۰/۳۷۵

(۳) ابوداؤد: ۲/۵۷۴

(۴) جامع المسانید: ۲/۳۰۷، کتاب الآثار: ۱۹۷

آخری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بہ طور پیشین گوئی فرمایا کہ ایسی عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہننے کے باوجود نکلی ہوں گی۔ اس کی تفصیل و تشریح پہلے گزر چکی ہے اور ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ بختی اونٹ اونٹوں کی قسموں میں سے ایک خاص قسم ہے جس کے کوہان بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اپنے سروں کو عمامہ کپڑا وغیرہ باندھ کر بنائیں گی۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ (۲)

اور قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں ان عورتوں کے سروں کو اونٹ کے کوبان سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ اپنی چوٹیوں کو اٹھا کر اپنے سروں کے اوپر باندھے گی؛ تاکہ زینت ہو۔ (۳)

یہ وہی صورت ہے جس کو یہاں کے عرف میں ”چونڈا“ کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جائز نہیں ہے اور اس میں ان عورتوں کو وعید سنائی گئی ہیں، جو اپنے سروں پر چونڈا باندھتی ہیں کہ وہ عورتیں جنت کی خوش بو سے بھی محروم رہیں گی، چہ جائے کہ جنت میں داخل ہوں۔

سمر کھلا رکھنا

آج کل سرکھلا رکھنا اور بے پردہ رہنا عورتوں کا فیشن بن گیا ہے اور عورتیں اس

(۱) شرح مسلم: ۲۰/۲۰۵، مرقاۃ: ۷/۲۹۵، فتح الباری: ۱۰

(۲) شرح مسلم: ۲/۲۰۵

(۳) فتح الباری: ۱۰/۳۷۵

کو بھی زینت کا لازمہ سمجھتی ہیں۔ حالاں کہ غیر محرم کے سامنے سر کھولنا بے حیائی کی بات ہے۔ اور یہ پردہ میں داخل ہے کہ سر اور بالوں کو غیر محرم سے چھپائیں۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے ”الکباثر“ میں ایک لمبی حدیث نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا دونوں ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ زارو قطار رو رہے تھے، ان حضرات نے آپ سے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ معراج کی رات میں نے اپنی امت کی عورتوں کو دیکھا جو مختلف قسم کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ لہذا اس کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ فرمایا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا جس کو بالوں میں باندھ کر لٹکایا گیا ہے اور اس کا دماغ پک رہا ہے اور ایک عورت کو دیکھا جس کو اس کی زبان سے باندھ کر لٹکادیا گیا ہے اور اس کے حلق میں گرم گرم پانی ڈالا جا رہا ہے اور ایک عورت کو دیکھا، جس کے پیر اس کی چھاتیوں سے باندھ دیئے گئے ہیں اور ہاتھ سر پر باندھ دیئے گئے ہیں۔ اور ایک عورت کو دیکھا جس کو اس کی چھاتیوں سے باندھ کر لٹکادیا گیا ہے۔ اور ایک عورت ایسی ہے کہ اس کا سر خنزیر جیسا، بدن گدھے جیسا ہے اور ہزاروں قسم کا عذاب ہو رہا ہے۔ اور ایک عورت کو دیکھا کہ اس کی شکل پر ہے اور آگ اس کے منہ میں داخل ہو کر پاخانہ کی راہ سے نکل رہی ہے اور فرشتے اس کے سر پر آگ کے گرزوں سے مار رہے ہیں۔ پھر تفصیل سے ان عورتوں کی وہ برائیاں بیان فرمائیں جن کی وجہ سے ان کو یہ عذاب

ہور ہاتھا کہ پہلی عورت مردوں سے اپنے بال چھپاتی نہ تھی۔ دوسری شوہر پر زبان درازی کرتی تھی۔ تیسری پاکی کا اہتمام نہ کرتی تھی اور نماز کا مذاق اڑاتی تھی۔ چوتھی زانیہ تھی۔ پانچویں جھوٹی اور چغل خور تھی۔ چھٹی حسد کرتی تھی۔ (۱)

اس حدیث سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سرکھلا رکھنا عورت کے لیے معیوب بات ہے۔

فصل سادس

عورت اور ازدواجی زندگی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت قاہرہ و حکمت بالغہ سے انسان کی دو صنفیں ”مرد و عورت“ بنا کر ایک دوسرے کے لیے سامان راحت و لذت اور ذریعہ تسکین و طمانیت پیدا فرمادیا، جس سے دنیا کا یہ پورا نظام ایک خاص انداز پر چل رہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسانوں کی آبادی کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (النِّسَاءُ - ۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔) (۱)

(۱) ترجمہ از حضرت تھانوی قدس سرہ

پھر مرد و عورت کو ایک دوسرے کا جوڑا بنا کر ان میں محبت و مودت اور رافت و رحمت کے عجیب جذبات پیدا فرمادیے، جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک عظیم کارنامہ اور شاہ کار ہے جیسا کہ خود اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا
إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ﴾ (الرُّوم: ۲۱)

(اور) اللہ کی قدرت کی (نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت و الدی بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے درمیان زوجیت کا رشتہ قائم کر کے انہیں ایک نئی زندگی سے وابستہ کر دیا، جو تفرد و تجرد کی زندگی سے بہت مختلف ہے، لہذا اس زندگی میں مرد و عورت پر کچھ ذمے داریاں ہیں، کچھ حقوق، کچھ آداب عائد ہوتے ہیں، جن کی رعایت و پابندی اور حفاظت و پاس داری کے بغیر ازدواجی زندگی کا حقیقی لطف اٹھایا نہیں جاسکتا؛ مگر یہاں اس وقت ہمارے پیش نظر، چوں کہ عورت کا کردار پیش کرنا ہے؛ اس لیے ہم صرف عورت سے متعلق ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، جو اس کی ازدواجی زندگی کے بنانے، سنوارنے اور اسلام کے موافق گزارنے میں مفید و ثمر آور و نتیجہ خیز ہیں۔

شوہر کی عظمت و عزت

شادی کے بعد سب سے پہلے جس ذات سے عورت کو وابستگی و تعلق ہوتا ہے وہ

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النِّسَاءُ: ۳۴)
(مرد عورتوں پر حاکم ہیں)

اس آیت اور اس کے شان نزول سے معلوم ہوا کہ مرد (شوہر) کا اللہ اور اس

124

کے رسول کی نظر میں کیا مقام و مرتبہ ہے اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے میں سجدہ کا حکم دیتا، تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے بہ وجہ اس حق کے، جو اللہ نے ان مردوں کا عورتوں پر رکھا ہے۔^(۱)

اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کا کتنا اونچا مقام و مرتبہ بتایا ہے کہ اگر اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ کی اجازت ہوتی، تو عورت کو حکم ہوتا کہ مرد کو سجدہ کرے۔ لہذا عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کی عزت و عظمت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گزارے۔ آج کی عورتوں نے یورپ و امریکہ کی تقلید میں شوہر کی عظمت و حرمت کا پاس و خیال ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور مساوات کا کھوکھلا نعرو لگا کر اسلام کی اس تعلیم کے خلاف چلنا شروع کر دیا ہے، مگر یاد رکھو کہ اسلام سے زیادہ مساوات کا سبق دینے والا کوئی نہیں ہو سکتا (جیسا کہ اس سے قبل بھی تفصیلاً عرض کیا گیا ہے) مگر مساوات کا یہ مطلب لینا بالکل عقل و فطرت کے خلاف ہے کہ کسی کی عظمت و حرمت کا پاس و خیال نہ رکھا جائے۔ کیا کوئی شخص تمام انسانوں کے بہ حیثیت انسان مساوی ہونے کا یہ مطلب نکال سکتا ہے کہ کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں؟ باپ اور بیٹے کا ہر اعتبار سے ایک ہی مرتبہ ہے، استاذ و شاگرد میں کوئی تفاضل نہیں اور حاکم و رعایا سب ایک ہی مرتبہ کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ مساوات کا معنی ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ اسی طرح مرد و عورت کی مساوات کا یہ مطلب نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں کسی بھی اعتبار سے فرق نہیں اور شوہر کو کسی اعتبار سے بھی تفوق حاصل نہیں۔

غرض یہ کہ اسلام میں شوہر کو ایک عظمت و بلندی مرتبہ حاصل ہے اور عورت پر لازم ہے کہ اس کا لحاظ رکھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اے عورتو! اگر تم کو

(۱) ابو داؤد: ۱/۲۹۱، ترمذی: ۱/۲۱۹، ابن ماجه: ۱۳۳

معلوم ہو جائے کہ تمہارے مردوں کا تم پر کیا حق ہے، تو تم اپنے شوہر کے قدموں کی غبار و دھول کو اپنے گالوں سے صاف کرو گی۔ (۱)

ایک حدیث میں جس کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور احمد و نسائی نے روایت کیا ہے، آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ عورت پر سب سے بڑا حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے شوہر کا۔ (۲)

شوہر کی اطاعت و خدمت

عورت کے کمال و خوبی میں سے اسلام نے شوہر کی اطاعت و خدمت کو بھی شمار کیا ہے اور اس کو عورت پر لازم بھی قرار دیا ہے اور جو عورت شوہر کی اطاعت نہ کرے اس کے لیے سخت وعید بھی بیان کی گئی۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھے۔ اور رمضان کے روزے

رکھے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے،

تو وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔“ (۳)

اس حدیث میں شوہر کی اطاعت کرنے والی عورت کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ وہ

ضرور جنت میں جائے گی اور اس کو اختیار ہوگا کہ جس دروازے سے چاہے داخل

ہو جائے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس کو کوئی چیز دخول جنت سے مانع نہ ہوگی اور جہد

(۱) الکائن: ۱۷۴

(۲) فتح الباری: ۴۰۲/۱۰

(۳) مشكاة: ۲۸۱

اس حدیث نے بہترین عورت کی صفات و خصوصیات میں تین چیزوں کو بیان کیا ہے ۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جب مرد عورت کی بشاشت و چستی اور حسن اخلاق اور حسن معاشرت کو دیکھے، تو خوش ہو جائے۔ اور اگر اس کے ساتھ ساتھ حسن صورت بھی جمع ہو جائے، تو وہ نور علی نور اور سرور علی سرور ہے۔ (۳)

اس سے مراد وہ حکم ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، اگر کوئی مرد شریعت کے خلاف حکم دے مثلاً یہ کہے کہ بے پردہ میرے ساتھ چلو، تو اس کی بات ماننا جائز نہیں، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے:

(۱) مرقعات: ۶/۲۷۸

(۲) نسائی: ۲/۷۱، مشکاة: ۲۸۳

(۳) مرقعات: ۶/۲۷۸

(۳) اپنے نفس و مال میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی تصرف نہ کرے:

حضرت حصین بن محسن رحمہ اللہ نے اپنے ایک پھوپھی سے روایت کیا ہے (جو کہ صحابیہ ہیں) کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک حاجت و ضرورت کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ اے عورت! کیا تو شوہر والی ہے؟ میں نے کہا ہاں؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اس سے الگ تو کہاں آگئی؟ میں نے عرض کیا کہ میں کوتاہی نہیں کرتی؛ مگر جب کہ مجبور ہو جاتی ہوں۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دیکھ لے کہ تو کہاں آگئی؟ وہ (شوہر) ہی تیری جنت یا دوزخ ہے۔ (۲)

اس حدیث میں شوہر کی رضا و اجازت کے بغیر عورت کے باہر جانے پر اللہ کے

(۱) مرقاۃ: ۶/۲۷۸، مرقاۃ سے مال کی دونوں تفسیر نقل کی گئی ہیں۔

(۲) مسند حمیدی: ۱/۱۷۲

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر شوہر عورت کو حکم دے کہ پیلے پہاڑ سے پتھر اٹھا کر کالے پہاڑ کی طرف اور کالے پہاڑ سے سفید پہاڑ کی طرف منتقل کرے، تو اس کو چاہیے کہ ایسا ہی کرے۔

ابن ماجہ میں لال پہاڑ اور کالے پہاڑ کا ذکر ہے۔ (۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے عورت کو ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے، خواہ وہ مشکل سے مشکل کام کیوں نہ ہو۔ اس سے اطاعت کی اہمیت بتانا مقصود ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن عورت سے سب سے پہلے جس بات کا سوال ہوگا وہ اس کی نماز اور اس کے شوہر کے بارے میں ہوگا۔ (۲)

یعنی یہ سوال ہوگا کہ شوہر کی اطاعت و خدمت کی یا نہیں؟ اب سوچ لیا جائے کہ مرد کی اطاعت و فرماں برداری اور خدمت کتنی ضروری ہے۔

شوہر کی رضا و خوشی کا اہتمام

ازدواجی زندگی میں شوہر کی مرضی و خوشی کا اہتمام اور اس کی ناراضی و ناخوشی

(۱) مشکاة: ۲۸۳/ ابن ماجه: ۱۳۳

(٢) الكبائر: ١٤٣

سے بچنے کا التزام بھی عورت کے اہم ترین فرائض میں داخل ہے۔ اور اس کے خلاف کرنا اس کے لیے اللہ کے غضب و غصہ کا باعث و سبب ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اس حال میں مرے کے اس کا شوہر اس سے راضی ہو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ (۱)

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر کی رضا و خوشی، عورت کو جنت میں لے جاتی ہے۔ اس سے شوہر کی رضا و خوشی کے حاصل کرنے کی اہمیت و فضیلت ثابت ہوئی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخص ہیں، جن کی نہ نماز قبول ہوتی ہے اور نہ ان کی کوئی نیکی (آسمان کی طرف) چڑھتی ہے۔ ایک وہ غلام جو بھاگ گیا ہو جب تک وہ اپنے آقا کی طرف لوٹ کر نہ آئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دے دے۔ (یعنی اطاعت کرے) دوسرے وہ عورت جس پر اس کا خاوند ناراض ہو، تیسرے شرابی جب تک کہ نشہ اس کا نہ اترے۔ (۲)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شوہر کی ناراضی سے اللہ بھی ناراض ہوتے ہیں اور اس عورت کی نمازوں کو رد فرما دیتے ہیں۔ جو شوہر کو ناراض کرتی ہے؛ مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مراد وہ ناراضی ہے جو شرع کے موافق ہو۔ اگر شوہر اس لیے ناراض ہوتا ہے کہ عورت اللہ کے حکموں پر چلتی ہے، تو اس کی یہ ناراضی حدود شرع سے متجاوز ہونے کی بنا پر اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ ہاں! نوافل و مستحبات کے ادا کرنے میں عورت کو

(۱) ابن ماجه: ۳۳، ترمذی: ۲۱۹/۱

(۲) مشکاة: ۲۸۳

(۱) چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کے لیے حلال و جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے، جب کہ اس کا شوہر موجود ہو؛ مگر اس کی اجازت سے (رکھ سکتی ہے) (۱)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت رمضان کے سوا کوئی اور روزہ نہ رکھے، جب اس کا خاوند موجود ہو؛ مگر یہ کہ اس کی اجازت ہو۔ (تو پھر جائز ہے) (۲)

(۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے شوہر صفوان بن معطل، میں نماز پڑھتی ہو تو مارتے ہیں اور روزہ رکھتی ہوں تو روزہ توڑ دیتے ہیں اور خود فجر کی نماز اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک کہ سورج نہیں نکل جاتا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ اس وقت وہیں مجلس میں موجود تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان باتوں کے بارے میں پوچھا جو اس عورت نے کہا تھا، حضرت صفوان نے وضاحت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے جو یہ کہا کہ نماز پڑھنے پر مارتا ہوں تو بات یہ ہے کہ یہ دو دو سورتیں (نماز میں) پڑھتی ہے اور میں نے اس سے اس کو منع کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) بخاری: ۷۸۲/۲

(۲) ابوداؤد: ۳۳۳/۱، ترمذی: ۱۶۳/۱، ابن ماجه: ۱۲۶، دار می: ۱۲/۲

فرمایا کہ ایک سورت ہو تو کافی ہے۔ صفوان نے کہا کہ اس نے جو یہ کہا کہ میں اس کا روزہ تڑوا دیتا ہوں تو بات یہ ہے کہ یہ مسلسل روزے رکھتی چلی جاتی ہے اور میں جو ان آدمی ہوں صبر نہیں کر سکتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ پھر صفوان نے عرض کیا کہ اور یہ بات کہ میں نماز فجر سورج نکلنے تک نہیں پڑھتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بیوی بچے والے ہیں (رات میں ضرورت کے لیے کام کرتے ہیں) لہذا سورج نکلنے سے پہلے اٹھ نہیں پاتے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب بیدار ہوں نماز پڑھ لو۔ (۱)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نفل روزہ شوہر کی مرضی و اجازت کے بغیر رکھنا اچھا نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نوافل پر نوافل یا لمبی لمبی رکعتیں پڑھنا جس سے شوہر کی خدمت میں خلل و کوتاہی ہو، اچھا نہیں۔ غرض یہ کہ شوہر کی رضا و خوشی کا ہر جگہ اور ہر وقت لحاظ و خیال رکھنا عورت پر لازم ہے۔

ایک تنبیہ

مگر ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ شوہر کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کی رضا و خوشی کا اہتمام و خیال صرف اس موقع پر ضروری اور لازم ہے، جب کہ اس سے خدا کی نافرمانی اور ناراضی لازم نہ آتی ہو، اگر شوہر ایسی بات کا حکم دے جس سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو، یا اس کی ناراضی پر مشتمل ہو، تو وہاں ہرگز شوہر کی بات نہیں مانی جائے گی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ انصار کی ایک عورت نے اپنی لڑکی کی شادی کی، پس اس کے سر کے بال گرنے لگے، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے حکم دیا

ہے کہ میں اپنے بالوں میں دوسرے بال ملاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں؛ بال میں بال ملانے والی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے۔^(۱)

دیکھئے اس حدیث نے صاف بتا دیا کہ جو بات خلاف شرع ہو اس میں شوہر کی بات نہیں مانی جائے گی۔

شوہر کی ناشکری سے پرہیز

عام طور پر عورتوں میں ایک بیماری یہ ہے کہ شوہر کی ناشکری کرتی ہیں۔ مال و پیسہ ملے، عمدہ کھانے و بہترین کپڑے ملیں، راحت و آسائش کا پورا سامان میسر ہو، مگر ذرا سی بات خلاف شرع پیش آجائے تو بلا جھجک یہ کہہ دیتی ہیں کہ اس گھر میں میں نے کبھی راحت نہیں پائی، یہاں مجھے کوئی سکون نہیں چنانچہ اس زودرنجی اور ناشکری کا حدیث میں ذکر آیا ہے اور اس پر نبی کریم ﷺ نے وعید سنائی ہے۔

ان احادیث کو بہ غور ملاحظہ کریں اور اپنے حالات پر بھی غور کریں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”میں نے دوزخ کو دیکھا اس میں اکثر عورتیں تھیں، صحابہ رضی اللہ عنہم

نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ کس وجہ سے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان کی ناشکری کرنے کی وجہ سے ہے۔ پوچھا گیا کہ کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟ فرمایا کہ اپنے شوہر کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کو جھٹلاتی ہیں۔ اگر تو ان میں سے کسی سے اپنی پوری زندگی بھی احسان و سلوک کرے پھر تجھ سے کوئی بات خلاف طبع دیکھے گی تو یوں کہے گی کہ میں نے تیرے سے کوئی بھلائی کبھی نہیں دیکھی۔ (۲)

(۱) بخاری: ۷۸۴/۲

(۲) بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۹۸، مالک: ۶۶

”اے عورتو! تم صدقہ دو اور کثرت سے استغفار کرو، کیوں کہ میں دیکھا کہ تم دوزخ والوں میں زیادہ تعداد میں ہو۔ ایک جری عورت نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہماری کیا بات ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم (عورتیں) لعنت بہت کرتی اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ تم شکوہ بہت کرتی ہو۔ (۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عورتوں میں کچھ بری باتیں اور اخلاقی رذائل ایسے ہیں، جن کی وجہ سے اکثر عورتیں جہنم میں جائیں گی۔ ایک یہ کہ زبان پر ہمیشہ لعن طعن کے الفاظ کا ہونا، چناں چہ مشاہدہ ہے کہ اکثر عورتیں اپنے بچوں کو، بڑوں کو، اپنوں اور غیروں سب کو، اکثر و بیشتر لعنت کرتی رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ شکوہ و شکایت ان کا محبوب مشغلہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر شکوہ و شکایت کرنے لگتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ شوہر کی ناشکری کرتی ہیں اور کتنا بھی انہیں چین و راحت شوہر کی طرف سے پہونچے؛ مگر جوں ہی ذرا سی بات خلاف مزاج پیش آئی، سارے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اس پر وعید سنائی ہے کہ ایسی عورتیں جہنم میں جائیں گی۔ اس لیے ایک تو عورتوں کو اس قسم کی برائیوں سے خصوصیت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دوسرے صدقہ و خیرات اور استغفار کے ذریعہ ان گناہوں کو دھونا چاہیے۔

(۱) ابن ماجه: ۲۸۸، مسلم: ۲۸۹، فتح الباری: ۴۶۸/۲، دارمی: ۱۶۳/۱

اس حدیث میں سفر سے آنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرماتے ہیں کہ ابھی فوراً اچانک گھروں میں داخل نہ ہوں اور عورتوں کو ذرا مہلت دو کہ وہ بالوں میں کنگھی کر لیں اور غیر ضروری بالوں کو استرے وغیرہ سے صاف کر کے زینت اختیار کر لیں۔

ملا علی قوری رحمۃ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

”معنیٰ یہ ہیں کہ اس وقت تک ٹھہر جاؤ کہ عورتیں اپنے شوہروں کے لیے زیب و زینت کر لیں اور اپنے آپ کو شوہر کے لیے تیار کر لیں۔“ (۲)

ایک اور حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”جب تُو رات میں (شہر میں) داخل ہو تو اپنے گھر والوں کے پاس اس وقت تک داخل نہ ہو کہ وہ بالوں میں کنگھی اور استرے سے صفائی نہ

(۱) بخاری: ۲/۸۹، مسلم: ۱/۲۸۹، دارمی: ۲/۱۳۲، مشکاة: ۲۶۷

(۲) مرقعات: ۱۹۲/

کر لے۔“ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ، جب تم میں سے کوئی بہت دنوں (گھر سے) غائب رہے، تو رات میں اچانک اپنے گھر والوں کے پاس نہ جائے۔ (۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ طویل مدت تک گھر سے غائب رہنے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عورت کی طرف سے ایسی بات پائے جو کہ کراہت و نفرت کا سبب و باعث بن جائے۔ مثلاً عورت صفائی و نظافت اور زیب و زینت کے ساتھ نہ ہو۔“ (۳)

اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گئی کہ عورت کا مرد کے لیے زیب و زینت اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مردوں کو حکم دیا گیا کہ ایک دم و اچانک گھروں میں داخل نہ ہوں تا کہ عورتیں زیب و زینت کر لیں۔ اور علما نے اس کو مرد کے حقوق میں شمار کیا ہے کہ عورت پاکی و صفائی اور زیب و زینت کے ساتھ رہے اور اس میں کوتاہی کرنے پر سزا دی جاسکتی ہے۔ درمختار و ردالمحتار میں ہے کہ:

”زینت کے ترک کرنے پر شوہر اپنی بیوی کو سزا دے سکتا ہے۔“ (۴)

اسی طرح ”خانیہ“ اور ”البحر الرائق“ میں ہے کہ چار باتوں پر شوہر بیوی

(۱) بخاری: ۷۸۹/۲

(۲) بخاری: ۷۸۸/۲۰

(۳) فتح الباری: ۳۴۰/۹

(۴) شامی: ۷۷/۴

کو مار سکتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ عورت زینت ترک کرے۔ اور ایک حیرت ناک بات یہ بھی سن لیجئے کہ ان چار میں ایک چیز نماز کا ترک کرنا بھی ہے؛ مگر اس میں علما کا اختلاف ہے کہ نماز کے چھوڑنے پر عورت کو شوہر مار سکتا ہے یا نہیں؛ لیکن ترک زینت پر مارنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے۔ (۱)

اس سے اندازہ لگائیے کہ عورت کے لیے زینت کا اختیار کرنا کس قدر ضروری اور اہم ہے اور زینت، نظافت و صفائی میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں کہ منہ کو مسواک یا کسی اور چیز سے صاف کرے اور جسم اور کپڑوں کو عطر و خوشبو سے معطر کرے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کرے، زیر ناف اور بغلوں کے بال صاف کرے وغیرہ۔

گھر اور بچوں کی حفاظت

اسلام نے پاکیزہ اور پرسکون اور پر لطف زندگی کے لیے جو اصول و ضوابط تعلیم فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت شوہر کے گھر کی، اس کے مال و اسباب کی اور اس کے بچوں کی نگرانی و حفاظت کرتی رہے۔ یہ اس کے فرائض و ذمے دار یوں میں داخل کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچے کی راعی و نگران اور حفاظت کرنے والی ہے۔ (۲)

راعی وہ امانت دار نگران، جو اس چیز کی اصلاح و تدبیر میں لگا رہتا ہے، جو اس کی ذمہ داری میں دی گئی ہو اور عورت کی نگرانی یہ ہے کہ گھریلو امور اور اولاد کی

(١) خانیه علی هامش الهندیہ: ۱/۴۴۲، البحر الرائق: ۵: ۴۹

(۲) بخاری: ۱۰۵۷/۲

« أَلَا فُكِّلُكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ »

کے بارے میں سوال کیا جائے گا)

بچوں کی تربیت و نگرانی

بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اگرچہ باپ پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ماں جو کردار (رول) ادا کر سکتی ہے، اس کے مقابلے میں باپ کی حیثیت ثانوی درجہ کی رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ ماں کی گود، بچے کا سب سے پہلا مدرسہ و تعلیم گاہ ہوتی ہے، پھر بچہ کو ماں سے دن رات کے چوبیس گھنٹے میں اکثر اوقات

(۱) فتح الباری: ۱۳/۱۱۲، ۱۱۳

سابقہ پڑتا ہے، جب کہ باپ سے بہت کم سابقہ پڑتا ہے؛ اس لیے عورت پر بچوں کی تعلیم و تربیت کی یہ نازک ذمہ داری باپ سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات تو یہ ذہن نشین ہونا چاہیے کہ بچے کو شروع ہی سے ایمان و یقین میں مضبوط کرنے کی فکر لازم ہے۔ دوسرے اسلامی آداب و اسلامی تہذیب سے اس کو آراستہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، پھر جب وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائے، تو تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے، تعلیم میں اول و مقدم دینی تعلیم کو رکھنا چاہیے پھر عصری و دنیوی تعلیم سے بھی بچے کو آراستہ کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔

یہ مختصر جملے بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں، لیکن یہ اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ آج عام طور پر مائیں اپنے بچوں کی تربیت میں انتہائی کوتاہی کرتی ہیں، ان کو نہ اسلامی آداب سکھاتی ہیں، نہ اسلامی تہذیب و اخلاق سے ان کو آراستہ کرتی ہیں؛ بل کہ صرف انگریزی و عصری اسکولوں کے حوالے کر کے یہ سمجھ جاتی ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا؛ مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان اسکولوں میں ایمان و یقین تو ایک طرف رہا، وہاں ان بچوں کو اخلاق و آداب کی تعلیم بھی نہیں دی جاتی؛ بل کہ اور زیادہ بے ادبی، گستاخی، بد تہذیبی سکھائی جاتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ و تجربہ ہے؛ اس لیے بچوں کی تربیت کا گھر میں نظام بنانا چاہئے؛ مگر اس کے لیے پہلے ماؤں کو علم و اخلاق، ایمان و اسلام سے اپنے آپ کو مزین و آراستہ کرنا چاہیے، ورنہ جہالت و بداخلاقی و بد تہذیبی سے ماں خود آلودہ ہو، تو بچوں کی وہ کیا تربیت کر سکتی ہے؟

بچوں کی تربیت کے لیے حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قصے، حضراتِ صحابہ و صحابیات کے واقعات اور بزرگانِ دین کے حالات و کوائف کا پیش کرنا اور ان کو سنانا نہایت مفید ہوتا ہے اور چوں کہ بچے کہانی سننے کے نہایت شوقین

ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ ان قصوں کو بہت ذوق و رغبت سے سنتے اور یاد بھی کرتے ہیں۔ لہذا اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔ بعض عورتیں بچوں کو گالیاں سکھاتیں ہیں اور بچے کی زبان سے گالیاں سن کر خوش ہو جاتی ہیں اور اکثر عورتیں اپنے بچوں کو ٹی وی کی عادی بناتی ہیں اور بچے اس کی وجہ سے فحش و بے حیائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض عورتیں اپنے بچوں کو گانے سکھا کر خوش ہو جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ یہ تربیت ہو رہی ہے یا بگاڑ؟

غرض یہ کہ ماں پر یہ بڑی اہم و نازک ذمہ داری ہے۔ اس کو احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ تربیت اولاد کے سلسلے میں مشہور محدث علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”تحفۃ المودود باحکام المولود“ میں ایک جگہ تفصیلی کلام کیا ہے۔ میں یہاں اس کے ایک حصہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے:

جن چیزوں کا بچہ بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے ان میں سے ایک اس کے اخلاق کی طرف بھی توجہ ہے؛ کیوں کہ اخلاق پیدا ہی ہوتے ہیں ان چیزوں سے جن کی عادت مربی بچپن میں ڈالتا ہے، جیسے سخت مزاجی، غصہ، چاپلوسی، جلد بازی، طیش، شدت اور لالچ وغیرہ، پس بڑے ہونے کے بعد ان چیزوں کی تلافی اس پر مشکل ہو جاتی ہے اور یہ صفات و حالات اس میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ان کے اخلاق منحرف ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی تربیت ہی اسی طرح ہوئی ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ بچہ جب عقل و شعور کی عمر کو پہنچ جائے، تو لہو و لعب اور باطل قسم کی مجالس سے بچے، گانے، فحش اور بدعت اور بری گفتگوں کے سننے سے بچے؛ کیوں کہ

جب یہ اس کی سماعت سے معلق ہو جاتے ہیں، تو بڑے ہو کر ان باتوں سے الگ ہونا ان پر مشکل ہوتا ہے۔ اور اس کے ذمے دار کو بھی ان باتوں سے ان کو ہٹانا شاق (مشکل) ہوتا ہے؛ کیوں کہ عادات کو بدلنا مشکل کاموں میں سے ہے۔ ذمے دار کو چاہیے کہ وہ بچہ کو کسی سے کوئی چیز لینے سے بہت ہی زیادہ اجتناب کرائے؛ کیوں کہ جب وہ لینے کا عادی ہو جائے گا، تو یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی اور وہ لینے کا عادی ہوگا، نہ کہ کسی کو دینے کا۔ لہذا بچہ کو دینے اور خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور ذمے دار جب کسی کو کچھ دینا چاہے، تو بچہ کے ہاتھ سے دے تاکہ وہ دینے کی حلاوت کا مزہ چکھے۔ نیز بچہ کو جھوٹ اور خیانت سے اس سے زیادہ بچائے جتنا کہ اس کو زہر سے بچاتے ہیں؛ کیوں کہ جھوٹ اور خیانت کی سبیل اس پر آسان ہوگئی، تو دنیا اور آخرت کی سعادت اس کے حق میں خراب ہوگئی اور اس کو ہر خیر سے محروم کر دیا۔ بچہ کو سستی سے، بے کاری سے، راحت و آرام سے بچائے؛ بلکہ اس کے برخلاف (مخت و مجاہدہ) کی عادت ڈالے اور آرام صرف اتنا دے جس سے کہ اس کا نفس اور بدن کام کے لیے تیار ہو جائے؛ کیوں کہ سستی اور بے کاری برے نتائج اور شرمندگی کا ذریعہ اور سبب بنتی ہیں اور مخت اور کوشش سے اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دنیا میں یا آخرت میں اور کبھی دونوں جگہ۔ پس جو سب سے زیادہ آرام کرتا ہے وہ (بعد میں) سب سے زیادہ تھکتا ہے اور جو سب سے زیادہ مخت کرتا ہے، وہ بعد میں سب سے زیادہ راحت پاتا ہے۔ (۱)

آخر میں ایک حدیث پر اس فصل کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَدَّبُوا أَوْلَادَكُمْ عَلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ حُبِّ نَبِيِّكُمْ وَحُبِّ
الْبَيْتِهِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ.» (١)

(اپنی اولاد کو تین عادتوں پر تربیت کرو، ایک تمہارے نبی اکرم کی محبت، دوسرے نبی کے گھر والوں کی محبت، تیسرے تلاوة قرآن۔)

اس حدیث میں اول ایمان کی، دوسرے اعمال کی تعلیم و تلقین اور اس پر تربیت کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ حضور ﷺ اور آل رسول کی محبت ایمان کا تقاضا ہے اور جس کے دل میں یہ چیز پیدا ہو جائے، وہ اتباع رسول اور اتباع آل رسول کے ذریعہ اپنے عمل کو بھی درست کر لیتا ہے، لہذا سب سے پہلے رسول کی محبت بچوں میں پیدا کی جائے، پھر تلاوت قرآن کی تعلیم ہونا چاہئے؛ اس لیے کہ قرآن ہمارا اصل ماخذ و سرچشمہ ہدایت ہے۔

آج بچوں کو خود ماں باپ، فلم اسٹاروں، اور کھلاڑیوں اور دنیا داروں کی محبت سکھاتے ہیں اور دنیا بھر کی چیزیں پڑھاتے ہیں؛ مگر قرآن اور اسلام کی تعلیم نہیں دیتے، یا اگر دیتے بھی ہیں، تو ثانوی درجہ پر دیتے ہیں جس سے بچوں میں بگاڑ و فساد کا آنا لازمی ہے۔

غرض یہ کہ ماں کے ذمے ہے کہ بچوں کی تربیت پر خاصا زور صرف کرے اور ہر اچھی عادت، تمام اچھے اخلاق ان میں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

شوہر کے والدین اور رشتے داروں سے سلوک

عورت پر لازم ہے کہ شوہر کے والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، شوہر کی ماں کو اپنی ماں اور شوہر کے باپ کو اپنا باپ سمجھے، بھائی کو اپنا بھائی اور بہن کو اپنی بہن سمجھے، اسی طرح دیگر رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ مقام دے کر ان کو اس درجہ و مقام کے لحاظ سے دیکھے اور اس کے مناسب ان سے سلوک کرے۔

علامہ شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: عورت پر واجب ہے کہ شوہر کے خاندان والوں اور اس کے رشتے داروں کا اکرام کرے۔ (۱)

آج کل امت میں جو امراض اور بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں، جن سے معاشرہ فاسد اور خراب اور متعفن ہو گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت شادی ہوتے ہی شوہر کو اس کے رشتے داروں اور والدین سے جدا کرنے کی فکر کرتی ہے، اور اس کی تحریک شروع کر دیتی ہے۔ شوہر کے والدین سے بدسلوکی، شوہر کے بھائی، بہنوں سے لڑائی جھگڑا، اور اس کے رشتے داروں سے نفرت و کراہت اور ان کی توہین و تذلیل، آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ شوہر اور اس کے خاندان میں نفاق، و شقاق پیدا ہوتا ہے اور جدائی و فراق کے حالات بن جاتے ہیں اور اس سب کی ”ہیروئن“ یہی نئی نویلی دلہن ہو جاتی ہے۔

اسلام تو اتحاد و اتفاق، پیار و محبت کا سبق دیتا ہے اور یہاں اس کے خلاف نفاق،

شفاق اور فراق کی باتیں ہوتی ہیں۔ عورت کو چاہیے کہ اس روش سے دور رہے اور شوہر کے تمام اہل خاندان کے ساتھ محبت کے ساتھ اور حسن سلوک کے ساتھ رہے۔

تنبیہ : میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ اور کلی طور پر اس صورت حال کی ذمہ داریہ شدی ہونے والی لڑکی ہوتی ہے، نہیں، بل کہ بہت ساری جگہوں پر شوہر کے والدین و رشتے دار اور خود شوہر کی طرف سے لڑکی پر زبردستی اور بے جا مطالبات وغیرہ کی وجہ سے اس طرح کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے؛ مگر چوں کہ اس رسالہ کا موضوع یہ نہیں ہے؛ اس لیے اس کا ذکر ہم نے نہیں کیا ہے اور بعض دوسرے مضامین میں ہم نے اس پر بھی کلام کیا ہے؛ اس لیے کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہاں صرف لڑکی کو ذمہ دار کیوں بتایا گیا؟ وجہ ظاہر ہے کہ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ عورت شوہر کے رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، اس کی ترغیب دینا مقصود ہے لہذا ہم نے بات کو اسی پر منحصر و محدود رکھا ہے۔

گھریلو کام کس کی ذمہ داری ہے؟

ازداجی زندگی میں خوشی و خوش گواری پیدا کرنے کے لیے جو تدابیر و ذرائع ہیں ان میں اہم بات یہ ہے کہ عورت گھریلو کام کاج کے لیے ہمیشہ اپنے آپ کو مستعد و تیار رکھے، کھانا پکانے، برتنوں کو صاف کرنے، گھر کو سجانے اور سنوارنے اور ہر چیز میں صفائی و ستھرائی، تہذیب و شائستگی کا پاس و لحاظ رکھنے کی فکر و کوشش کرنا، عورت کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ہے۔

اس سلسلے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت فاطمہ ؑ ہی تنہا اپنے گھر کی تمام ذمے داریاں پوری فرماتی تھیں، حضرت فاطمہ ؑ سے مقام و مرتبہ میں، علم و فضل میں اور حسب و نسب میں بڑھ کر کون عورت ہو سکتی ہے؟ جب آپ ہی اپنے گھر کی

کا سارا کام کرتی تھیں، تو ہر مسلمان عورت کو بھی ان کی اتباع میں یہی طریقہ اپنانا چاہیے۔ یہ جو عوام؛ بل کہ خواص اور علما میں بھی مشہور ہو گیا ہے کہ عورت پر کھانا پکانے وغیرہ کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بل کہ شوہر کے ذمہ ہے کہ عورت کو پکا پکایا کھانا لا کر دے، یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ فقہا کرام نے اس مسئلہ میں تفصیل لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت ایسے خاندان کی ہے کہ اس کی عورتیں خود پکانے اور گھریلو کام کرنے کی عادی نہیں ہوتیں، بل کہ خدمت گاروں سے کام لیتی ہیں، تب شوہر کے ذمہ ہے کہ پکا پکایا کھانا مہیا کرے، یا کوئی خدمت گار عورت کے لیے مقرر کرے اور اگر عورت اپنے گھر میں خود کام کرنے کی عادی ہے اور ایسے خاندان کی ہے کہ وہاں کی عورتیں خود گھریلو کام کرتی ہیں تو خود عورت پر پکانا واجب ہے، حتیٰ کہ شوہر سے اس کام کی اجرت لینا بھی اس کے لیے جائز نہیں۔ علما نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عام عورتوں پر گھریلو کام کرنا شرعاً و عادتاً واجب ہے۔ ہاں بڑے خاندان کی عورت جس کو اس کام کی عادت نہیں، اس کے لیے پکا ہوا کھانا فراہم کرنا مرد کے ذمہ ہے۔ فافہم

نباہ کی کوشش

ازدواجی زندگی کا مسئلہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے اور یہ صرف دو افراد (مرد و عورت) کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ دو خاندانوں کا مسئلہ ہے اور پھر ایک دودن یا چند مہینوں کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے؛ اس لیے کھٹی میٹھی باتیں، نرم و گرم حالات، سختی و نرمی کی کیفیات، مزاجوں میں تلون، حالات میں اتار چڑھاؤ، رایوں میں

(۱) دیکھو عالمگیری: ۱/۵۵۰، البحر الرائق: ۴/۱۸۳، در مختار و شامی: ۳/۵۷۹

”شیطان اپنا تخت سمندر پر بچھاتا ہے اور اپنی ذریت کو فتنہ مچانے بھیجتا ہے اور اس سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ مچانے والا ہو، بس ایک ایک اس کے پاس آکر کہتے ہیں کہ میں نے یہ فتنہ کام کیا، میں نے یہ کام کیا، تو شیطان کہتا ہے کہ تو نے تو کچھ نہیں کیا، پھر ایک شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کے پیچھے پڑ کر اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑا کہ اس کے اور اسکے بیوی کے درمیان تفریق کرادی، یہ سن کر شیطان خوش ہو جاتا ہے اور اس کو شاباشی سے دے کر اس کو گلے سے لگا لیتا ہے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ میاں بیوی میں تفریق وجدائی شیطان کو سب سے زیادہ پسند ہے؛ اس لیے وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے لہذا مرد کو بھی اور عورت کو بھی چاہیے کہ کسی بھی صورت میں تفریق تک نوبت نہ پہنچائیں، الا یہ کہ ضرورت شدیدہ لاحق ہو جائے۔ نیز حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلْتُ زَوْجَهَا الطَّلَاقَ مِنْ غَيْرِ بَاسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ» (۱)

(جو کوئی عورت اپنے شوہر سے بلا کسی وجہ کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کو بلا وجہ طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا جائز نہیں؛ بل کہ نباہ کرنا چاہئے، ہاں ایسی سخت حالت پیش آجائے کہ بغیر طلاق یا خلع کے زندگی مشکل ہو جائے تو پھر الگ بات ہے۔

ولادت اور ضبط ولادت

ازداجی زندگی میں عورت کے لیے ایک کٹھن مرحلہ ولادت وزچگی کا ہوتا ہے، مگر یہ مرحلہ عورت کے حق میں دنیوی اعتبار سے اور ازداجی کے لحاظ سے ایک کمال کا ثبوت اور اخروی زندگی کے لیے ایک فضیلت کا ذریعہ ہے، چنانچہ جو عورت بانجھ ہوتی ہے اس کو ناقص سمجھا جاتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ولادت عورت کے حق میں ایک کمال ہے۔ پھر اگر کوئی عورت بانجھ ہوتی ہے، تو لوگ اس کے نقص و عیب کو دور و زائل کرنے کے لیے کبھی ڈاکٹروں کے پاس، کبھی عاملوں کے پاس اور کبھی مندر کے پجاریوں کے پاس تک جاتے اور دردِ در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں (حالاں کہ بعض عامل اور یہ مندر کے پجاری شرکیہ و کفریہ یہ کلمات پر مشتمل تعویذ گنڈے کرتے ہیں، جس سے ایمان کا سلب ہو جانا یقینی ہے)

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کا بانجھ ہونا عیب و نقص اور بااولاد ہونا وجہ کمال شمار ہوتا ہے۔ اور اخروی فضیلت اس میں اس طرح ہے کہ زچگی کی تنگی و پریشانی

(۱) دارمی: ۱۳۲/۲، ترمذی: ۲۲۶/۱، ابن ماجہ: ۱۴۸/۲، ابوداؤد: ۳۰۳/۱

پھر بچے کی پرورش و تربیت میں پیش آنے والی کلفت پر اس کو ثواب ملتا ہے۔
 چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 عورت اپنی حالت حمل سے لے کر بچہ جننے اور دودھ چھڑانے تک
 (فضیلت و ثواب میں) ایسی ہے جیسے وہ آدمی جو اسلام کی راہ میں سرحد
 کی نگہبانی کرنے والا ہو اور اگر اس درمیان مر جائے تو اس کو شہید کے
 برابر ثواب ملے گا۔ (۱)

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے عورت کے لیے یہ
 بات باعث کمال و فضیلت ہے کہ اس کو اولاد ہو، تو اب ایک دوسری بات بھی سمجھ لینا
 چاہیے، وہ یہ کہ اسلام میں کثرتِ اولاد بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ یہ مضمون احادیث
 میں پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَزَوَّجُوا الْوُلُودَ الْوُدُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمْ» (۲)

(شادی ایسی عورت سے کرو جو زیادہ بچے جننے اور محبت کرنے والی
 ہو؛ کیوں کہ میں تمہاری وجہ سے فخر کروں گا۔)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ ”شرح مشکوٰۃ“ میں مذکورہ بالا حدیث کی توضیح کرتے
 ہوئے لکھتے ہیں:

”ودود“ وہ عورت جو اپنے شوہر سے محبت کر نیوالی ہو اور ”ولود“ وہ

(۱) کنز العمال: بحوالہ بہشتی زیور حصہ آٹھواں: ۵۸

(۲) ابوداؤد: ۱/۲۸۰، نسائی: ۷۰/۲

ہے جو زیادہ بچے جننے والی ہو۔ اور رسول اللہ نے یہ دو قیدیں اس لیے لگائی ہیں کہ بچہ جننے والی عورت اگر شوہر سے محبت نہ رکھتی ہو، تو شوہر بھی اس سے رغبت نہ کرے گا اور اگر عورت محبت تو کرتی ہو؛ مگر بچہ جننے والی نہ ہو، تو مقصود حاصل نہ ہوگا اور وہ مقصود امت کو زیادہ کرنا ہے، تو الدو تناسل کی کثرت سے (پھر آخری جملہ کی تشریح میں کہتے ہیں) میں تم سے فخر کروں گا؛ یعنی تمہارے سبب سے ساری امتوں پر فخر کروں گا، میرے ماننے والوں کی کثرت کی وجہ سے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے تکثیر اولاد کی ترغیب دی ہے اور اس کی حکمت و مصلحت بھی بتلائی ہے کہ اگر تمہاری اولاد زیادہ ہوگی تو میں اس کی وجہ سے سے دیگر امتوں پر فخر کروں گا کہ میرے ماننے والے زیادہ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہت محبت کرنیوالی اور بہت جننے والی سے شادی کرو کیونکہ میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے فخر کروں گا۔ (۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ شادی کرو (اولاد) زیادہ کرو؛ کیوں کہ میں امتوں پر تمہارے سبب سے فخر کروں گا۔ (۳)

مگر آج مغربی تہذیب کے بت نے اسلام کی تعلیم کے بالکل برعکس یہ تعلیم و تبلیغ جاری کر رکھی ہے کہ اولاد کم سے کم ہو، اس لیے پہلے، تو یہ نعرہ تھا کہ ”ہم دو اور

(۱) مرفعات: ۱۹۲/۶-۱۹۳

(۲) ابن حبان بحوالہ فتح الباری: ۱۱/۹

(۳) رواہ الشافعی بلا غافح الباری: ۱۱/۹

ہمارے دو؛ مگر اب اس تقلیل کی تعلیم میں مزید ترقی ہوئی ہے، اس لیے اب یہ نعرہ لگایا جا رہا ہے ”ہم دو اور ہمارا ایک“ اور شاید مزید ترقی ہوگی تو یہ کہا جائیگا ”ہم دو اور ہمارا کوئی نہیں“۔ خیر اس پر تو کوئی حیرت و استعجاب نہیں البتہ اس پر ضرور حیرت و تعجب ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ مغربی تہذیب کے اس بت نے اسلام کے پیروکاروں میں سے بھی کچھ اپنے پجاری پیدا کر لیے، جو اس کی تعلیم پر آمنا و صدقنا کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس پر عمل کو ترقی کی علامت سمجھتے ہیں۔

یہ ضبط ولادت یا برتھ کنٹرول (Birth control) کا نظریہ جن بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے، ان میں بنیادی طور پر اس بات کو پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی نسل کا اضافہ معاشی خطرات و پریشانیوں کا باعث ہے؛ کیوں کہ وسائل پیداوار محدود ہیں۔ لہذا اگر تحدید نسل نہ کی گئی تو آئندہ مزید و شدید خطرات کا دنیا کو سامنا کرنا پڑیگا۔ اس کے بعد نکات بعد الوقوع کے طور پر اس نظریہ کی کچھ اور بنیادیں بھی تراش لی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ زیادہ بچوں کا ہونا عورت کے لیے تکلیف کا باعث ہے اور اس کی صحت اور خوب صورتی پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ کہ اولاد کی کثرت کی وجہ سے ان کی صحیح تربیت و معقول تعلیم کا انتظام مشکل ہوتا ہے وغیرہ۔

جہاں تک معاشی خطرات و مشکلات کا مسئلہ ہے، تو اس کی بنیاد پر ضبط تولید خالص جاہلی نظریہ ہے جس کی تردید میں قرآن پاک کی متعدد آیات نازل ہوئی ہیں۔ جاہلی دور میں عرب کے اندر اولاد کا قتل مروج تھا، جس کی ایک وجہ یہی تھی کہ معاشی تنگی و پریشانی کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کی تردید فرمائی ہے اور اس عمل کو گناہ کبیرہ قرار دیا۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا﴾ (الأنعام: ۱۵۱)

(اور تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو اور تم
کو رزق دیتے ہیں، بلاشبہ ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے)
دوسری جگہ فرمایا

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ
وَإِيَّاهُمْ﴾ (الأنعام: ۱۵۲)

(اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی تم کو اور ان کو
رزق دیتے ہیں)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ
کے ساتھ کسی کو شریک کرنا حالاں کہ اللہ ہی نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ
کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ پھر کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ
اپنے بچے کو اس لیے قتل کر دینا کہ وہ تیرے ساتھ ساتھ کھائے گا۔^(۱)

اس حدیث کا منشا بھی یہی ہے کہ فقر و فاقہ یا معاشی تنگی کے اندیشہ سے اولاد کو قتل
کرنا گناہ عظیم ہے اور شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔ آیات قرآنیہ و احادیث
نبویہ اس پر واضح دلیل و برہان ہیں کہ معاشی تنگ دستی و تنگ حالی کے پیش نظر اولاد کو
مارنے کا نظریہ غیر اسلامی و جاہلی نظریہ ہے؛ کیوں کہ اسلام بنیادی طور پر اس فلسفہ
و نظریہ کا مخالف ہے کہ انسانی آبادی میں اضافہ معاشی تنگی پیدا کرتا ہے؛ بل کہ اسلام،

تو صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ جو بچہ بھی دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنا مقررہ و مقدرہ رزق لے کر آتا ہے۔ پھر عقلاً بھی یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا؛ اس لیے کہ اگر آبادی میں اضافہ ہوتا ہے، تو اللہ نے قدرتی طور پر اس کے کم کرنے اور حد اعتدال پر رکھنے کے لیے انتظامات بھی کر رکھے ہیں اور آج اموات بھی اسی کثرت کے ساتھ ہو رہی ہیں، کہیں زلزلے ہیں، کہیں طوفان اور سیلاب کے تھپڑے ہیں، کہیں آندھی کی ہلاکت خیزیاں ہیں، کہیں ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے ہوش ربا حوادث ہیں، کہیں قتل عام کی وارداتیں ہیں اور کہیں میزائیل اور بم دھماکوں کی ہلاکت آفرینیاں ہیں اور اس طرح بہ یک وقت ہزار ہا انسان پردہ عدم میں جا چھپتے ہیں، لہذا یہ خیال کہ انسانی نسل کا صرف اضافہ ہو رہا ہے اور معاشی تنگی پیش آرہی ہیں صحیح نہیں۔

ہاں! معاشی تنگی جو اس وقت اپنی ہلاکت خیزیوں سے انسانی معاشرے کو تہ و بالا کر رہی ہے، اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ تقسیم دولت کا نظام صحیح نہیں ہے، حق دار محروم ہیں اور غیر موج اڑا رہے ہیں۔ چنانچہ عوام پریشان و تنگ حال ہے اور اہل حکومت اپنی عیاشیوں اور لذت کوشیوں میں مست ہیں، جس کی وجہ سے حق دار تک ان کا حصہ رسد ہی نہیں پہنچ رہا ہے اور وہ پریشان ہیں۔

اب رہا عورت کی صحت و تندرستی کا مسئلہ، تو اس کی بنیاد پر برتھ کنٹرول البتہ قابل غور ہو سکتا ہے؛ مگر یہ ایک استثنائی ہوگی اور کسی عورت کے حالات بیماری و کم زوری کی وجہ سے اس کا تقاضا کرتے ہوں، تو اہل فتویٰ علما کے سامنے پوری حالت و کیفیت پیش کر کے فتویٰ لیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے؛ لیکن محض آئندہ کے خطرہ اور خدشہ سے کہ کہیں آئندہ کثرتِ اولاد صحت پر اثر انداز نہ ہو جائے، برتھ کنٹرول و ضبط تولید کی اجازت نہیں ہو سکتی؛ اس لیے کہ ایسے خطرات و خدشات، تو ولادت و کثرت ہی پر

کیا موقوف ہیں بغیر اس کے بھی انسان بیمار ہو سکتا ہے اور عمر ڈھلتی ہے تو انسان بیٹھے بٹھائے بھی کم زوریوں اور بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ کہنا کہ کثرت ولادت سے صحت ضرور خراب ہوتی ہے، مشاہدہ اور تحقیق کے خلاف ہے۔ آج بھی ہزاروں ایسی عورتیں ہیں جو کثیر العیال ہونے کے باوجود پوری طرح صحت مند ہیں۔ اور خوبصورتی اور حسن و جمال میں کمی آجانے کا عذر اوپر کے عذر سے بھی زیادہ لنگ ہے اور بالکل ناقابل التفات، پھر یہ عورتیں کب تک اپنے حسن و جمال کی آبیاری کرتی رہیں گی؟ اور کب تک اس کی نمائش کرتی رہیں گی؟ جب عمر ڈھلے گی تو یہ ساری لیب پوت ہی کیا؟ اصل حسن و جمال بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ جو عارف کامل گذرے ہیں، انہوں نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

زلف جعد و مشکبار و عقل بر

آخر اودم زشت پیر خر

(یعنی یہ حسین گھونگر والے اور مشک بار اور عقل و ہوش ربا زلفیں جن پر لوگ دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ انجام کار بوڑھے گدھے کی بری دم معلوم ہوتی ہیں) اور نذیر اکبر آبادی مرحوم کے اشعار ہیں۔

کئی بار ہم نے دیکھا کہ جن کا مشین بدن تھا معطر کفن تھا

جو قبر کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا

نہ عضو بدن تھانہ تار کفن تھا

غرض یہ کہ یہ عذر کوئی قابل توجہ والتفات نہیں کہ اس کی بنا پر ایک حرام و ناجائز امر جائز قرار پائے۔

رہا یہ کہنا کہ کثرتِ اولاد کے ساتھ تعلیم و تربیت صحیح نہیں ہو سکتی یہ بھی صحیح نہیں جس کو تربیت کرنا آتا ہے وہ تو بہت سوں کی کر دیتا ہے اور جو تربیت کرنا نہ جانتا ہو وہ ایک کی بھی نہیں کر سکتا۔ پھر جب اللہ نے تعلیم و تربیت کا حکم دیا ہے، تو ہمارا کام ہے کہ تربیت و تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔ آج لوگ صرف فیشن پرستی، دنیا داری، مال داری اور دنیوی عہدے و مناصب کے حصول کو صحیح و معقول تعلیم و تربیت سمجھتے ہیں، ورنہ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تربیت کے لیے کوئی پریشانی نہیں۔

غرض یہ کہ یہ تمام باتیں از قبیل عذر لنگ ہیں، لہذا عورت کو اس طرح کی باتوں سے خلاف شرع کو یہ حرکت نہ کرنا چاہئے۔

فصل سابع

عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟

عورت اسلامی نقطہ نظر سے، کیا کچھ کر سکتی ہے، اس کی تفصیل کے لیے بلا مبالغہ ایک ضخیم جلد چاہیے؛ لیکن یہاں ہم اس موضوع پر نہایت اختصار کے ساتھ چند اہم پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک حدیث کی عجیب تشریح

عام طور پر عورتوں میں ایک احساس کم تری پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم مردوں کے مقابلہ میں کم تر و اتر ہیں اور اس سلسلے میں بعض حدیثوں سے بھی ان کو اور بعض پڑھے لکھے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

مثلاً نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ امْرَأَةِ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ » (۱)

(مردوں میں سے بہت کامل ہوئے ہیں اور عورتوں میں سے کوئی کامل نہیں ہوئی؛ مگر مریم بنت عمران ؑ اور فرعون کی بیوی آسیہ ؑ اور عائشہ ؓ کی فضیلت دوسری تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی

دوسرے تمام کھانوں پر ہے)

اس حدیث سے بہ ظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں میں کمال نہیں پایا جاسکتا؛ مگر یہ صحیح نہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد ہے۔ اگر عورتوں میں کمال نہ پایا جاسکتا تو بعض عورتوں کے کمال کا ذکر کیوں کیا جاتا؟ بل کہ اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ کمال تو دونوں میں پایا جاتا ہے؛ لیکن عام طور پر عورتیں اس کی تحصیل کی کوشش نہ کرنے کی وجہ سے صاحب کمال نہیں بنتیں، ورنہ وہ بھی محنت کریں، تو حضرت مریم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح صاحب کمال بن سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ یہ حدیث عورتوں کی تنقیص کے لیے نہیں؛ بل کہ ترغیب کے لیے آئی ہے اور ترغیب اسی چیز کی ہوتی ہے جس کا حاصل ہونا ممکن ہو، ناممکن چیز کی ترغیب نہیں دی جاتی۔

غرض عورتوں کو نہ مایوس ہونا چاہئے اور نہ احساس کم تری کا شکار ہونا چاہیے؛ بل کہ اس حدیث کے پیش نظر ان کو کمال کی تحصیل کے لیے محنت و مجاہدہ کرنا چاہیے۔ اس حدیث کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے، اگر کسی مدرسہ یا اسکول میں مثلاً پانچویں جماعت کے طلبہ محنت و مجاہدہ کے ذریعہ کامیاب ہو جائیں اور چھٹی جماعت کے طلبہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے ان میں سے اکثر نا کام ہو جائیں اور اساتذہ ان سے یوں کہیں کہ پانچویں جماعت میں اکثر طلبہ کامیاب ہوئے اور چھٹی میں دو چار کے سوا سب نا کام ہوئے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھٹی جماعت میں کمال پیدا ہی نہیں ہو سکتا، لہذا اب محنت نہ کی جائے؛ بل کہ اس سے چھٹی جماعت والوں کو بھی ترغیب دینا مقصود ہے کہ تم بھی محنت کرو گے، تو کامیاب ہو سکتے ہو جیسے تمہاری ہی جماعت میں دو چار افراد کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح حدیث میں عورتوں کو مردوں کی طرح صاحب کمال بننے کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

”میں نے تم (عورتوں) سے زیادہ عقل و دین میں ناقص ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو بڑے بڑے عقل مندوں پر غالب آجائیں، کسی عورت نے پوچھا کہ ہمارے دین و عقل میں نقصان کیا ہے؟ تو فرمایا کہ عقل کا نقصان یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور دین کا نقصان یہ ہے کہ حیض کی وجہ سے دو چار دن وہ نماز نہیں پڑھ سکتی اور رمضان میں روزہ نہیں رکھ سکتی۔ (۱)

مگر اس حدیث سے بھی یہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ عورت کسی کام کے لائق نہیں اور ہر طرح ناکارہ ہے؛ کیوں کہ حدیث کا منشا بعض اعتبارات سے عورت کے دین و عقل میں کم زوری و نقصان کو بتانا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بعض اعتبارات سے مردوں کی کم زوری و عیب کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خود اسی حدیث میں بتایا گیا کہ مرد باوجود عقل مند ہونے کے عورت سے مغلوب ہو جاتا ہے اور عورت اس کی عقل و فہم پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ مرد کی ایک کم زوری اور عیب ہے؛ مگر اس کی وجہ سے مرد کو ہر اعتبارات سے کیا کم زور اور ناقص قرار دیا جاسکتا؟

اسی طرح عورت بھی بعض اعتبارات سے عقل و دین میں ناقص ہے؛ لیکن اس کا ہر لحاظ سے ناقص ثابت نہیں ہوتا۔ غرض یہ کہ عورت کو احساس کم تری کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بل کہ اپنی بساط اور اپنے حدود اور دائرہ کار کے موافق کام کرنا چاہیے۔

(۱) بخاری: ۴۴/۱، ترمذی: ۸۹/۲، مسلم: ۶۰/۱، ابو داؤد: ۶۴۳/۲

اب رہا یہ سوال کہ عوت کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اس کی مختصر توضیح و تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جا رہی ہے۔

عورت اور تعلیمی سرگرمیاں

عورت کی خدمات اور سرگرمیوں کا ایک اہم اور نسبتاً آسان، زیادہ بار آور و مفید میدان ”تعلیمی میدان“ ہے۔

اس میں ایک تو یہ کہ عورت خود اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی جستجو کرے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کو تعلیم دینے اور تربیت دینے کی کوشش کرے۔

اسلام نے علم کے باب میں عورتوں اور مردوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کی ہے؛ بل کہ جس طرح مردوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ علم سے آراستہ ہوں، اسی طرح عورتوں پر بھی لاگو کیا کہ وہ علم سیکھیں۔

چناں چہ فرمایا گیا:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ» (١)

(یعنی علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)

اس میں مرد و عورت کی تفریق کے بغیر علم کی طلب و تحصیل کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا بھی احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے تین لڑکیوں یعنی بیٹیوں کی کفالت کی اور ان کو عمدہ تعلیم

دی اور ان سے حسن سلوک کیا اور ان کی شادی کردی تو اس کے لیے

(١) جامع العلم: ١/١٣١

جنت ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی ضروری ہے کہ علم سے آراستہ ہوں۔ اسلام نے اس پر زور دیا ہے اور اس کے لیے راہ کو کشادہ فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور اول کی عورتوں نے علم میں رسوخ و کمال حاصل کیا اور اس میں نام ور ہوئیں اور اس مقام پر فائز ہوئیں کہ ضرورت پر مرد بھی ان سے رجوع کرتے اور بسا اوقات علمی بحث و مباحثہ میں عورتیں مردوں پر فوقیت لے جاتیں۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ کتب احادیث میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں فرمایا کہ عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ باندھا جائے اگر کسی نے اس سے زیادہ مہر باندھا تو میں اس زیادتی کو بیت المال میں ڈال دوں گا، مجلس میں ایک عورت، عورتوں کی صف سے کھڑی ہوئی اور کہنے لگی کہ امیر المؤمنین! آپ کو یہ حق نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیوں؟ تو کہا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ:

﴿وَإِنْ أَتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَاْخُذْهُ وَاْمِنُهُ شَيْئًا﴾

(النِّسَاءُ: ۲۰)

(اگر تم نے عورت کو ایک قنطار بھی دیا تو اس میں سے واپس کچھ نہ لو)

(اس سے معلوم ہوا کہ ایک قنطار بھی دیا جاسکتا ہے)

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عورت نے صحیح کہا اور مرد نے خطا کی۔ (۲)
اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان

(۱) ابوداؤد: ۲/۷۰۰

(۲) جامع العلم: ۱/۱۳۱

کے سامنے ذکر کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو اس کے اہل و عیال کے رونے سے عذاب دیا جاتا جا ہے۔ یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا تھا؛ بل کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ کافر کے عذاب میں زیادتی کر دی جاتی ہے، جب کہ اس کے اہل و عیال روتے ہیں، پھر آیت پڑھی:

﴿أَلَا تَنْزِرُ وَازِرَةً وَذُرَّ أُخْرَى﴾ (الجمعة: ۳۸)
(کوئی کسی کا گناہ نہیں اٹھائے گا)

اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم کس قدر گہرا اور راسخ تھا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے فرمایا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس پر سکوت اختیار کیا؛ بل کہ تائید فرمائی۔ (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تاریخ گواہ ہے کہ بہت بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں، دینی علوم میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے صحابہ کرام ان سے استفادہ کرتے تھے، ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بہت سے مشکل مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

حضرت مسروق تابعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ میراث کے مسائل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا کرتے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ پر جب بھی کوئی مشکل مسئلہ آپڑتا تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور ان کے پاس اس بارے میں ضرور کوئی علم ہوتا۔

حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں میں سب سے بڑی خواتین کا علم تھیں۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر تمام ازواج مطہرات کا اور تمام خواتین کا علم جمع کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم سب پر بھاری ہوگا۔ (۱)

یاد رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف علوم شرعیہ تک ہی اپنے کو محدود نہیں فرمایا تھا؛ بل کہ دیگر علوم میں بھی انہوں نے مہارت حاصل کی تھی۔ حضرت عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہوتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ میں نے علم طب (ڈاکٹری) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ نیز فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا عالم تفسیر میں کسی کو دیکھا، نہ میراث میں، نہ فقہ میں، نہ شعر و شاعری میں، نہ طب میں، نہ تاریخ عرب میں اور نہ علم نسب میں۔ (۲)

اسی طرح حضرات ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بلند پایہ محدثہ و فقیہہ ہوئی ہیں، ان سے (۳۷۸) احادیث مروی ہیں اور انہوں نے جو فتوے دئے وہ بھی اتنے ہیں کہ بقول ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ان سے ایک رسالہ بن سکتا ہے۔ (۳)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بڑے بڑے حضرات نے حدیث کی روایت کی ہے، جیسے حضرت اسامہ بن زید، حضرت سلیمان بن یسار، سعید بن المسیب، عبد الرحمن بن ابی بکر، عروہ بن الزبیر، کریب، نافع وغیرہ۔ (۴)

حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن ایک تابعی خاتون ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

(۱) تہذیب التہذیب: ۱۲/۴۳۵، تذکرۃ الحفاظ: ۱/۲۸

(۲) تذکرۃ الحفاظ: ۲۸، تہذیب التہذیب: ۱۲/۴۳۵، المنہل الراوی: ۶

(۳) اعلام الموقعین: ۱/۱۳

(۴) تہذیب التہذیب: ۱۲/۴۵۶

خصوصیت کے ساتھ علم حاصل کیا اور بہت بڑی محدثہ ہوئیں، علمائے محدثین نے ان کو بڑے قابل اعتماد علما میں شمار کیا ہے اور حضرت عبدالرحمن بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ جیسے پایہ کے محدث ان سے حدیث کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والی یہی حضرت عمرہ تھیں۔ (۱)

اس کے بعد کے ادوار میں بھی عورتوں نے اپنے آپ کو علوم سے آراستہ کیا اور قابل قدر اور ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فقہ و حدیث اور علم کلام کے جلیل القدر عالم و امام گذرے ہیں اور ان کا شمار مجتہدین میں ہوتا ہے، انہوں نے جب اپنی مشہور و معروف کتاب ”شرح معانی الآثار“ تالیف کی تو اس عظیم و عجیب و غریب حدیثی تالیف میں ان کی صاحب زادی نے ان کا تعاون کیا، اس طرح کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ املا کراتے تھے اور صاحب زادی لکھتی جاتی تھیں۔ گویا اس حدیثی ذخیرہ کے وجود پذیر ہونے اور منصف شہود پر جلوہ گر ہونے میں ایک خاتون کا ہاتھ ہے۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فن فقہ کے ایک ممتاز امام ہیں جن کی کتاب ”بدائع الصنائع“ فقہ کا ایک لا جواب ذخیرہ ہے، ان کی زوجہ محترمہ، بہت بڑی فاضلہ اور فقیہہ تھیں۔ اور خود علامہ کاسانی کے استاذ محترم کی صاحب زادی تھیں، ان کے استاذ نے شاگرد کے علم و تقویٰ و طہارت کو دیکھ کر اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی تھی۔ اس پردہ نشین خاتون کے علم و تفقہ کا یہ عالم تھا کہ علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والے ہر فتویٰ پر ان کا بھی دست خط ہوتا تھا، اور لوگ اس فتویٰ کا اعتبار نہ کرتے تھے جس پر

ان کا دست خط نہ ہو۔

نویں صدی ہجری کی ایک ممتاز خاتون ام ہانی مریم بنت نور الدین ہیں، ان کا گھر علم و فن، شعر و ادب کا گہوارہ تھا اور متعدد افراد اس خاندان کے محدثین شمار ہوتے ہیں۔ ان کے نانا قاضی فخر الدین رحمۃ اللہ نے ان کی تربیت کی تھی، سب سے پہلے انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا، پھر فقہ و ادب میں دست گاہ بہم پہنچائی پھر ان کے نانا ان کو مکہ مکرمہ لے گئے جہاں شیوخ حدیث سے ان کو حدیث کا سبق دلایا، مصر و حجاز کے بیشتر ممتاز محدثین سے استفادہ کیا، صحاح ستہ کی تمام کتب انہوں نے محدثین سے سنی تھیں پھر مسند درس پر فائز ہوئیں، حافظ سخاوی رحمۃ اللہ جیسا بلند پایہ امام حدیث ان کا شاگرد ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ عورت اگر چاہے تو علمی میدان میں بہت کچھ کر کے اپنا نام روشن کر سکتی ہے، اور مخلوق کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

ایک انتباہ: مگر ایک بات پر تنبیہ کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ تحصیل علم خواہ دینی ہو یا دنیوی، شرعی حدود کے دائرہ میں ہونا چاہئے۔ مثلاً عورت کے لیے چوں کہ پردہ ضروری ہے، اس لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو بے پردگی اور بے حیائی اور لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط ہو رہا ہے، اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

غرض اسلام تعلیم کا مخالف نہیں؛ بل کہ وہ تو ترغیب دیتا ہے، ہاں! حدود شرعیہ میں رہنے کی وہ ضرورت تاکید کرتا ہے۔

(۱) بہ حوالہ خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ: ۷۶

عورت اور سیاسی و ملی خدمات

رہا عورت کا سیاسی و ملی خدمات و سرگرمیوں کا مسئلہ تو اس میں کچھ تفصیل ہے۔ عورت کا امامت و امارت کے منصب پر فائز ہونا تو تقریباً بہ اتفاق علما حرام و ناجائز ہے جیسا کہ اوپر اس پر کلام کر چکا ہوں؛ بل کہ امارت کے لیے انتخاب میں جن اہل حل و عقد لوگوں کو اختیار حاصل ہے، بہ اتفاق علما اس میں بھی عورت کا کوئی حصہ نہیں۔ امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی رحمہ اللہ نے ”غیاث الامم“ میں لکھا ہے:

فما نعلمہ قطعاً، ان النسوة لا مدخل لهن في تخییر الإمام
وعقد الإمامة فانهن ما روجعن قط ولو استشير في هذا
الأمر امرأة لكان احرى النساء واجد رهن بهذا الأمر فاطمة
ؑ ثم نسوة رسول الله ﷺ أمهات المؤمنین
ونحن بابتداء الأذهان نعلم أنه ما كان لهن في هذا المجال
مخاض في منقرض العصور ومکر الدهور. (۱)

(یہ بات قطعی طور پر جانتے ہیں کہ عورتوں کو امام کے انتخاب میں اور امارت کے قائم کرنے میں کوئی دخل نہیں ہے؛ کیوں کہ ان سے کبھی اس سلسلہ میں رجوع نہیں کیا گیا، اگر اس معاملہ میں کسی عورت سے مشورہ کیا جاتا تو اس کے لیے عورتوں میں سب سے زیادہ لائقہ و فائقہ حضرت فاطمہ ؑ ہوتیں پھر حضرات ازواج مطہرات امہات المؤمنین رحمہن اللہ حالاں کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں ان کو کسی زمانہ میں بھی کوئی دخل نہ تھا)

(۱) غیاث الامم: ۶۲ فقرہ ۷۳

غرض امارت اور اس کے انتخاب میں تو عورتوں کو اسلام نے الگ ہی رکھا ہے اور آج کا جدید ذہن بھی اور جدید تجربات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں، ہم یہاں اس سلسلے میں صرف ایک حوالہ نقل کرتے ہیں جس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔

ٹائمز آف انڈیا (نئی دہلی) نے اپنی اشاعت بابت ۱۲ اگست ۱۹۸۷ء میں یہ خبر شائع کی ہے کہ:

۱۹۸۷ء میں امریکہ میں خاص اس مسئلے پر لوگوں کی رائے معلوم کی گئی، معلوم ہوا کہ امریکی ووٹروں کی تقریباً ایک تہائی تعداد خیال کرتی ہے کہ امریکہ کا صدر بننے کے لیے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ موزوں ہیں۔ رائے دینے والوں میں صرف آٹھ فی صد تعداد ایسی تھی جس کا خیال تھا کہ وائٹ ہاؤس کے عہدہ کے لیے عورت زیادہ بہتر ہو سکتی ہے، ۴۹ فی صد نے کہا کہ دونوں جنسوں میں کوئی فرق نہیں اور ۳۱ فی صد نے خیال ظاہر کیا کہ مرد صدر بننے کے لیے زیادہ اکمل و موزوں ہے۔ (۱)

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے درمیان بہت سے اعتبارات سے فرق رکھا ہے، اس کا بھی تقاضا بھی یہی ہے کہ عورت جیسی نازک صنف اس ذمہ داری سے دور ہی رکھی جائے۔ البتہ دیگر ملی مسائل میں ان کی رائے اور مشوروں کا احترام کیا جائے گا اور بعض ایسے کام و خدمات بھی ان کے سپرد کیے جاسکتے ہیں جو وہ حدود شرعیہ کے اہتمام کے ساتھ اور ان کے دائرے میں رہتے ہوئے سرانجام دے سکتی ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض ازواج مطہرات، خلفائے راشدین کے زمانہ میں برابر ملی مسائل میں حصہ لیتی تھیں اور اپنی قیمتی آرا سے فائدہ بھی پہنچاتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر ان کے قصاص کے سلسلے میں جو موقف اختیار کی ہوئی تھیں اور اپنے موقف پر دیگر اصحاب الرائے کو جس طرح پر جمع فرمایا تھا اور اس میں وہ جیسی کچھ مضبوط تھیں، تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں، پھر انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جہاد بھی اسی مسئلے پر کیا تھا جس کو تاریخ میں ”جنگ جمل“ سے یاد کیا جاتا ہے۔

نیز یہ واقعہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ عورتوں کا مہر زیادہ نہ باندھو۔ تو ایک عورت جو مجمع میں تھی، اس نے اس پر ٹوک دیا اور کہا کہ آپ کو اس کا حق نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت نے سچ کہا اور مرد نے غلطی کی۔ (۱)

یہ ایک ملی مسئلہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملی بہبود کے پیش نظر لمبے چوڑے مہر باندھنے سے منع فرما رہے تھے؛ مگر ایک عورت نے اپنی رائے قرآن کی روشنی میں اس سے مختلف پیش کی اور وہ دربار خلافت میں منظور کر لی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گشت کرتے جا رہے تھے، رات کا وقت تھا، ایک گھر سے ایک عورت کے اشعار پڑھنے کی آواز آئی جن میں عشقیہ مضمون تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے پوچھا کہ تجھ کو کیا ہوا کہ زور سے اشعار پڑھ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ میرا شوہر آپ کے حکم پر جہاد میں گیا ہوا ہے، اس کی یاد میں یہ اشعار پڑھ رہی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو صبر کے لیے کہا اور حضرت ام المؤمنین حفصہ

ﷺ کے پاس آئے اور مشورہ کیا، پوچھا کہ عورت اپنے شوہر کے بغیر کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے شرم سے سر جھکا لیا، آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ حق بولنے سے نہیں شرماتا، بولو، کہ عورت بغیر شوہر کتنے دن رہ سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ چار یا چھ مہینے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام علاقوں میں فرمان بھیج دیا کہ فوجیوں کو چار ماہ سے زیادہ نہ روکا جائے۔ (۱)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو اسلام نے حق رائے دہی دیا تھا اور وہ دور اول میں پوری آزادی کے ساتھ اس کو استعمال کرتی تھی اور اس کی رائے کا احترام بھی کیا جاتا تھا اور اس کو قبول بھی کیا جاتا تھا۔

اسی طرح حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے وہ ملی خدمت بھی انجام دینے کی اہل مانی گئی ہے، حضرت شفاء رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ خاتون ہیں جن کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے ایک جگہ مہاجرات میں سے بتایا ہے، ابن حبان رحمۃ اللہ نے کہا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت حاصل ہے، یعنی وہ صحابیہ تھیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہ روایت کرتی ہیں، ان کے بارے میں ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے اور ان کے مشوروں کو قبول کرتے اور بسا اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بازار کے معاملات کا نگران بھی مقرر کیا ہے۔ (۲)

نیز ہمارے فقہانے لکھا ہے کہ عورت اوقاف کی نگران ہو سکتی ہے اور یتیموں کی وصی بھی اس کو بنایا جاسکتا ہے۔ (۳)

(۱) کنز العمال: ۳۰۸/۸

(۲) تہذیب التہذیب: ۴۲۸/۱۲

(۳) البحر الرائق: ۵/۷، درمختار مع شامی: ۴۴۰/۵

غرض یہ کہ عورت کو ایسے مناصب اور عہدے سپرد کیے جاسکتے ہیں جن کو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے انجام دے سکتی ہے اور وہ ان مناصب میں آزاد نہ ہو؛ بل کہ کسی کے زیر نگرانی اور مشورہ کرنے کی پابند ہو، یہی وجہ ہے کہ عورت کو قاضی بنانے کی اجازت نہیں۔ چوں کہ اس عہدے میں عورت حدود شرعیہ کی پوری رعایت نہیں کر سکتی، پھر وہ کوئی غلط فیصلہ کر دے، اس لیے قضا کا عہدہ عورت کے لیے جائز نہیں قرار دیا گیا۔

آج کل جو کونسلر (COUNSELER) ایم، یل اے وغیرہ کی عہدے داریاں ہیں، ان میں بھی ظاہر ہے کہ عورت حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے ان خدمات کو انجام نہیں دے سکتی، پھر ان میں ایک قسم امارت کا بھی شائبہ ہے، لہذا عورت کو ان مناصب و عہدوں کے لیے ووٹ میں حصہ لینا بھی جائز نہیں اور نہ اس کو ووٹ دینا جائز ہے۔

عورت اور ووٹ، ایک واقعہ

یہاں ایک اس واقعہ کا ذکر کرنا بھی عبرت کا سبب ہوگا کہ ۱۹۹۶ء میں جب بنگلور میں سٹی کارپوریشن انتخابات ہونے جا رہے تھے، تو بعض حضرات نے احقر سے اس بارے میں فتویٰ پوچھا کہ عورت کا ووٹ میں حصہ لینا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے اس کے حق میں ووٹ دینا کیسا ہے؟ احقر نے عدم جواز کا فتویٰ تحریر کر دیا، اس الیکشن میں بنگلور کے شواجی نگر حلقہ سے ممتاز بیگم نامی خاتون نے بھی حصہ لیا تھا جو ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران ڈپٹی میر بھی رہ چکی تھیں، میرا فتویٰ بعض حلقوں کی طرف سے اسی دوران کثیر تعداد میں عوام کے درمیان تقسیم کیا گیا، خیر الیکشن کے چند دنوں بعد ممتاز بیگم کی طرف سے ان کے وکیل محمود پٹیل نے میرے نام ایک لیگل نوٹس جاری

یہ سب جو ہوتا ہے دنیا داری کا نشہ اس کا باعث ہے۔ غور کریں کہ ملک کو سیکولر بنانے کے بعد شرعی فتویٰ کے خلاف آواز اٹھانا کیا عقل و انصاف کی موت نہیں؟ سیکولر آخر کس کو کہتے ہیں؟ اس کو جہاں شرع کا قانون نہ بیان کیا جاسکے؟ پھر جو عورت یا مرد شرعی قانون سے ٹکر لینے کی کوشش کرے اور اس کو نقصان دہ قرار دے، اس کے ایمان کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عورت کی خدمات کا ایک وسیع دائرہ سماجی خدمات کا میدان ہے، سماج اور معاشرہ کی فلاح و بہبودی کے لیے جدوجہد اور سعی و کوشش ہر فرد معاشرہ کا فریضہ ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، لہذا سماجی خدمات کا میدان جس طرح مردوں کے لیے کشادہ ہے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس میں پوری پوری گنجائش ہے۔

اگر عورت نے میڈیکل کر رکھا ہے تو اس کے لیے مریضوں کی خدمات کا بہترین

موقعہ ہے، خصوصاً عورتوں کے امراض اور مشکلات میں وہ اس کی پوری مدد و نصرت کر سکتی ہے۔ حضرات صحابیات کے بارے میں آتا ہے کہ وہ جہاد میں زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی کا کام کرتی تھیں، نیز زخموں کو پانی پلاتی تھیں اور مقتولوں کو میدان سے اٹھا کر لایا کرتی تھیں۔

چنانچہ حضرت ربیع بنت معوذہؓ فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں جاتی تھیں، پس لوگوں کو پانی پلاتی اور ان کی خدمت کرتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور مقتولوں کو اٹھالاتی تھیں۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا (والدہ انس) اور انصار کی چند عورتوں کو غزوہ میں لے جاتے تھے جو پانی پلایا کرتی تھیں۔ (۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنگ احد کے دن جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر ہٹ گئے، تو میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اپنے دامن کو اٹھائے ہوئے پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے لا رہی تھیں پھر پیاسے لوگوں کو پلاتی تھیں پھر لوٹ کر پانی لاتی تھیں اور پلاتی تھیں۔ (۳)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی غزوات میں شرکت کی ہے، زخمیوں کی مرہم پٹی و علاج کرتی اور غازیوں

(۱) بخاری: ۴۰۳/۱

(۲) ترمذی: ۱/۹۸۶، مسلم: ۲/۱۱۶

(۳) بخاری: ۴۰۳/۱، مسلم: ۱۱۶/۲

کے لیے کھانا بناتی، ان کے سامان کی حفاظت اور مریضوں کی نگرانی کرتی تھی۔ (۱)

ان روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ غزوات میں حضرات صحابیات متعدد خدمات انجام دیتی تھیں، غازیوں کے لیے کھانا بنانا، زخمیوں کا علاج کرنا، پانی کا بندوبست کرنا، شہیدوں کے لاشوں کو اٹھالانا غازیوں کے سامان کی حفاظت کرنا وغیرہ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قبل جب فساد یوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا اور ان پر ضروریات زندگی مسدود کر دی گئی تھی، تو حضرت صفیہ بن حنی بن اخطب رضی اللہ عنہا زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مدد کے لیے خچر پر سوار ہو کر تشریف لے گئیں؛ مگر راستہ میں اشتر نے ان کو دیکھ کر راستہ روک لیا اور وہ واپس آ گئیں اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا، وہ ان کے مکان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا پانی لے جاتے تھے۔ (۲)

بہر حال عورت حدود شریعہ کی رعایت کرتے ہوئے سماجی خدمت انجام دے تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

ڈاکٹر کا ذکر یہاں ہم نے یہاں محض تمثیلاً کیا ہے ورنہ سماجی خدمات کے لیے بہت سارے شعبے ہیں عورت کے حالات اور مزاج سے جو ہم آہنگ ہو اور حدود شریعت کی رعایت و حفاظت بھی اس میں پورے طور پر ہوتی ہو۔ ایسا شعبہ خدمت وہ خود انتخاب کر سکتی ہے۔

عورت اور معاشی سرگرمی

رہا عورت کے لیے معاشی سرگرمی کا مسئلہ، تو اس سلسلے میں اولاً ایک بات بہ طور

(۱) دارمی: ۱۷۳/۲

(۲) اہل کتاب صحابہ و تابعین: ۱۳۹

اصول سمجھ لینا چاہئے وہ یہ:

اسلام نے عورت کو معاشی ذمے داری سے سبک دوش کر دیا ہے اور اس کے معاش کی پوری ذمے داری مرد پر ڈالی ہے۔ چنانچہ عورت کبھی بیٹی کی حیثیت سے باپ کا نفقہ پاتی ہے اور کبھی بیوی کی حیثیت سے شوہر سے نفقہ وصول کرتی ہے اور باپ نہ ہو تو بھائی وغیرہ اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ اسلام نے اس کے معاش کا مسئلہ اس پر عائد ہی نہیں کیا۔ اسی طرح اس کے بچوں کا نفقہ و خرچہ بھی اس پر نہیں؛ بل کہ اس کے شوہر پر رکھا گیا۔ جب یہ بات ہے تو عورت کو خواہ مخواہ اس میدان میں کودنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

اصل میں یہ سوال ان حلقوں اور طبقوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے جو مغرب زدہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں اور مغربی تہذیب اور مغربی معاشرہ کی آزادی اور فکری بے راہ روی اور جنسی انارکی و عریانی و بے حیائی کو ایک فیشن سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ بات افسوس ناک دکھائی دیتی ہے کہ اسلامی معاشرہ گھر میں بند رہے اور شوہر اور بچوں کی خدمت کرتی رہے اور بازاری دنیا سے نیاز رہے۔ لہذا وہ چاہتے ہیں کہ مغربی معاشرہ کی طرح ہماری عورتیں بھی باہر نکلیں اور آزادانہ گھومیں پھریں اور مردوں کے دوش بہ دوش کام کریں۔

مگر یہ بات ان کے ذہنوں سے یکسر فراموش ہو جاتی ہے کہ مغرب نے عورت کو باہر نکال کر اس کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی ہے؛ بل کہ اس پر ایک بہت بڑا ظلم کیا ہے، اسلام نے اس کو گھر بٹھائے کھانے پینے اور اس کی تمام ضروریات کا انتظام اس طرح کر دیا کہ ان سب کی ذمے داری مرد پر ڈال دی؛ مگر مغربی مکار ذہنیت نے یہ سوچا کہ عورت کو کیوں گھر بیٹھے کھلایا پلایا جائے؟ نہیں، اس کو بھی باہر نکالو، اس کے

دو فائدہ ہیں، ایک تو یہ کہ عورت کی جنسی خواہشات کی پورا کرنے میں پوری آزادی ملے گی اور ہوس ناک طبیعتوں کو شکار بہ آسانی فراہم ہو جائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ عورت خود کمائے اور کھائے گی، مرد کے ذمے سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ تھی وہ شاطرانہ و عیارانہ ذہنیت جس نے ”معاش“ کے عنوان پر عورت کو باہر نکالا۔ بتاؤ کہ یہ کیا اس پر ظلم عظیم نہیں ہے؟

دوسری بنا اس سوال کی یہ ہے کہ آج کل مادیت کو پورا پورا تسلط حاصل ہو گیا ہے اور لوگوں کے قلوب و اذہان، دنیوی اسباب و سامان، مادی آرائش و زیبائش، مختلف قسم کے زرق و برق لباس و پوشاک، قسم قسم کے ماکولات و مشروبات اور فلک بوس عمارت کے عادی اور ان سے مرعوب و متاثر ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہر کس و ناکس ان کی طلب و جستجو اور ان کی فکر میں لگا ہوا ہے اور زیادہ سے زیادہ کمانے اور جمع کرنے اور ان مادی اسباب و سامان کو حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے عورتیں بھی مردوں کے دوش بہ دوش کام کرنا، کمانا چاہتی ہیں اور مرد بھی عورتوں کے ذریعہ معاشی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس سوال کی بنیاد مادیت کا غلبہ اور عیش پسندی کا جذبہ اور آخرت سے غفلت ہے۔ اور اسلام میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت تو کیا؛ بل کہ ان کی مذمت و برائی ہے۔ لہذا ان چیزوں کی بنیاد پر جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ بھی کوئی قابل التفات و لائق توجہ نہیں۔

البتہ یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو فطری اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے اور اس کا جواب اسلامی تعلیمات و احکامات کی روشنی میں تلاش کرنا ضروری ہے، وہ سوال یہ کہ بعض اوقات عورتوں کو ایسی مجبوریاں اور پریشانیاں آگھیرتی ہیں کہ معاشی جدوجہد ان کے لیے لازم ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی لاوارث عورت ہے اور کوئی بھی اس

کا پرسان حال نہیں، یا کوئی عورت ایسی ہے کہ اس کا شوہر اس کا اور اس کے بچہ کا نفقہ اور خرچہ چلانے تیار نہیں، یا شوہر معذور ہے جو کمانے کی قوت و استعداد نہیں رکھتا اور ایسی عورت جو اپنے اور اپنے بچوں کی گزارے کا اور معذور شوہر کے گزارے کا بند و بست نہ کرے تو یہ عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے اور شریعت بھی اس کی تائید نہیں کر سکتی۔ لہذا کیا ایسی عورت معاشی جدوجہد اور کوشش کر سکتی ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حجاب کے تمام ضروری شرائط و قیود کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی مجبوری اور پریشانی کا حل نکالنے کے لیے عورت معاشی سرگرمی اختیار کر سکتی ہے؛ مگر یاد رہے کہ ایک یہ استثنائی صورت ہوگی نہ کہ حکم عام۔

اس کی دلیل مندرجہ ذیل روایات ہیں:

حضرت رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی کی کمائی سے منع فرمایا؛ مگر وہ جو وہ اپنے ہاتھ سے کمائے (اس کی اجازت ہے) پھر آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ جیسے روٹی پکانا، سوت کا تنا، روٹی دھنا وغیرہ۔^(۱)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مطلقہ ہوئیں، انہوں نے چاہا کہ اپنے باغ سے کھجور توڑیں، اس پر ان کو ایک شخص نے زجر کیا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور سوال کیا تو آپ نے اجازت دی اور فرمایا کہ امید ہے کہ تم اس سے صدقہ کرو یا کوئی اور نیک کام کرو۔^(۲)

علمائے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ طلاق یافتہ عورت عدت میں حاجت و ضرورت کے پیش باہر نکل سکتی ہے۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع

(۱) ابو داؤد: ۴۸۶/۲

(۲) مسلم: ۴۸۴/۱، دارمی: ۱۳۸/۲، نسائی: ۱۱۹/۲، ابو داؤد: ۳۱۴/۱

بطورِ تکمیلِ فائدہ یہاں عرض کر دوں کہ یہ حدیث طلاق یافتہ عورت کے بارے میں ہے (جیسا کہ معلوم ہوا)؛ مگر امام نسائی نے اس پر باب و عنوان باندھا ہے کہ ”باب الخروج المتوفی عنها بالنهار“ (باب اس عورت کے دن میں نکلنے کا جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا)

حالاں کہ حدیث میں بیوہ عورت کا ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ امام نسائی اس حدیث سے بیوہ عورت کا حکم بھی مستنبط فرما رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ مطلقہ عورت کو تو اسلام میں عدت کا نفقہ و خرچہ بھی ملتا ہے؛ مگر شوہر کی وفات پر بیوہ کو عدت کا نفقہ نہیں ملتا جب نفقہ ملنے کے باوجود مطلقہ عورت بہ ضرورتِ معاش باہر نکل سکتی ہے تو بیوہ کا نکلنا بہ درجہ اولیٰ درست ہے۔ (۱)

(۳) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی وہ اپنا قصہ سناتی ہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے نکاح کیا تو ان کے پاس سوائے ایک اونٹ اور ایک گھوڑے کے نہ کوئی مال تھا اور نہ کوئی غلام تھا اور نہ کوئی چیز تھی، میں ہی گھوڑے کے لیے گھاس لاتی تھی اور میں ہی پانی بھی لایا کرتی تھی اور ڈول سینچتی تھی اور آٹا گوندھتی تھی؛ لیکن روٹی پکانا ٹھیک سے نہ آتا تھا تو میری انصاری پڑوسن عورتیں پکا دیا کرتی تھیں اور میں زبیر کی اس زمین سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی، اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں اٹھا کر لایا

غرض ان استثنائی مثالوں سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بہ ضرورتِ معاش تگ و دو میں عورت لگ سکتی ہے؛ مگر مغربی تہذیب کی طرح عورت کا معاشی سرگرمی کو مستقل اختیار کر لینا اسلامی مذاق و مزاج سے کوئی ہم آہنگی نہیں رکھتا۔

”ایک ایسی ماڈل ٹائپ گرل کی ضرورت ہے جو مرغی کے انڈوں پر

سوڈا راجرت دی جائے گی اور کام کے ختم پر ایک ہزار ڈالر بہ طور انعام

ملے گا۔

معلوم ہے کہ اشتہار کے جواب میں ایسی جلیل القدر خدمت کے لیے سات سو

سے زائد درخواستیں موصول ہوئیں۔ (۱)

مولانا تقی امینی جَفِیْظَةُ اللہ نے مغرب کے اس حیا سوز معاشرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس کو (عورت کو) بزمِ عیش کا کھلونا بنایا، اس کے شیشہ دل کو اپنی مشین کا پرزہ بنایا، اس کے آگینہ عصمت کو فولا دی مسان پر چڑھایا، اس کے معصوم حسن کو نمائش کے بازار میں فروخت کیا اور جب ان سب میں وہ بے زبان نکلی تو مرغیوں کی طرح اس کو انڈے سینے پر لگایا۔ (۲)

عورت اور دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی طرف دعوت اہل اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور اس ذمے داری میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں، لہذا عورت کی خدمات کا ایک اہم دائرہ اور میدان دعوت و تبلیغ بھی ہے اور اس ذمے داری میں بھی ان کے شریک اور سہیم ہونے پر یہ آیت بڑی ہی واضح ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿التَّوْبَةُ: ٧١﴾

(مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں

(۱) اسلام اور دور جدید کے مسائل، مولانا تقی امینی: ۲۷۲

(۲) ایضاً

اس آیت میں مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں دونوں کی صفات و اعمال کا ذکر ہے اور ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر سب سے مقدم ہے۔

معلوم ہوا کہ مؤمن مرد اور عورت کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ اپنی اصلاح کے بعد سب سے پہلے دوسروں تک پیغام حق کو پہنچانے اور معروفات کی اشاعت کرنے اور منکرات کے ختم کرنے کی فکر کریں۔ البتہ مرد کی اس خدمت کا دائرہ اور ہوگا اور عورت کا دائرہ خدمت اور ہوگا۔ عورت کو زیادہ تر اپنے گھر کے افراد، بچوں، شوہر، بھائی، بہن کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ بچوں کی اصلاح سب سے مقدم ہے کہ وہ اس کے ماتحت ہیں اور اس پر ہم گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

شوہر کو معروف کی راہ پر ڈالنا اور منکرات سے بچانا بھی عورت کی ذمہ داری ہے اور یہ کام کرنے والی عورت اللہ و رسول کی نظر میں بہت ہی بڑے مقام و مرتبہ کی عورت ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ رحم کرے اس عورت پر جو رات کے ایک حصہ میں بیدار ہو اور نماز پڑھے، پھر اپنے خاوند کو بیدار کرے اور اگر نہ اٹھے، اس کے چہرے پر یانی چھڑک دے۔“ (۱)

(۱) ابوداؤد: ۱/۱۱۵، نسائی: ۱/۲۳۹

شفاء القلوب

بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا
نہنگ واژ دھا و شیر نر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

تقریظ

حضرت استاذی محمد سلمان صاحب گنگوہی دامت برکاتہم
استاذ حدیث جامعہ اشرف العلوم گنگوہ و خلیفہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء
والمرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين. اما بعد
زیر نظر رسالہ ”شفاء القلوب“ مؤلفہ مولانا شعیب اللہ صاحب زید مجدہم مہتمم
مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور کا مسودہ مختلف مقامات سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رسالہ
اصلاح قلب کی ضرورت و اہمیت اور اس مسئلہ میں قرآن و حدیث اور بزرگان سلف
کی تعلیمات و ہدایات پر مشتمل ہے جو اس دور پر فتن میں از حد ضروری ہے، کیونکہ آج
اصلاح قلب کے بارے میں عوام تو عوام علما بھی غافل ہیں۔ رسالہ کے تمام مضامین
ماشاء اللہ مفید و مستند ہیں۔

احقر نے مؤلف کی دیگر متعدد تالیفات کا بھی مطالعہ کیا ہے جو ماشاء اللہ خواص
عوام کے لیے بہت ہی مفید ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دیگر تالیفات کی
طرح اس کو بھی مقبول و مفید فرمائے۔

فقط

محمد سلمان عفی عنہ گنگوہی

۱۴۲۱/۲۵/۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقش اولین

حامداً ومصلیاً۔ زیر نظر کتابچہ ”شفاء القلوب“ اصلاحِ باطن و تزکیہ نفس کی ضرورت و اہمیت اور اس کے طریق کار کے متعلق قرآن و حدیث و اقوالِ صحابہ و علما پر مشتمل ایک مختصر تحریر ہے، ابتدا میں محض ایک آٹھ دس ورقی رسالہ کا خیال تھا جو خصوصاً طلبائے مدارس کو اصلاحِ باطن کی طرف متوجہ کرنے کے جذبہ کے تحت پیدا ہوا تھا؛ مگر جب لکھنا شروع کیا تو اس مضمون کی عام ضرورت کا بھی احساس ہوا اور کچھ تفصیل و وضاحت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، کیونکہ سلوک و تصوف کے نام پر جاہل و ملحد پیروں نے عوام کو گمراہ کر رکھا ہے، اور شریعت و طریقت کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر لوگوں کو شریعت سے آزاد کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔

لہذا یہ آٹھ دس ورقی، پچاس ساٹھ ورقی بن گیا، گویا سمجھنا چاہئے کہ آٹھ دس ورقی متن کی شرح پچاس ساٹھ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ناکارہ علم و عمل کو اور تمام مسلمانوں کو ہر قسم کی جسمانی و روحانی بیماریوں سے نجات عطا فرمائے اور اس تحریر کو شرفِ قبولیت سے مشرف فرمائے اور نافع و مفید بنائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۷ اگست ۲۰۰۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن وحدیث سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح بدنی امراض، انسان کو لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح قلبی امراض کا بھی وہ شکار ہوتا ہے اور اس پر ضروری ہے کہ ان امراض کے ازالہ کی فکر کرے اور اپنے قلب کو صحت مند بنائے؛ مگر آج عجیب حالت ہے کہ ہم کو بدنی امراض کے لاحق ہونے پر اس کے علاج و ازالہ کی جتنی فکر ہوتی ہے، اس کی عشر عشر بھی روحانی قلبی بیماریوں کے علاج معالجہ اور اس کے ازالہ و اصلاح کے لیے نہیں ہوتی؛ بل کہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی طرف کوئی توجہ و التفات ہی نہیں ہوتا؛ بل کہ ہم ہزاروں امراض روحانیہ و قلبیہ کا شکار ہونے کے باوجود، اپنے آپ کو بیمار ہی نہیں سمجھتے؛ بل کہ بہتوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ روحانی بیماریاں کیا ہیں؟ جن کی اصلاح اور علاج کی ضرورت ہے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہی ہے اور ہونا چاہئے کہ روحانی بیماریوں کی معاشرے میں بہتات ہو اور معاشرہ ان بیماروں سے متعفن و فاسد ہو جائے، نیز یہ بیماریاں متعدی ہو کر ان کے شکار ہونے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے، پھر صحت مند بھی ان کی لپیٹ میں آتے رہیں۔ چنانچہ یہی سب کچھ ہو رہا ہے، اور ان بیماریوں کے اثرات مساجد، مدارس، خانقاہوں، علماء، حفاظ، مشائخ اور دینداروں سب تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ صورت حال کس قدر لرزہ خیز اور تباہ کن ہے، اس کا اندازہ بھی وہی کر سکیں گے، جو ان قلبی امراض کی ہلاکت خیزیوں سے واقف ہوں، ورنہ ان امراض کی وجہ سے جن کے قلوب و اذہان ماؤف و بے حس ہو چکے ہوں، وہ اس کا اندازہ بھی نہ کر سکیں گے۔

الغرض امراضِ قلوب کا معلوم کرنا اور پھر ان کے ازالہ و علاج کی تدبیر کا جاننا اور اس پر عمل کر کے اپنے قلوب کو پاک و صاف، مجلی و مصفیٰ بنانا ضروری ہے۔
اس مختصر تحریر میں اسی سے متعلق چند گذارشات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔
واللہ الموفق والہادی الی سواء السبیل۔

قلبی امراض کا ثبوت

قرآن وحدیث سے پتہ چلتا ہے کہ امراض جس طرح بدنی ہوتے ہیں، اسی طرح قلبی بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ﴾ (البقرة: ۱۰۱)

(ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے۔)

اس آیت میں منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے دلوں میں مرض ہے، اس مرض سے مراد شک و نفاق یا انکار و تکذیب ہے۔^(۱)

اسی طرح متعدد آیات میں منافقین کے بارے میں یہ بات بتائی گئی ہے۔
ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ﴾

(الاحزاب: ۶۰/۲۲)

(اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے باز نہ آئیں۔)

اس جگہ منافقین کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے دل بیماری میں مبتلا ہیں، معلوم ہوا کہ یہاں ان لوگوں سے مراد منافقین کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں۔
مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جن کے اندر ایمان قوی و مضبوط

نہیں ہوا تھا، بلکہ ضعفِ ایمان کا وہ شکار تھے۔ (۱)

اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد زنا کار لوگ ہیں۔ (۲)
معلوم ہوا کہ ضعفِ ایمان اور شہوت پرستی کا جذبہ قلبی مرض ہے، جس کو یہاں
ذکر کیا گیا ہے۔

اور ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾

(الْخَزَائِفَ : ۲۲/۲۳)

(عورتیں) (غیر مردوں سے) بات چیت میں نرمی اختیار نہ کریں کہ
کہیں وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے طمع و لالچ نہ کرے۔
اس آیت میں مرض سے مراد فسق و فجور کی طرف میلان اور شہوت رانی کی ہوس
ہے۔ (۳)

نیز حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ

كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. » (۴)

(خبردار کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا
جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد و خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم
فاسد و خراب ہو جاتا ہے اور خبردار کہ وہ دل ہے۔)

(۱) روح المعانی: ۹۰/۲۲

(۲) ابن کثیر: ۵۳۵/۳

(۳) قرطبی: ۷۷۱/۱۲

(۴) بخاری: ۱۳/۱، مسلم: ۲۸/۲

اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جسم کی طرح قلب بھی صلاح و فساد، صحت و بیماری سے متصف ہوتا ہے، نیز حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ، الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ. لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ. » (۱)

(تم میں پہلے گزری ہوئی امتوں کی بیماری سرایت کر گئی ہے، یعنی حسد و بغض، وہ مونڈنے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ بال مونڈتی ہے، بلکہ دین کو مونڈتی ہے۔)

اس حدیث میں حسد و بغض کو بیماری فرمایا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ بیماری اگر ہے تو دل کی بیماری ہے نہ کہ جسم کی بیماری۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

« إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَا جَلِئُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ. » (۲)

(یہ دل اس طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب کہ اس کو پانی پہنچے، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کی صفائی کیا ہے؟ فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن شریف کی تلاوت کرنا۔)

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ دل پر زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے

(۱) مشکوٰۃ: ۴۲۸

(۲) مشکوٰۃ شریف: ۱۸۹

معلوم ہوا کہ دل کو بھی روگ و بیماری لگتی ہے۔ اس حدیث میں دل کے زنگ سے کیا مراد ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ مرقات میں لکھتے ہیں۔

”أی تعرض لها دنس بتراکم الغفلات وتزاحم الشهوات“
(یعنی دل پر غفلتوں کے ڈھیر لگنے اور شہوتوں کی بھیڑ لگنے سے میل آجاتا ہے۔) (۱)

غرض یہ کہ قرآن سے بھی اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا دل مختلف امراض کا شکار ہوتا ہے۔

امراض قلوب کی فہرست

یہاں مختصر طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ امراض قلوب کیا ہیں؟ امام غزالی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ”احیاء العلوم“ میں ایک فہرست احوال مذمومہ کی پیش کی ہے، وہ سارے احوال مذمومہ ہی دراصل امراض قلوب ہیں۔ یہاں ان کی تلخیص پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- (۱) کینہ (۲) حسد (۳) اپنے لیے علوم مرتبہ کی طلب (۴) اپنی تعریف کی خواہش (۵) دنیا میں لذت اندوزی کے لیے زیادہ رہنے کی خواہش (۶) تکبر و بڑائی (۷) ریاکاری (۸) لالچ و حرص (۹) بخل و کنجوسی (۱۰) دنیا کی رغبت و چاہت (۱۱) لوگوں سے نفرت و عداوت (۱۲) اترانا (۱۳) مال دراؤں کی عظمت کرنا (۱۴) فقیروں کی توہین کرنا (۱۵) فخر و غرور کرنا (۱۶) دنیوی چیزوں میں ایک دوسرے پر سبقت (۱۷) حق سے اکڑنا (۱۸) لایعنی باتوں میں دلچسپی (۱۹) بہت بولنے کی خواہش (۲۰) ڈینگ مارنا (۲۱) مخلوق کے لیے بناؤ سنگار (۲۲) دین کے بارے میں

مداہنت (۲۳) خود پسندی (۲۴) اپنے عیوب کو چھوڑ کر دوسروں کے عیوب تلاش کرنا (۲۵) دل سے آخرت کا غم زائل ہو جانا (۱۶) دل سے خوف و خشیت کا نکل جانا (۲۷) لوگوں کی طرف سے کوئی ذلت کی بات پیش آئے تو سختی سے بدلہ لینا (۲۸) حق کے لیے بدلہ لینے میں کمزوری دکھانا (۲۹) چھپی دشمنی کے باوجود دوستی ظاہر کرنا (۳۰) نعمتوں کے سلب ہو جانے کا اندیشہ نہ کرنا اور بے خوف ہو جانا (۳۱) خدائی فیصلہ سے ناراضگی (۳۲) اپنی نیکیوں اور عبادتوں پر بھروسہ کرنا (۳۳) مکر و فریب سے کام لینا (۳۴) خیانت کرنا (۳۵) لمبی لمبی آرزوئیں باندھنا (۳۶) دل کی سختی (۳۷) بے ہودہ گوئی (۳۸) دنیا پر شاداں و فرحاں اور دنیا کے فوت ہو جانے پر غمگین ہونا (۳۹) مخلوق سے انس اور ان کی جدائی سے وحشت محسوس کرنا (۴۰) ظلم و زیادتی (۴۱) عجلت پسندی (۴۲) شرم و حیا کی کمی (۴۳) لوگوں پر رحم و کرم کا فقدان۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ان احوال و امراض کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ یہ اور اس جیسی کیفیتیں اور حالتیں، بے حیائیوں کے اگنے کی جگہیں اور ناجائز اعمال و حرکات کے جنم لینے کے مقامات ہوتے ہیں۔ (۱)

بعض حضرات صوفیاء نے ان تمام امراض کو دس اصول میں جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الاربعین“ میں اور ”کیمیائے سعادت“ وغیرہ میں ایسا ہی کیا ہے۔ میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ”شریعت و تصوف“ میں دس چیزوں کا ذکر کیا ہے اور وہ سب اس شعر میں درج ہیں۔

خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ دہ چیز بروں کن از دروں سینہ
 حرص و امل و غضب دروغ و غیبت حسد و بخل و ریا و کبر و کینہ
 (ترجمہ: اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا دل مثل آئینہ کے صاف و شفاف ہو
 جائے، تو دس چیزوں کو اپنے دل سے نکال دے اور وہ دس چیزیں یہ ہیں۔
 حرص، و طول امل (لمبی آرزو) غصہ، جھوٹ، غیبت، حسد، کنجوسی،
 ریا کاری، تکبر اور کینہ۔)

اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اربعین میں جن دس امراض کو اصل اور جڑ قرار دیا ہے وہ
 یہ ہیں: (۱) کھانے کی حرص و کثرت (۲) بولنے کی حرص و کثرت (۳) غصہ (۴) بخل
 و کنجوسی (۵) حسد و کینہ (۶) دولت کی محبت (۷) فخر و شہرت و جاہ طلبی (۸) تکبر و بڑائی
 (۹) خود پسندی (۱۰) ریا کاری۔

غرض یہ کہ یہ چند بہت ہی قابلِ توجہ امراض قلبی ہیں۔ جن سے اور بہت سی
 روحانی بیماریاں؛ بل کہ ظاہری بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

باطنی امراض، ظاہری گناہوں کا سبب

چنانچہ مثال کے طور پر حرص و کثرت کلام کو لیجئے، اس ایک روحانی بیماری سے
 جھوٹ، فضول گوئی، غیبت، بہتان طرازی، مذاق و استہزا وغیرہ امراض جنم لیتے
 ہیں، اسی طرح بخل و کنجوسی کی بنا پر آدمی زکوٰۃ و صدقات میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے
 حب مال و حب دنیا سے حرام و حلال کی پرواہ کیے بغیر مال و دولت کے جمع کرنے میں
 لگ جاتا ہے، حسد و کینہ ظلم و زیادتی کا سبب بن جاتے ہیں، اسی طرح غصہ بھی ظلم
 و زیادتی کا باعث بن جاتا ہے اور طول امل (لمبی آرزو) سے کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں،

مثلاً طاعت و عبادت میں سستی، گناہوں سے توبہ میں غفلت، مال کی حرص، دل کی قساوت، آخرت سے غفلت وغیرہ ان تمام کی تفصیل کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ کی کتاب ”منہاج العابدین“ بے نظیر کتاب ہے اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔
غرض یہ کہ ایک روحانی بیماری کئی اور روحانی و ظاہری بیماریوں کا سبب و باعث بن جاتی ہے۔

مرض کی حقیقت

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مرض کی حقیقت کیا ہے:
علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے اس مقام پر جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ بدن کا مرض یہ ہے کہ بدن کی صحت و صلاح کے خلاف ہو اور وہ بدن میں ایک قسم کا فساد ہے، جس سے بدن کی قوت ادراک و حرکت طبعی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے، کبھی ادراک ہی ختم ہو جاتی ہے، جیسے اندھایا بہرا ہو جانا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس مرض کی وجہ سے اشیاء کو کچھ کا کچھ ادراک کرتا ہے، جیسے میٹھی چیز کو کڑوا محسوس کرتا ہے یا ایسی چیزوں کا تخیل کرتا ہے جن کی خارج و نفس الامر میں کوئی حقیقت نہیں (جیسا کہ بیمار کو ہوتا ہے۔)

اور رہا حرکت طبعی کا فساد تو وہ جیسے قوت ہاضمہ کا کمزور ہونا یا جیسے ان غذاؤں سے نفرت کرنا جن کی ضرورت ہے اور نقصان دہ چیزوں کو پسند کرنا (جیسے عموماً بخار کے وقت ہوتا ہے کہ کھانے کی چیز سے نفرت ہو جاتی ہے اور نقصان دہ چیزوں سے الفت و محبت ہو جاتی ہے۔)

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

”دل کا مرض بھی ایک قسم کا فساد ہے جس سے دل کی قوت ادراک

وقوت ارادہ فاسد ہو جاتی ہے، دل کے تصور و ادراک کا فساد شبہات و شکوک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ آدمی کو حق نظر نہیں آتا یا حق کو اس طرح دیکھتا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہے (یعنی حق باطل نظر آتا ہے اور باطل حق نظر آتا ہے جیسے بعض وقت بیمار میٹھے کو کڑوا اور کڑوے کو میٹھا محسوس کرتا ہے) اور ارادہ کا فساد اس طرح ہوتا ہے کہ نفع بخش حق بات سے بغض ہوتا ہے اور نقصان دہ باطل سے پیار ہو جاتا ہے۔“ (۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دل جب بیمار ہوتا ہے تو اس میں دو قسم کا فساد پیدا ہوتا ہے، ایک فساد دل کی قوت ادراک و احساس میں پیدا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حس و ادراک یا تو ختم ہو جاتا ہے، پھر وہ حق کو دیکھ ہی نہیں سکتا، جیسے اندھا کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (الْحَجَّز: ۴۶)

کیوں کہ بے شک (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہیں، ہاں (ان کے) دل اندھے ہو گئے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

ایک جگہ اور فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ (الْأَعْرَاف: ۱۷۹)

(اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، جن کے دل ایسے ہیں، جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں، جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں؛ بل کہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں، یہ لوگ غافل ہیں۔) (۱)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ دل کا ایک فساد یہ ہے کہ اس کے اندر سے حق کو دیکھنے کی اور قبول کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور دل اندھا ہو جاتا ہے، یا حس و ادراک ختم تو نہیں ہوتا، البتہ اس میں ایسا فساد آ جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی حقیقت کے خلاف محسوس کرتا ہے، حق اس کو باطل نظر آتا ہے اور باطل حق نظر آتا ہے، نافع کو ضار سمجھتا ہے اور ضار کو نافع خیال کرتا ہے، اسی بیماری سے آقائے نامدار حضرت سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور دعا فرمائی ہے:

”اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ.“

(اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھائیے اور اس کی اتباع کی توفیق مرحمت فرمائیے اور باطل کو باطل ہی دکھائیے اور اس سے بچنے کی توفیق دیجئے۔)

اور دوسرا فساد، دل کی قوتِ ارادہ میں پیدا ہو جاتا ہے جس سے قوتِ ارادہ ضعیف و کمزور ہو کر طاعت و عبادت، نیکی و بھلائی کی طرف نہیں چلتا اور اس کے برعکس اس بات کو پسند کرتا ہے کہ شہوات و لذاتِ فانیہ اور برائیوں اور خباثت کی

طرف چلے، جیسے بیمار آدمی کا حالی یہ ہوتا ہے کہ نقصان دہ چیزوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔
فسادِ قلبی سے شیطانیّت، حیوانیت و درندگی پیدا ہوتی ہے

یہیں سے ایک اہم بات یہ سمجھنا چاہئے کہ اس فسادِ قلبی کی وجہ سے انسان میں شیطانیّت، حیوانیت و درندگی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فسادِ قلبی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے دراصل ایک بے اعتدالی کا نام ہے۔ جیسے جسمانی فساد بھی دراصل بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتا ہے جب کہ اخلاطِ اربعہ (خون، بلغم، صفراء، سودا) میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے تو اس سے بیماریاں جنم لیتی ہیں۔

اسی طرح یہ فسادِ قلبی بھی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے جو انسان کی قوتِ عقلیہ اور قوتِ غضبیہ اور قوتِ شہویہ میں بے اعتدالی پیدا کرتی ہے اور ساری برائیاں یہیں سے جنم لیتی ہیں، جب قوتِ عقلیہ میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے اور وہ حد سے باہر ہوتی ہے تو انسان میں دھوکہ بازی، چالاکی و تلبیسی پیدا ہوتی ہے اور یہ شیطانی کام ہے، کیوں کہ شیطان کا کام یہی ہے کہ دھوکہ اور فریب دہی اور تلبیس و ملمع سازی کرتا رہے اور انسان بھی عقل کے حد سے باہر ہونے سے زیادہ چالاکی اور چال بازی کے کام کرتا اور شیطانی افعال و حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی طرح جب قوتِ غضبیہ حدِ اعتدال سے نکلتی ہے تو انسان یا تو بزدلی اور جبن کا شکار ہو جاتا ہے، اگر قوتِ غضبیہ کم ہو گئی۔ یا انسان درندہ اور خون خوار جانور بن جاتا ہے، اگر قوتِ غضبیہ حد سے بڑھ گئی۔ چنانچہ جن کی قوتِ غضبیہ بڑھ جاتی ہے وہ موقع بے موقعہ غصہ سے مغلوب ہو جاتے اور قتل و غارت گری، ظلم و زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ یہی درندگی ہے۔

اور اگر قوتِ شہویہ حد سے نکلی تو انسان جانوروں کی طرح صرف کھانے پینے اور

شہوات و لذات کے پورا کرنے میں لگا رہے گا، جیسے جانوروں کی حالت ہوتی ہے، اس طرح انسان میں شیطانیہ، حیوانیت اور درندگی کی خصلتیں اور خوبو پیدا ہو کر بے شمار بیماریوں اور خباثت کا وہ مجموعہ بن جاتا ہے۔

شیطانیہ سے پیدا ہونے والی برائیاں

مثلاً شیطانیہ جس میں ہوگی تو اس سے اس میں مکاری، عیاری، چال بازی، دھوکہ دہی، حیلہ بازی، آپس میں لڑا دینا، عداوت و بغض ڈالنا، کینہ اور حقہ پیدا کرنا، چغل خوری کرنا، خیانت کرنا وغیرہ امراض و بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کا حرام و ناجائز ہونا کس پر مخفی ہوگا؟

حیوانیت سے پیدا ہونے والی برائیاں

اور حیوانیت جو نام ہے قوت شہوانیہ کی بے اعتدالی کا، اس سے بھی بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں، جیسے اسراف و تبذیر، حرص و لالچ، بے حیائی و بے شرمی، خباثت و پردہ دری، عبث و فضول کاری، چاپلوسی و تملق، حسد و حقہ وغیرہ۔

درندگی کے کارنامے

اور درندگی سے جو برائیاں جنم لیتی ہیں اور کارنامے انجام پاتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔ تکبر و بڑائی، نڈر پن و بے خوفی، عجب و خود پسندی، دوسروں کا استہزا و استخفاف، ظلم و زیادتی، ڈینگ مارنا، گالم گلوچ کرنا، لوگوں کی بے عزتی کرنا وغیرہ۔

اصلاح قلب اور اس کی برکت

یہ تو ہوادل کا فساد اور خرابی، جو بہت ساری خرابیوں اور بیماریوں کا سبب

وباعث بنتی ہے، لیکن اگر اس دل کی اصلاح و علاج ہو جائے اور اس میں اعتدال پیدا کر کے اس کو شیطانیت و حیوانیت و درندگی سے بچالیا جائے تو وہ ملکوتی صفات سے متصف ہو کر ایک لطیفہ ربانی بن جاتا ہے۔

جب قلب ربانی و ملکوتی صفات سے متصف ہو جاتا ہے تو اس کے اندر علم و حکمت، یقین و ایمان، عفت و عصمت، زہد و قناعت، ورع و تقویٰ، شرم و حیا، شرافت و نجابت، صبر و حلم، شجاعت و بہادری، رحم و کرم، شفقت و رحمت، غفور و درگزر، جود و سخاوت، تواضع و انکساری وغیرہ وغیرہ اوصاف و کمالات پیدا ہو جاتے ہیں، اور یہ اوصاف قلب کی حیات و صحت کی علامت ہیں، جس طرح اوپر کی خرابیاں دل کے مریض ہونے کی علامت ہیں۔

ایک حدیث کی تشریح

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ دل کا صلاح و فساد، اعضا و جوارح کے صلاح و فساد کا سبب بنتا ہے؛ اس لیے دل کی اصلاح بہت ہی مہتمم بالشان کام اور نہایت ضروری و اہم ہے، چنانچہ حدیث بھی اسی سلسلہ میں وارد ہوئی ہے:

« أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ

كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. » (۱)

(خبردار کہ بلاشبہ جسم میں گوشت کا ایک ٹوٹھڑا ہے، جب وہ سنور جاتا

ہے تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا

ہے اور ہاں وہ دل ہے۔)

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مضغہ، گوشت کے

ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ گوشت کے ٹکڑے کو مضغہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے منہ میں چبایا جاسکتا ہے (اور مضغ کے معنی چبانے کے ہیں) علما فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مقصود دل کا بنسبت باقی جسم کے چھوٹا ہونا بیان کرنا ہے، حالاں کہ جسم کا صلاح و فساد، دل کے تابع ہے۔ اس حدیث میں دل کی اصلاح کے سلسلہ میں سعی و کوشش کی تاکید ہے۔^(۱)

مشہور محدث علامہ عبدالرؤف المنادی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

جسم میں ایک لوٹھڑا ہے، جب وہ ہدایت سے درست ہوتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے، یعنی اعضا طاعت و نیکی میں استعمال ہوتے ہیں اور جب وہ لوٹھڑا خراب ہو جاتا ہے، یعنی ضلالت و گمراہی سے خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ منکرات میں اعضا کو استعمال کرتا ہے اور وہ لوٹھڑا دل ہے کیوں کہ وہ بدنی حرکات اور نفسانی ارادوں کا مبداء ہے۔ اگر دل سے نیک ارادہ صادر ہوتا ہے تو بدن بھی صالح حرکت سے متحرک ہوتا ہے اور اگر دل سے فاسد ارادہ صادر ہوتا ہے تو بدن بھی فاسد حرکت سے متحرک ہوتا ہے، پس دل بادشاہ ہے اور اعضا اس کی رعیت، اس لیے بادشاہ کے صلاح سے یہ اعضا بھی صالح ہوتے ہیں۔ اور اس کے فساد سے فاسد ہوتے ہیں۔^(۲)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ شریف میں اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

(۱) شرح مسلم: ۲/۲۸

(۲) فیض القدیر للمناوی: ۳/۲۲۴

”فعلى المكلف أن يقبل عليها ويمنعها عن الانهماك
في الشهوات حتى لا يبادر إلى الشبهات ولا يستعمل
جوارحه باقتراف المحرمات.“

(مکلف انسان پر ضروری ہے کہ وہ دل پر توجہ کرے اور اس کو
شہوات میں انہماک سے روکے تاکہ وہ شبہات کی طرف نہ بڑھے اور
اپنے اعضا کو محرمات کے ارتکاب میں استعمال نہ کرے۔) (۱)

ان تمام علما و ائمہ کی عبارات سے معلوم ہوا کہ جسم اور اعضا جسم کے سدھار و بگاڑ
میں اصل اور بنیادی کردار قلب کا ہوتا ہے، وہ اگر صلاح سے آراستہ ہو، ایمانی ایتقانی
و عرفانی انوار سے معمور و منور ہو تو سارے اعضاء و جوارح، طاعت و عبادت نیکی
و بھلائی اور تقویٰ و طہارت سے معمور ہوں گے اور اگر وہ فساد سے ملوث ہو کر ضلالت
و جہالت کی اندھیروں میں بھٹک جائے تو اعضا و جوارح بھی برائی و گمراہی کے
دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

قلبی امراض، جسمانی امراض سے زیادہ خطرناک

اس لیے قلبی امراض و بیماریاں، جسمانی امراض و بیماریوں سے زیادہ شدید
و خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لیے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

”فله موت ومرض وحياة وشفاء، وحياته وموته
ومرضه وشفائه اعظم من حياة البدن وموته ومرضه
وشفائه.“ (۲)

(۱) مرقات شرح مشکوٰۃ: ۳۷/۶

(۲) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۹۴/۱۰

(قلب کی بھی موت و حیات، مرض و شفا ہوتی ہے اور دل کی حیات و موت اور مرض و شفا بدن کی حیات و موت اور مرض و شفا سے عظیم الشان ہے۔)

مطلب یہ کہ دل کی حیات و شفا، بدن کی حیات و شفا سے اعلیٰ و افضل ہے اور دل کی موت و مرض، بدن کی موت و بیماری سے زیادہ خطرناک ہے؛ اس لیے اس کی زیادہ فکر کرنا چاہئے۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت یہ ہے کہ جسمانی بیماری ہو جائے تو ہم بہت پریشان ہوتے اور معالجوں کے پاس دوڑتے اور روپیہ پیسہ خرچ کر کے اس کا علاج کرواتے ہیں، لیکن جب دل بیمار ہوتا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی و معصیت کا مرتکب ہوتا ہے، طاعت و عبادت سے بھاگتا ہے، شر و فساد کی طرف لپکتا ہے خیر و بھلائی کی باتوں سے دور ہوتا ہے، قساوت و شقاوت کے کام کرتا ہے اور رحمت و شفقت، ہمدردی و غمخواری کے جذبات سے خالی و عاری ہو جاتا ہے تو ہم کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، کوئی پریشانی کا احساس نہیں ہوتا، اور ہم صحت مندوں کی طرح پورے طور پر مطمئن ہوتے ہیں، گویا کہ ہم کو کچھ ہوا ہی نہیں، یہ بڑی خطرناک بات ہے؛ کیوں کہ بیمار اپنے آپ کو صحت مند سمجھ کر مطمئن رہے تو بیماری میں اور اضافہ ہوگا اور خطرہ لاحق ہوگا۔

اصلاح قلب کی اہمیت

پھر اصلاح قلب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ قلب وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مہبط اور انوار کا مسکن قرار دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ لِلَّهِ آيَةً مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ، وَآيَةُ رَبِّكُمْ قُلُوبُ

عِبَادِهِ الصَّالِحِينَ وَأَحْبَبَهَا إِلَيْهِ أَلْيَنُهَا وَأَرْقُفَهَا. « (۱)

(بلاشبہ اللہ کے لیے اہل زمین کے برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن، اس کے نیک بندوں کے قلوب ہیں۔ اور اس کے نزدیک پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو نرمی و رقت والے ہیں۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قلب وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلیات و انوار کا ظرف بنتا ہے اور یاد رہے کہ اس قسم کی احادیث سے نعوذ باللہ یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ دل میں سما جاتا ہے۔ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف اور باطل ہے۔

مثلاً ایک حدیث ان الفاظ سے آئی ہے:

« مَا وَسِعَنِي سَمَائِي وَلَا أَرْضِي وَلَكِنْ وَسِعَنِي قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ. »

(میں نہ میرے آسمان میں سما سکتا ہوں نہ میری زمین میں سما سکتا ہوں؛ لیکن میں میرے مومن بندہ کے دل میں سما سکتا ہوں۔)

محدثین کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور اگر یہ کسی کا قول ہے، تو علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ بندہ مومن کے دل میں میری

(۱) علامہ سخاوی و علامہ عراقی رحمہما اللہ نے طبرانی کے حوالہ سے اس حدیث کی تشریح کر کے فرمایا ہے کہ اس کی سند میں بقیۃ بن الولید ہے اور وہ مدلس ہے؛ لیکن اس حدیث میں انہوں نے تحدیث کی صراحت کی ہے۔ (المقاصد الحسنیة: ۴۳۹، تخریج الاحیاء للعراقی: ۱۵/۳) یہ معلوم ہے کہ مدلس اگر تحدیث کی صراحت کر دے تو اس کی حدیث قابل قبول ہوتی ہے اور ان حضرات کا اس حدیث پر کوئی اور اشکال نہ کرنا اس کے قابل احتجاج ہونے کی دلیل ہے۔

محبت و معرفت سما جاتی ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ اس قسم کی احادیث یا اقوال سے یہ مقصود ہے کہ دل اللہ کی تجلیات و انوار اور معرفت و محبت کا گھر ہے۔

بہ ہر حال اس سے دل کا مقام و مرتبہ واضح ہو گیا، جب یہ واضح ہو گیا تو یہ بات خود بہ خود معلوم ہو گئی کہ قلب کی اصلاح و تزکیہ انتہائی ضروری ہے تاکہ وہ معرفت و محبت الہیہ کا مسکن بن سکے اور اس میں کوئی گندگی و پیدی، روگ و بیماری نہ ہو، ظاہر ہے کہ وہی قلب خدائی محبت والہی معرفت کا گھر بن سکتا ہے جو گندگی و آلائش سے پاک ہو اور دل کی گندگی وہی روحانی قلبی بیماری ہے جس کا اوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے، اس لیے قلب کا تزکیہ و اصلاح ضروری؛ بل کہ اشد ضروری ہے۔

اصلاح قلب کا طریق

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلب کو ان بیماریوں اور برائیوں، گندگیوں اور پلیدیوں سے پاک و صاف کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ قرآن پاک اور حدیث شریف میں دل کی پاکی و صفائی کا طریقہ مذکور ہے، اس کے مطابق قلب کی اصلاح کرنا چاہئے، اسی لیے قرآن کریم نے اپنے بارے میں فرمایا کہ وہ ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ ہے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا

فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (يُونُسُ : ۵۷)

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۲۲/۱۸

(اے لوگو! تحقیق کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا اور مومنین کے لیے ہدایت و رحمت آچکی ہے۔)

اس میں ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ جو آیا اس کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد شرک، نفاق و شک، جہل و لاعلمی ہے کہ قرآن ان سب امراضِ قلبیہ کے لیے شفا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن شفا دیتا ہے، ان بیماریوں سے جو ہلاکت تک پہنچانے والے ہیں، جیسے جہالت، شک، شرک، نفاق وغیرہ۔ (۱)
اسی طرح علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ نے روح البیان میں لکھا ہے کہ قرآن امراضِ قلوب جیسے جہل، شک، شرک، نفاق وغیرہ عقائدِ فاسدہ سے شفا دیتا ہے۔ (۲)
غرض یہ کہ قرآن پاک، قلبی امراض کے لیے شفا و دوا ہے، اسی طرح حدیث پاک بھی دوا و شفا ہے، اس طور پر کہ ان میں بیان فرمودہ احکامات و تعلیمات، ہدایات و تلقینات پر عمل کرنے سے یہ امراض دفع و زائل ہوتے اور انسان کا قلب صحت مند و درست ہو جاتا ہے۔ لہذا اصلاحِ قلب کا اجمالی طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل پیرا ہو جائے۔ چنانچہ ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

« تَرَكْتُ فِيكُمْ أُمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللَّهِ وَسُنَّةُ رَسُولِهِ. » (۳)

(۱) روح المعانی: ۱۳۹/۱۱

(۲) روح البیان: ۵۴/۴

(۳) مشکوٰۃ: ۳۱

(میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان کو تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ، دوسرے اس کے رسول کی سنت۔)

یہ حدیث عام ہے جو انسان کے تمام حالات و معاملات اور تمام حرکات و سکنات اور تمام اعمال و افعال سب کو شامل ہے۔ لہذا جس طرح اعمال ظاہرہ متعلق بہ اعضا و جوارح کو شامل ہوگی، اسی طرح اعمال باطنہ متعلق بہ قلب و روح کو بھی عام و شامل ہوگی، حاصل یہ ہوا کہ تمام معاملات میں قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق جو کام کرے گا وہ ہی صحیح ہوگا۔ ورنہ گمراہی میں پھنس جائے گا اور اس میں اصلاح قلب کے متعلق ہدایات و تعلیمات بھی داخل ہیں۔

تفصیلی جواب

اور اس سوال کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں روح و قلب کی بیماریوں کا جو ذکر آیا ہے اور ان کا علاج بتایا گیا ہے، پھر حضرات علما و صوفیاء نے جو اس موضوع پر تحقیق کر کے قرآنی و حدیثی ہدایات کو شرح و مفصل کیا ہے، ان کو کسی اللہ والے سے برتنا سیکھے اور ایک ایک اپنی روحانی و قلبی بیماری کا عملی طور پر علاج کرائے، کیوں کہ کسی چیز کے صرف جان لینے، پڑھ لینے یا سن لینے اور سمجھ لینے سے بیماری کا علاج نہیں ہوتا؛ بل کہ علاج تو ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔

مثلاً کسی کو ملیریا بخار ہو جائے اور وہ ملیریا بخار کے متعلق ڈاکٹروں کے لکھے ہوئے بلند پایہ مضامین بشوق و رغبت مطالعہ کرے اور ان کو خوب اچھی طرح سمجھ لے، یا کسی ڈاکٹر سے ملیریا بخار پر کوئی لکچر سن لے تو ظاہر ہے کہ اس کا بخار ختم نہ ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اور بڑھ جائے۔ ہاں وہ ڈاکٹر کی تجاویز و ہدایات پر بلا کم و کاست عمل

کرے تو ضرور اس کو فائدہ ہوگا اور بخارا تر جائے گا۔

اسی طرح روحانی و قلبی امراض کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جب ہدایات و تعلیمات قرآنی و نبوی پر عمل ہوگا اور اصول و قواعد کے مطابق عمل ہوگا تو ضرور فائدہ ہوگا اور یہ روحانی امراض دفع و زائل ہو جائیں گے۔

مگر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ کام کسی اللہ والے کی نگرانی و سرپرستی میں ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ہر ایک کو ان ہدایات پر از خود عمل کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ پھر نفس بڑا چالاک و چال باز ہوتا ہے۔ کبھی ایک برائی و بیماری سے ہٹتے ہی دوسری میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی بیماری کو صحت مندی کے لباس میں دکھاتا ہے، لہذا کسی رہبر و مصلح کی نگرانی اور سرپرستی میں اصلاحِ قلب کا کام ہو تو یہ خطرہ نہیں رہتا (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے) الغرض اصلاحِ قلب کے لیے عملی طور پر کچھ کرنے کا بیڑہ اٹھانا چاہئے۔

مجاہدہ کی ضرورت

اسی عملی جدوجہد اور اصلاحی کوشش کا نام مجاہدہ ہے، جس کا ذکر قرآن اور حدیث اور علما و صوفیاء کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾

(اور جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے لیے

ہمارے راستے کھول دیتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے

والوں کے ساتھ ہے۔)

روح البیان میں ہے کہ اس آیت میں مجاہدہ کو مطلقاً ذکر فرمایا ہے تاکہ ظاہری دشمنوں اور باطنی دشمنوں دونوں سے جہاد کو عام رہے۔ ظاہری دشمنوں سے جہاد جیسے کفار محاربین سے جہاد ہے۔ اور باطنی دشمنوں سے جہاد جیسے نفس اور شیطان سے

جہاد ہے۔ (۱)

نیز علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ”روح المعانی“ میں رقمطراز ہیں:
 ”و اطلقت المجاهدة لتعلم مجاهدة الأعداء الظاهرة
 والباطنة بأنواعهما“.

(مجاہدے کو) (آیت میں) مطلقاً ذکر کیا گیا تا کہ ظاہری و باطنی تمام
 دشمنوں کو ان کی اقسام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ (۲)
 معلوم ہوا کہ آیت میں صرف قتال مع الکفار مراد نہیں ہے؛ بل کہ یہ بھی
 مراد ہے اور اس کے ساتھ جہاد مع النفس بھی مراد ہے۔

اور امام ترمذی اور ابن حبان رحمہما اللہ نے حضرت فضالہ بن عبید اللہ سے
 حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 « الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي اللَّهِ. »

(مجاہد وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے نفس سے جہاد کرے۔)
 علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الجامع الصغیر“ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور
 علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ علامہ علائی رحمۃ اللہ علیہ محدث نے فرمایا کہ حدیث
 حسن ہے اور اس کی سند جید ہے۔ اس حدیث میں مجاہد کی تعریف کرتے ہوئے
 فرمایا گیا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔ علامہ مناوی
 رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفس سے جہاد باہر کے دشمن (کفار) سے جہاد کی اصل ہے،
 کیوں کہ جو شخص اپنے نفس سے جہاد نہ کیا ہوتا کہ وہ حکم خدا کی اتباع کرے اور منہیات

(۱) روح البیان: ۶/۴۹۷

(۲) روح المعانی: ۱۲/۲۱

کو چھوڑ دے تو اس کے لیے خارجی دشمن سے جہاد ممکن نہیں، اور اس کے دشمن سے جہاد و مقابلہ اس کے لیے کیسے ممکن ہے جب کہ اس کا دشمن اس کے بازو میں ہے جو اس پر مسلط ہے؟ (۱)

غرض یہ کہ اپنے نفس کی لذات و خواہشات کا مقابلہ کر کے اس کو اطاعت خداوندی پر لگانا اور محرّمات سے پرہیز کا خوگر بنانا، بہت بڑا جہاد ہے، اسی کو مجاہدہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔
مجاہدہ کیوں؟

رہا یہ سوال کہ مجاہدہ کیوں ضروری ہے؟ اور یہ کہ اس سے فائدہ و نفع کیا ہے؟ اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور اعمالِ فاسدہ سے اجتناب و پرہیز چوں کہ نفس و طبیعت کے خلاف ہے، اس لیے نفس ہمیشہ اس سلسلہ میں منازعت و مقابلہ کرتا ہے اور نیکی و صلاح سے روکنے اور شہوات و لذات میں ملوث کرنے کی فکر کرتا ہے جیسے قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول مذکور ہے کہ:

﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ (يُوسُفٰ : ۵۳)

(یعنی بلاشبہ نفس بہت زیادہ برائی کا حکم دینے والا ہے۔)

اس لیے نفس کے خلاف اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور ان پر پابندی اور اعمالِ و اخلاقِ فاسدہ سے اجتناب و پرہیز ایک مجاہدہ چاہتا ہے تا کہ نفس اپنی روش سے باز آجائے حتیٰ کہ وہ لَمَّارہ سے مطمئن ہو جائے اور یہ کام بغیر مجاہدہ کے نہیں ہو سکتا؛ اس سے مجاہدہ کا نفع بھی معلوم ہو گیا کہ یہ خوگر لذات و شہوات، مجاہدہ کی وجہ سے طاعت

و عبادت اور صلاح و تقویٰ کا عادی ہو جاتا ہے۔

ایک عمدہ مثال

اگر نفس کو اس کی مرضی پر چلنے سے نہ روکا جائے اور مجاہدہ کی بھٹی میں اس کو تپایا نہ جائے تو اس کی برائی و شرارت ختم نہیں ہوتی۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ ایک بزرگ گذرے ہیں، انہوں نے ایک عجیب قصیدہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھا ہے؛ اس میں انہوں نے نفس کی ایک عمدہ مثال دی ہے؛ ان کا شعر ہے۔

وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تَهْمَلَهُ شَبَّ عَلَى

حُبِّ الرِّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمُهُ يَنْفَطِمَ

محترم فیاض الدین نظامی رحمۃ اللہ نے اس کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

نفس کی ہیں عادتیں مانند طفل شیر خوار

دودھ پیتا جائے گا جب تک چھڑائیں گے نہ ہم (۱)

حاصل شعر یہ ہے کہ نفس کو جب تک اس کی خواہشات سے نہ روکیں گے، اس وقت تک وہ گناہوں اور لذات و شہوات میں انہماک سے باز نہیں آتا جیسے شیر خوار بچہ جو ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیتا ہے، اس کو اگر دودھ نہ چھڑائیں تو وہ کبھی دودھ نہیں چھوڑے گا؛ بل کہ پیتا ہی چلا جائے گا حتیٰ کہ بڑا ہو کر بھی اس سے باز آنا مشکل ہوگا؛ اس لیے بچہ کا دودھ بکرا کر چھڑایا جاتا ہے اور اس کے رونے، چیخنے، چلانے، واویلا مچانے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی؛ بل کہ صبر کر کے اس کو سنبھالا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر بچہ دودھ چھوڑتا ہے اور ایسا چھوڑتا ہے کہ پھر اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا؛ بل کہ ماں کا دودھ پینے سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہی حال نفس کا ہے اس کو خواہشات

ولذات سے جب تک چھڑائیں گے نہیں، وہ ان کو نہیں چھوڑ سکتا: اس لیے مجاہدہ کراتے ہوئے اس کو اس کی لذات و خواہشات سے دور رکھا جائے۔ جب یہ مجاہدہ ہوگا تو پھر وہ ان کو چھوڑ دے گا؛ بل کہ ان سے نفرت کرنے لگے گا۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ

یہیں سے ان لوگوں کی غلط فہمی ظاہر ہوگئی جو نفس کی خواہشات کو بلا کسی قید و شرط پورا کرے یہ خیال کرتے ہیں کہ جب نفس کو اس کی خواہش کی چیز مل جائے گی تو وہ اس کی حالب میں سر دپڑ جائے گا اور پھر مطالبہ و تقاضا نہ کرے گا۔ یہ خیال عام تجربات و مشاہدات کے خلاف ہے۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ نے اپنے قصیدہ میں نفس کی چالبازیوں پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

فَلَا تَرُمُ بِالْمَعَاصِي كَسْرَ شَهْوَتِهَا
إِنَّ الطَّعَامَ يُقْوِي شَهْوَةَ النَّهَمِ

فیاض الدین نظامی اپنے منظوم ترجمہ میں اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

نفس کی خواہش گناہوں سے نہیں ہوتی دور
جس طرح جوع البقر میں پُر نہیں ہوتا شکم

یعنی نفس امارہ کی مثال ایسی ہے جیسے جوع البقر کا مریض کہ جس طرح پانی پینے اور کھانا کھانے سے اس کا پیٹ بھرتا نہیں؛ بل کہ بھوک پیاس اور بڑھ جاتی ہے، اسی طرح نفس امارہ بھی گناہوں سے کبھی سیر نہیں ہوتا؛ بل کہ اور زیادہ اس کا حالب و عادی ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ گمان کرنا کہ نفس کو اس کی خواہش کی چیز دیدینے سے اس کا تقاضا ضعیف ہو جائے گا؛ صحیح نہیں ہے۔

غرض یہ کہ نفس کو مجاہدہ کی بھٹی میں ڈال کر جب تک تپایا نہ جائے اور اس کی

خواہشات و لذات اور مطالبوں اور تقاضوں پر پابندی نہ لگائی جائے، اس کی اصلاح نہیں ہوتی اور وہ نیکی و طاعت، عبادت و انابت کی خصوصیات سے متصف نہیں ہو سکتا؛ اس لیے مجاہدہ ضروری ہے۔

نفس کی تین قسمیں

انسانی نفس اپنے احوال و اوصاف کے لحاظ سے تین قسم پر ہے۔ ایک نفس امارہ دوسرے نفس لوّ امہ اور تیسرے نفس مطمئنہ، چنانچہ قرآن مجید میں ان تینوں اقسامِ نفس کا ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ (يُؤَسَّفُ : ۵۳)

(حضرت یوسف رحمۃ اللہ نے فرمایا) بلاشبہ نفس امارہ بالسوء (برائی

کا بہت حکم دینے والا) ہے۔

اس میں نفس امارہ کا ذکر آیا ہے اور دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (الْقِيَامَةِ : ۲)

(میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوّ امہ کی۔)

اس آیت میں نفسِ لوّ امہ کی قسم کھائی گئی ہے؛ معلوم ہوا کہ ایک نفسِ لوّ امہ بھی

ہوتا ہے۔ اور ایک جگہ نفسِ مطمئنہ کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾

(اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ جا، اس حال میں کہ تو

اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو۔)

اس جگہ نفسِ مطمئنہ کا ذکر فرمایا گیا ہے؛ غرض یہ کہ نفس تین قسم کا ہے، یہ اس کے

احوال و اوصاف کے لحاظ سے تقسیم ہے، نفس امارہ سے، نفس کو نفسِ مطمئنہ بنانا ہے؛

اس کے لیے مجاہدہ ہوتا ہے۔
نفس امارہ کیا ہے؟

نفس امارہ وہ ہے جو انسان کو برائی اور معصیت کا حکم دیتا ہے اور اس کا وسوسہ ڈال کر انسان کو اس میں ملوث کر دیتا ہے۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ نے فرمایا:
”نفسِ انسانی اپنی ذات کے لحاظ سے بہت زیادہ برائی کا حکم دیتا ہے۔“
اور مراد (نفس امارہ سے) یہ ہے کہ وہ شہوتوں اور لذتوں کی طرف بہت زیادہ میلان کرتا ہے اور اپنی قوتوں اور آلات کو ان کی تحصیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ (۱)
اور تفسیر روح البیان میں ہے:

”نفس امارہ قبائح و معاصی کا حکم دیتا ہے؛ اس لیے کہ وہ باطل باتوں اور شہوتوں سے بہت زیادہ لذت پانے والا ہے اور مختلف قسم کے منکرات کی طرف بہت میلان کرنے والا ہے۔“ (۲)

نفسِ لوامہ کی تعریف

ربانفسِ لوامہ، تو اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ گناہ و تقصیر ہو جانے پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور گناہوں پر پشیمان اور تقصیرات پر پریشان ہوتا ہے۔
اس کی تائید حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ کے قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے نفسِ لوامہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ خیر و شر پر ملامت کرتا ہے کہ میں کاش ایسا کرتا، اے کاش میں ایسا کرتا۔ (۳)

(۱) روح المعانی: ۱/۱۳

(۲) روح البیان: ۲/۲۷۵

(۳) ابن کثیر: ۴/۴۴۸

نیز حضرت مجاہد رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ نفس ہے جو اپنے اوپر ملامت کرتا ہے ان باتوں کے متعلق جو اس سے فوت ہو گئیں اور شر پر ندامت محسوس کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیوں کیا اور خیر پر ندامت محسوس کرتا ہے کہ میں نے اس کو کیوں نہ کیا یا اس میں زیادتی کیوں نہ کی۔ (۱)

غرض یہ کہ نفس لواۓ وہ ہے جو برائی ہو جانے پر ندامت و پشیمانی میں مبتلا ہوتا ہے اور خیر میں تقصیر و کمی ہونے پر پریشان ہوتا ہے؛ تو گویا اس نفس کو لٹارہ و مطمئنہ دونوں کے بین بین درجہ حاصل ہے۔

نفس مطمئنہ کی حقیقت

تیسرا نفس، نفس مطمئنہ ہے جس کی تعریف میں حضرات صوفیائے کرام نے فرمایا: یہ وہ ہے کہ جو نورِ قلب سے پورے طور پر منور ہو جائے حتیٰ کہ صفاتِ مذمومہ سے الگ اور اخلاقِ حمیدہ سے متخلق ہو جائے اور طبعی منازعت سے سکون پا جائے (یعنی طبیعت و شریعت کے درمیان اس کا نفس جھگڑنے سے باز آ جائے۔) (۲)

اس نفس کو نفس مطمئنہ کس وجہ سے کہا جاتا ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نفس وصولِ الی اللہ سے قبل مضطرب رہتا ہے، جب وہ وصولِ الی اللہ کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے تو اس کا یہ اضطراب ختم ہو کر اس کو اطمینان و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کو نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔

بعض علما نے فرمایا کہ نفس جب واصلِ الی اللہ ہوتا اور یقین کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا ہے تو اس کا نفس شک و ریب کی بیماری سے پاک ہوتا ہے اور اس کو شرع کی

(۱) روح المعانی: ۱۵۶/۲۹

(۲) روح المعانی: ۱۵۶/۲۹

ہر بات پر پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نفس مطمئنہ، ہر قسم کے خوف و حزن سے قیامت کے دن محفوظ و مامون ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

بہر حال یہ تیسری قسم کا نفس ہے، جو نفس مطمئنہ کہلاتا ہے، غرض نفس کو لتاریت سے نکال کر اطمینان کی کیفیت سے متصف کرنا ضروری ہے؛ مجاہدہ اسی لیے کیا جاتا ہے۔

مجاہدہ اجمالی

مجاہدہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک اجمالی، ایک تفصیلی، مجاہدہ اجمالی یہ ہے کہ قلت کلام، قلت منام، قلت طعام اور قلت اختلاط مع الانام کا اپنے کو عادی بنائے، یہ مجاہدہ مقامات کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ شیخ المشائخ عارف باللہ امام سہروردی رحمۃ اللہ ”عوارف المعارف“ میں فرماتے ہیں کہ تمام مقامات چار میں مندرج ہیں۔ ایک ایمان و یقین، دوسرے توبہ، نصوح، تیسرے زہد، چوتھے دوام عمل کے ساتھ ظہر و باطناً، اعمال قلبیہ و قلبیہ کے ذریعہ بلا کسی قصور فتور کے مقام عبودیت، پھر چار مقامات کی تکمیل و اتمام دوسری چار باتوں کی مدد سے متحقق ہوگی۔ اور وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ قلت کلام، قلت طعام، قلت منام، اور لوگوں سے علیحدگی؛ علماء زاہدین اور مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان چار باتوں سے ہی مقامات میں استقرار و استقامت اور احوال میں سدھار حاصل ہوتا ہے۔ (۱)

اب مختصر طور پر ان چار امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ بصیرت حاصل ہو:

قلت کلام: بات چیت اور گفتگو میں تقلیل و کمی بہت ضروری ہے؛ اس سے زبان قابو و قبضہ میں رہتی ہے اور بہت سی برائیوں اور خرابیوں اور بہت سے معاصی

اور گناہوں سے انسان بچ جاتا ہے، اس لیے حدیث میں ہے کہ جب حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نجات کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

« أَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسْعُكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ. » (۱)

(اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اپنے گھر میں پڑے رہو۔ اور اپنی خطاؤں پر روؤ۔)
نیز ارشاد نبوی ہے:

« مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ. » (۲)
(انسان کے کمال اسلام میں سے یہ ہے کہ لایعنی فضول بات کو چھوڑ دے۔)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:
« مَنْ صَمَتَ نَجَا. » (۳)
(جو خاموش رہا وہ نجات پایا۔)

اس سلسلے میں احادیث بہت ساری وارد ہوئی ہیں۔ یہ بطور نمونہ چند نقل ہوئیں، ان سے معلوم ہوا کہ آدمی کو زیادہ کلام کرنے سے بچنا چاہئے، خاموشی کی عادت ڈالنا چاہئے، بلاوجہ بے ضرورت کلام سے پرہیز کرنا چاہئے۔

(۱) ریاض الصالحین: ۴۵۰

(۲) مشکوٰۃ: ۴۱۳

(۳) مشکوٰۃ: ۴۵۰

قُلْتُ طَعَام: کھانے پینے میں کمی کرنا بھی ایک اہم مجاہدہ ہے، اور مومن کی شان یہی بتائی ہے کہ وہ کم کھاتا ہے بنسبت اس کے جو کفر میں مبتلا ہو، چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« يَأْكُلُ الْمُسْلِمُ فِي مَعَى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءِ. » (۱)

(مسلمان ایک آنت میں کھاتا اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک غلام خریدنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے سامنے کچھ کھجور رکھے کہ وہ کھائے۔ غلام نے بہت زیادہ کھایا تو آپ نے یہ کہہ کر غلام واپس کر دیا کہ ”إِنَّ كَثْرَةَ الْأَكْلِ شَوْمٌ“ کہ زیادہ کھانا نحوست ہے۔ (۲)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ حَسِبَ الْآدَمِيُّ لُقَمَاتٍ يَقْمَنَ صُلْبَهُ. »

(اس پیٹ سے زیادہ برا کوئی برتن نہیں جو آدمی پر کرے، آدمی کے

لیے تو چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر درست رہے۔) (۳)

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ کثرتِ اکل و حرصِ اکل کوئی اچھی چیز نہیں؛ بلکہ

(۱) بخاری: ۸۱۲/۲

(۲) مشکوٰۃ: ۳۶۸

(۳) ابن ماجہ: ۲۴۰

بہت سی خبرایوں کی جڑ ہے؛ اس لیے اس میں تقلیل و کمی کرنا چاہئے؛ مگر کمی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بھوکا رہے اور امراض کا شکار بنتا جائے؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ حد سے زیادہ نہ کھائے، ہاں بقدر کفایت و ضرورت کھانا برا نہیں ہے، میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ آپ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”سالم کو چاہئے کہ نہ اتنی تقلیل (کمی) کرے کہ صحت برباد ہو جائے اور نہ اتنی زیادتی ہو کہ حد سے زیادہ کھالے، بلکہ اوسط درجہ کا لحاظ رکھنا چاہئے، اصل طریقہ یہ ہے کہ جس وقت بھوک لگے اس وقت کھانا کھائے اور اتنا کھا کر رک جائے کہ چند لقمے کھانے کو اور جی چاہ رہا ہو“۔ (۱)

قَلَّتْ مَنَامٌ: کم سونے سے مراد یہ ہے کہ رات کی نیند میں کمی کر کے رات کا ایک حصہ اللہ کی یاد و مناجات میں گزارے اور اس کی فضیلت قرآن و حدیث میں منصوص ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا
وَطَعْمًا﴾ (النِّجْدَةِ: ۱۶)

(ان) نیک بندوں کے بازو، بستروں سے الگ رہتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اپنے رب کو خوف سے اور ثواب کی امید سے پکارتے ہیں۔
”پہلو کا بستر سے الگ رہنا“ محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سوتے نہیں، بلکہ جاگتے ہوئے اللہ کو پکارتے اور یاد کرتے ہیں۔

اور یہ کم سونا اس لیے ضروری ہے کہ حد سے زیادہ سونے سے طبیعت میں، برودت میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس سے قوائے فکریہ کمزور ہو جاتے ہیں اور یہ بات دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے نقصان دہ ہے؛ لیکن اس میں بھی یہ ملحوظ ہونا چاہئے کہ اعتدال و توسط ہو، کہ نہ بہت زیادہ سونے کی عادت ڈالے اور نہ حد سے کم سوئے؛ بل کہ بہ قدر ضرورت سونا چاہئے؛ اور آج کل کے لحاظ سے بقول اطباء چھ سے سات گھنٹے اوسط درجہ ہے۔

اگر نیند کا غلبہ ہو تو ذکر و عبادت میں مشغول ہونے کے بجائے، سو جانا چاہئے۔ چنانچہ حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

« إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي فَلْيَرْقُدْ حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَذَرِي لَعَلَّهُ يَذْهَبُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهُ. » (۱)

(جب تم میں سے کوئی نماز کی حالت میں اونگھنے لگے تو وہ سو جائے حتیٰ کہ اس کی نیند چلی جائے کیوں کہ کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ استغفار کرنے کے بجائے اپنے کو گالی دینے لگے۔) غرض یہ کہ بقدر ضرورت سونا چاہئے اور بے ضرورت خواہ مخواہ سوتے رہنا نقصان دہ ہے، اسی کو صوفیائے قلّت منام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قَلَّتْ اخْتِلَاطُ مَعَ الْأَنَامِ: یعنی لوگوں سے میل جول اور تعلقات میں کمی کرنا، یہ بھی سالک کے لیے ضروری مجاہدہ ہے۔ پہلے یہ حدیث نقل کر چکا ہوں کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے سوال پر کہ نجات کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ زبان کو قابو میں رکھو اور اپنے گھر میں پڑے رہو اور خطاؤں پر روؤ، اس حدیث میں گھر میں پڑے رہنے کا حکم اسی جانب اشارہ ہے کہ لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرو۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

”(مراد یہ ہے کہ) تو اپنے گھر میں رہے اور بلا ضرورت گھر سے نہ نکلے اور گھر میں بیٹھے رہنے سے تنگ دل نہ ہو؛ بل کہ اس کو غنیمت جانے، کیوں کہ یہ شر و فتنہ سے خلاصی کا سبب ہے؛ اسی لیے کہا گیا ہے: ”هَذَا زَمَانُ السُّكُوتِ، وَمُلَازِمَةُ الْبُيُوتِ وَالْقَنَاعَةُ بِالْقُوتِ إِلَى أَنْ يَمُوتَ“ (یہ زمانہ سکوت کا اور گھروں میں پڑے رہنے کا اور بہ قدر ضرورت گزارہ پر قناعت کرنے کا زمانہ ہے، یہاں تک کہ موت ہو جائے۔) (۱)

غرض یہ کہ اگر کوئی خاص حاجت و ضرورت، خواہ دینی حاجت و ضرورت یا دنیوی حاجت و ضرورت نہ ہو تو کسی سے ملنا جلنا نہ چاہئے؛ اس سے دینی و دنیوی دونوں قسم کے نقصانات ہوتے ہیں، کبھی غیبت یا چغلی وغیرہ گناہوں میں آدمی مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے آخرت کا نقصان متیقن ہے اور کبھی خواہ مخواہ کی وقت گزاری سے دنیوی امور میں کوتاہی ہو کر اس کا نقصان ہوتا ہے۔

یہ ہے اجمالی مجاہدہ، جس کو مقامات کے حصول کے لیے ذریعہ و سبب اور اتمام و تکمیل مراتب کے لیے لازم و ضروری قرار دیا گیا؛ رہا تفصیلی مجاہدہ تو وہ دو بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ایک اخلاق حمیدہ کی تحصیل پر، ایک اخلاق رذیلہ سے تنزیہ و تزکیہ پر اور

اس کی تفصیل اخلاق و تصوف کی بڑی کتابوں میں دیکھنا چاہئے۔ جیسے احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، مدارج السالکین، منازل السائرین، قوت القلوب، رسالہ قشیریہ وغیرہ اور اردو میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتب، جیسے اصول الوصول، شریعت و طریقت، الکشف، انفاس عیسیٰ، بصائر حکیم الامت اور حضرت مسیح الامت کی کتاب شریعت و تصوف (جلد اول و دوم) وغیرہ۔

اس مختصر تحریر میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں، کیوں کہ اس رسالہ سے مقصود محض ترغیب ہے اس بات کی کہ اصلاح نفس کی فکر ہو۔ اس کے لیے بہت اختصار کے ساتھ چند امور پیش کئے گئے ہیں۔

ضرورتِ شیخ

مگر جیسا کہ ظاہر ہے، اصلاح قلب و تزکیہ نفس کوئی ایسا معمولی کام نہیں کہ آدمی خود ہی کر لے یا کتب بنی سے حل ہو جائے؛ بل کہ اس کے لیے ایک شیخ کامل و ماہر کی ضرورت ہوگی جس کی رہبری میں تزکیہ نفس و اصلاح قلب کا کام ہو، کیوں کہ یہ کام شیخ کی رہبری کے بغیر ہوگا تو اس میں نشیب و فراز کی جن منزلوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان میں انسان ڈمگ جاتا ہے اور بہت سے لوگ رجعتِ قہقری کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ راہ سے بے راہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے عادیۃ اللہ یہ رہی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھیجے گئے اور پھر انبیاء کے بعد ان کے نائبین کا سلسلہ قائم و جاری فرمایا گیا اور جس طرح دنیا میں ہر علم و فن کے لیے عادیۃ اللہ یہی ہے کہ رہبر و استاذ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح یہ بھی ایک علم ہے اور ساتھ ساتھ فن بھی کہ آدمی اپنے قلب کو اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرے، بعد اس کے اندر سے

اخلاق رزیلہ کو باہر نکالے اور دل کو معرفتِ الہیہ کے نور سے منور اور محبتِ خداوندی سے معمور کرے۔ اس لیے یہ بھی بغیر رہبر و شیخ کے حاصل نہیں ہو سکتا؛ لہذا اس ادارہ میں قدم رکھنے کا ارادہ ہو تو اولاً کسی شیخِ کامل سے رابطہ کرنا چاہئے۔

گر ہوائے اس سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس بیا
بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق
اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ اور اس کے پیچھے چل،
کیوں کہ جو بھی راہِ عشقِ الہی میں بغیر رفیق و رہبر کے چلا، اس کی عمر گزر گئی مگر وہ عشقِ
الہی سے آگاہ نہ ہوا۔

کسی نے اس سلسلے میں یہ شعر بہت ہی عجیب کہا ہے۔
ان سے ملنے کی ہے یہی ایک راہ ملنے والوں سے راہ پیدا کر

شیخِ کامل کی پہچان

مگر شیخ و پیر کون ہوتا ہے؟ اور اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کا جان لینا بہت ضروری ہے، کیوں کہ آج کل جاہل صوفیوں اور بے دین و ملحد قسم کے پیروں نے عوام الناس کو دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے اور ہر قسم کی گمراہی و ضلالت، بے دینی و جہالت کا نام تصوف و معرفت رکھ کر لوگوں کو شریعت سے دور کرنے اور علما حق سے بدظن کرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے، چنانچہ ایسے جاہل صوفی اور بے دین پیر، شریعت و طریقت کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر اس طرح دھوکہ دیتے ہیں کہ علمائے شریعت والے ہیں اور ہم طریقت والے ہیں، نیز طریقت کو شریعت پر فوقیت دیتے ہیں اور اپنے مریدین کو بھی دور رکھتے ہیں اور محرمات کا ارتکاب کرتے اور ہر گمراہی کو روار کھتے ہیں اور ان میں ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جو زنا، شراب، جوا، اختلاطِ مرد و زن وغیرہ سب کو

حلال کیسے ہوئے ہیں، معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ فاسق و فاجر ہیں اور اگر ان محرمات کو حلال سمجھتے ہیں تو مرتد و کافر ہیں، ان سے اصلاح و تزکیہ کا کام کس طرح ہو سکے گا؟ یہ خود گمراہ ہیں دوسروں کی کیا رہبری کریں گے؟

لہذا یہاں جان لینا چاہئے کہ شیخ کی پہچان کیا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ نے ”قصد السبیل“ میں فرمایا:

”پیر کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں (۱) ضرورت کے موافق دین کا علم ہو (۲) عقیدے، عمل اور عادتیں اس کی شرع کے موافق ہوں (۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو (۴) کسی پیر کامل کے پاس کچھ دنوں تک رہا ہو (۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش منصف مزاج ہوں، وہ اس کو اچھا جانتے ہوں (۶) عام لوگوں کی نسبت خاص لوگ یعنی جو سمجھدار اور دیندار ہیں وہ اس کے زیادہ معتقد ہوں (۷) اس کے مریدوں میں اکثر مرید شرع کے پابند ہوں اور ان کو دنیا کی طمع نہ ہو (۸) وہ پیر اپنے مریدوں کی تعلیم جی سے کرتا ہو، اور چاہتا ہو کہ یہ درست ہو جائیں اور اگر مریدوں میں کوئی بری بات دیکھتا ہو یا سنتا ہو تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے (۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی معلوم ہوتی ہو (۱۰) وہ خود بھی ذکر و شغل کرتا ہو۔“ (۱)

اس کے بعد ایک ضروری بات پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے تنبیہ فرمائی ہے

کہتے ہیں کہ:

”جس شخص میں یہ نشانیاں موجود ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں، یا پوشیدہ یا آئندہ ہونے والی باتیں اس کو معلوم ہوتی ہیں یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ اپنی باطنی قوت سے کچھ کام کر دیتا ہے یا نہیں، کیوں کہ یہ باتیں پیرو ولی کے لیے ہونا ضروری نہیں۔“ (۱)

غرض یہ کہ شیخ و پیر ایک طرف علم شریعت سے آراستہ ہو تو دوسری طرف اس علم کے موافق زندگی گزارتا ہو، اور مریدین کی تربیت کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو، ایسے شخص کو اپنی اصلاح و تربیت کے لیے منتخب کر لینا چاہئے، اور اس انتخاب میں تلاش و جستجو سے کام لینا چاہئے۔ حضرت شیخ قطب الدین دمشقی رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ مکبہ میں لکھا ہے کہ:

”مرید ہونے والے پر لازم ہے کہ شیخ کامل کی تلاش میں پوری کوشش کرے اور خوب جانچے کہ یہ شیخ بنا نے کے قابل ہے یا نہیں، کیوں کہ بہتیرے طالب اس راستہ میں بد دینوں کا اتباع کر کے ہلاک ہو چکے ہیں۔“ (۲)

شیخ سے استفادہ کا طریقہ

جب خوب جانچ پڑتال کے بعد شیخ کا انتخاب کر چکے تو اب ضروری ہے کہ اس سے استفادہ و استفادہ کرے اور مجمعی کے ساتھ اپنی اصلاح و تزکیہ کرائے۔ عام طور پر لوگ شیوخ سے بیعت تو ہو جاتے ہیں مگر اصلاح و تزکیہ نہیں کراتے،

(۱) تسہیل قصد السبیل: ۱۶

(۲) ارشاد الملوک: ۷

حالاں کہ بیعت کی اصل و حقیقت ہی یہ ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے شیخ سے رہبری حاصل کرے، باقی ہاتھ میں ہاتھ دینا (جس کو عرف عام میں بیعت کہتے ہیں) وہ صورت بیعت ہے اور سنت ہے اور اس صورت کی حقیقت اصلاح احوال ہے، اگر صورت ہی پر اکتفا کر بیٹھیں تو اصلاح و تزکیہ کیسے ہوگا؟ رہا یہ سوال کہ شیخ سے استفادہ اور اصلاح و تزکیہ کرانے کا کیا طریقہ ہے؟ بعض عوام اس سلسلہ میں عجیب عجیب خیالات پکائے ہوئے ہیں، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ بس بیعت ہوتے ہی سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور کوئی یہ خیال کئے ہوئے کہ شیخ سے کچھ وظائف حاصل ہوں گے اور اس کو پڑھنے سے سارے کام بن جائے گے، کسی کا یہ خیال کہ شیخ کے مریدوں میں داخل ہونے اور ان کے شجرہ میں نام آنے سے بخشش کا پروانہ مل جائے گا، وغیرہ حالانکہ بیعت کا نہ یہ مقصود ہے اور نہ اس سے ایسا ہوتا ہے۔

لہذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شیخ سے استفادہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے کہ اپنے تمام امراض اور برائیوں کو اس کے سامنے پیش کر کے اصلاح لے اور جو کچھ شیخ تعلیم و ہدایت دے، اس پر عمل کرے۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجدد رحمۃ اللہ نے اپنے ایک قطعہ میں فرمایا ہے کہ۔

چار شرطیں لازمی ہیں استفادہ کے لیے

اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد

یہ مقفی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی

حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد

اس میں شیخ سے فیض حاصل کرنے کے لیے چار شرائط بیان فرمائی ہیں اور یہ

دراصل حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ کا فرمان ہے جس کو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ نے منظوم فرمایا ہے۔

پہلی شرط اطلاع ہے، یعنی اپنے احوال کو بلا کم و کاست شیخ کے سامنے رکھ دینا اور اس سلسلہ میں خیانت بالکل نہ کرنا چاہئے اور نہ ہی شرم کرنا چاہئے، جیسے ڈاکٹر سے بیماری کو چھپایا نہیں جاتا بلکہ کچھ دیر کے لیے شرم و حیا کو اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے اور بیماری کو صاف ظاہر کیا جاتا ہے تا کہ طبیب و ڈاکٹر بیماری کا معائنہ اور تشخیص کرے اور پھر علاج تجویز کرے۔

اسی طرح شیخ طبیب روحانی ہوتا ہے اس کے سامنے اپنے امراض کا اظہار کر کے علاج معلوم کرنا چاہئے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ شیخ جو علاج تجویز کرے اس کی اتباع کرے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے کی تجویز ہو یا کسی کام کو چھوڑنے کی تجویز ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک طبیب و ڈاکٹر کی تجویز پر عمل نہ ہوگا، بیماری زائل نہیں ہوتی، اسی طرح جب تک شیخ کی تجویز پر عمل نہ ہوگا، بیماری ختم نہ ہوگی، پھر تجویز میں کبھی کسی کام کے اختیار کرنے کا حکم ہوگا اور کبھی کسی کام کے ترک کرنے کا حکم ہوگا، جیسے جسمانی بیماری کے علاج میں بھی کبھی تو ڈاکٹر کوئی دوا یا غذا تجویز کرتا ہے اور کبھی کسی چیز سے پرہیز تجویز کرتا ہے اور دونوں تجویزوں پر عمل ضروری ہے۔ اگر غذا و دوا والی تجویز پر عمل کیا مگر پرہیز والی تجویز پر عمل نہ کیا تب بھی پورا فائدہ نہ ہوگا بلکہ بعض اوقات پرہیز نہ کرنے سے بیماری بڑھ جاتی ہے؛ اسی طرح روحانی امراض میں شیخ کبھی تو کوئی عبادت، ذکر، وظیفہ و مراقبہ یا کوئی شغل و عمل تجویز کرتا ہے اور کبھی کسی بات سے احتراز و پرہیز کا حکم دیتا ہے جیسے لوگوں سے میل جول یا زیادہ بات چیت، کھانے میں کمی و زیادتی وغیرہ

سے منع کر دیتا ہے؛ اتباع میں ان دونوں تجویز پر عمل داخل ہے۔
تیسری شرط اعتقاد ہے کہ شیخ سے عقیدت ہو، محبت ہو، کیونکہ شیخ کی تشخیص اور تجویز پر اعتماد اور اس کے مطابق عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ شیخ سے اعتقاد ہو، اگر اعتقاد ہی نہ ہوگا تو اس کی تشخیص و تجویز پر اعتماد کیسے ہوگا اور جب اعتماد نہ ہو تو عمل کیوں کر ہوگا؟ اسی لیے علماء تصوف و سلوک نے لکھا ہے کہ شیخ سے اعتقاد و محبت اکسیر اعظم ہے۔

اور چوتھی شرط انقیاد ہے جس کے معنی ہیں خضوع، یعنی جھکنا، مطلب یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ انقیاد اور عاجزی و انکساری کا معاملہ کرے، اس کے سامنے اپنے آپ کو مٹا دے اور پامال کر دے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

قال را بگذار مردِ حال شود ☆ پیش مردِ کاملے پامال شود
اور خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ۔

☆ پیش رہبر ذلیل ہو جاؤ ☆ قبیح بے دلیل ہو جاؤ
☆ پھر تو سچ مچ جمیل ہو جاؤ ☆ یعنی حق کے خلیل ہو جاؤ
غرض یہ کہ شیخ و پیر سے اس طرح استفادہ کیا جاتا ہے کہ اعتقاد و انقیاد کے ساتھ احوال کی اطلاع دے کر تشخیص و تجویز پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

اس کے لیے پہلے اندر کے عیوب اور نقائص، خرابیوں اور بیماریوں کو دیکھنا چاہئے کہ کیا کیا بیماریاں اور عیوب میرے اندر ہیں، پھر ان کو شیخ کے سامنے ظاہر کرنا چاہئے۔

ایک تو اس طرح شیخ سے استفادہ ہوگا، دوسرے اس طرح کہ شیخ کی معیت و صحبت میں رہ کر ان کی باتوں کو سنا جائے اور اپنے احوال پر ان کو منطبق کیا جائے، نیز

صحبت شیخ سے فیض روحانی و باطنی حاصل کرنے کی نیت بھی کی جائے، کیونکہ شیخ کامل و بابرکت کا فیض دل سے دل کی طرف منتقل ہوتا ہے بلکہ اس کے الفاظ اور کلام سے بھی اس کا نور باطن مرید کے دل پر منعکس ہوتا ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ نے فرمایا ۔

شیخ نورانی زرہ آگہہ کند نور را با لفظہا ہمرہ کند
گر تو سنگ خارہ و مرمری بوی گر بصاحب دے رسی گوہر شوی
(شیخ صاحب نور باطن، طالبین حق کو راہ حق بھی دکھاتا ہے اور اپنے
نور باطن کو بھی اپنے الفاظ کے ذریعہ طالبین کے ہمراہ کر دیتا ہے،
اگر تو پتھر کی طرح بے قدر بھی ہوگا تو کسی صاحب دل بزرگ کے پاس
جائے گا تو موتی کی طرح آبدار ہو جائے گا۔)

اس طرح شیخ سے فیض پا کر اپنے دل کو جو گناہوں کا عادی اور پتھر کی طرح قاسی ہو گیا ہے موتی کی طرح آبدار و بیش قیمت بنایا جاسکتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قلب سے متعلق وارد بعض احادیث مع مختصر تشریح

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے دل پر ایک کالا نکتہ اور داغ بن جاتا ہے اگر توبہ کر لیتا ہے اور اس گناہ سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کا دل صاف و صیقل ہو جاتا ہے اور اگر مزید گناہ کرتا ہے تو یہ داغ بھی زیادہ ہو جاتا ہے) اور بعض روایات میں ہے کہ (یہ گناہ بڑھ کر اس کے پورے قلب کو گھیر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پاک کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَأَىٰ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾

(ہرگز نہیں، بل کہ ان کے دلوں پر زنگ ہے۔) (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ کی وجہ سے دل پر زنگ آ جاتا ہے اور وہ توبہ کرنے سے زائل ہوتا ہے ورنہ بڑھ کر دل کو پوری طرح زنگ آلود کر دیتا ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ زنگ گناہ پر گناہ ہے، جس سے دل اندھا ہو جاتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔ (۲)

(۱) ترمذی: ۱۷۱/۲، قال الترمذی هذا حدیث صحیح

(۲) ابن کثیر: ۴/۲۸۵

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دل چار قسم کے ہیں، ایک صاف شفاف دل جس میں روشن چراغ ہو، یہ مومن کا دل ہے، دوسرے کالا دل جو الٹا ہو، یہ کافر کا دل ہے، تیسرے بے سمجھ دل جو غلاف سے بندھا ہوا ہو، یہ منافق کا دل ہے، چوتھا دورِ خادل جس میں ایمان ہو، اس میں ایمان کی مثال ساگ سی ہے کہ جسے بیٹھا پانی بڑھاتا ہے اور نفاق کی مثال پھوڑے کی سی ہے جسے پیپ بڑھاتی ہے جس پر جو مادہ غالب ہوگا اس پر وہی حکم لگایا جائے گا۔ (۱)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قلب کی کئی قسمیں ہیں، اور مومن کا قلب صاف شفاف آئینہ کی طرح ہوتا ہے، اور اس میں معرفتِ الہی کا چراغ روشن ہوتا ہے اور کافر کا دل کالا اور الٹا ہوتا ہے اس لیے کوئی حق بات سمجھنے سے وہ بعید ہوتا ہے اور منافق کا دل، غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ بھی قبولیتِ حق کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور آخری قسم وہ ہے جس میں ایمان بھی ہو اور نفاق بھی؛ یہاں نفاق سے عملی نفاق مراد ہے کیوں کہ اعتقادی نفاق ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

(۳) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دل کو قلب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اُلٹ پُلٹ ہوتا رہتا ہے؛ دل کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کھلے میدان میں درخت میں ایک پر لٹکا ہوا ہو، جس کو ہوا آگے پیچھے اُلٹ پُلٹ کر رہی ہو۔ (۲)

اس کی شرح میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دل شر سے خیر کی طرف

(۱) احمد: ۱۷/۳

(۲) جامع الصغیر: ۲۹۹۵

اور خیر سے شر کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے، اور اسی وجہ سے اس کا نام قلب (کہ قلب کے معنی بدلنے اور الٹ پلٹ کرنے کے ہیں۔) (۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے کہ ”اے اللہ! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں چار چیزوں سے، اس علم سے جو نفع نہ دے، اس قلب سے جو خشوع والا نہ ہو، اس نفس سے جو سیراب نہ ہو، اور اس دعا سے جو مقبول نہ ہو۔“ (۲)

بعض وقت آپ اللہ سے قلب خاشع کا سوال فرماتے۔ اس حدیث میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منقول ہے، جس میں آپ اس قلب سے پناہ مانگ رہے ہیں جس میں خشوع نہ ہو معلوم ہوا کہ اس میں خشوع کی کیفیت مطلوب ہے اور نہ ہونا مذموم ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

﴿ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾

(کیا مسلمانوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے لیے جھک جائیں؟)

بلاشبہ دل اس لیے بنایا گیا ہے کہ اپنے خالق و مالک کے سامنے جھک جائے اور سینہ اس کے لیے کھل جائے اور اس میں نور ڈالا جائے، پس اگر وہ ایسا نہ ہو تو وہ قلب قاسی (سخت دل) ہے، اور اس سے پناہ مانگنا واجب ہے۔ (۳)

(۱) مرقات: ۷۶/۱

(۲) مشکوٰۃ: ۲۱۷

(۳) مرقات: ۲۲۸/۵

(۵) « عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم "إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُورِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَشَارَ إِلَى صَدْرِهِ بِأَصَابِعِهِ." (۱)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتے لیکن وہ تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں (پھر آپ نے اپنے سینہ کی طرف انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔)

یہ حدیث بہت اہم مسئلہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جسموں اور صورتوں پر فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ قلب کے اعتبار سے فیصلہ ہوگا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اللہ کے نظر فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جزاء عطا فرمائیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمالِ ظاہرہ کی جزاء، دل میں موجود اللہ کی عظمت و خشیت سے عطا فرمائیں گے۔ (۲)

علامہ عبد الرؤف المناوی رحمۃ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

”یعنی ظاہر پر اللہ جزاء نہیں دیتا، اور نہ مالوں پر جو خیرات سے خالی ہیں، لیکن وہ قلوب کو دیکھتا ہے جو تقویٰ کا محل اور جواہر کا برتن اور معرفت کا خزانہ ہے (پھر فرماتے ہیں) نظر کے معنی یہاں احسان، رحمت اور مہربانی کے ہیں، اور نظر نہ کرنے کے معنی احسان و رحم نہ کرنے کے

(۱) مسلم: ۳۱۷/۲، ابن ماجہ: ۳۰۶

(۲) مسلم: ۳۱۷/۲

ہیں، پس احسان و رحمت کو نظر سے مجازاً تعبیر کیا ہے، پھر فرمایا کہ لوگوں کی نظر و میلان اچھی صورتوں اور مالوں کی طرف ہوتا ہے اور اللہ کی ذات اس سے منزہ ہے، لہذا اس کی نظر اس پر ہے جو سوا صل مغز ہو، اور وہ قلب و عمل ہیں۔“ (۱)

(۲) « عَنْ أَبِي عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ وَإِنْ أَبْعَدَ النَّاسَ مِنَ اللَّهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي. » (۲)

(حضرت ابن عمر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ بغیر ذکر اللہ کے زیادہ بات نہ کرو، کیوں کہ ذکر اللہ کے بغیر کثرت کلام دل کے لیے سختی ہے اور تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خدا سے دور وہ ہے جو سخت دل (والا) ہو۔)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ سے غافل ہو کر، دنیوی بات چیت سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے، جو کہ ایک روحانی و باطنی بیماری ہے، اور جس کے دل میں سختی و قساوت کی بیماری ہو، خدا کے نزدیک وہ تمام لوگوں میں سب سے دور ہے یعنی اس کی رحمت سے دور ہے، معلوم ہوا کہ دل کی سختی انتہائی قبیح روحانی بیماری ہے جس سے آدمی رحمت خداوندی سے محروم ہو جاتا ہے، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ بیماری، ذکر اللہ سے غفلت اور دنیوی فضول گوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا اس سے بچنا چاہیے اور ذکر اللہ کی کثرت کرنا چاہئے تاکہ دل میں نرمی پیدا ہو۔

(۱) فیض القدیر: ۲۸۶/۲

(۲) ترمذی: ۶۶/۲

(۷) « عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الَّذِي لَيْسَ فِيْ جَوْفِهِ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ. » (۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہ دل ویران گھر کی طرح اس لیے ہے کہ دلوں کی آبادی ایمان و قرأت قرآن سے ہوتی ہے اور باطن کی زینت و بہار، عقائد حقہ اور اللہ کی نعمتوں میں تفکر سے ہوتی ہے، اور اس میں قرآن سے خالی دل کو ویران گھر سے تشبیہ اس طور پر ہے کہ قرآن جب دل میں ہوگا تو کم یا زیادہ ہونے کے اعتبار سے وہ مزین و معمور ہوگا اور جب وہ اس چیز سے خالی ہوگا جو اس کے لیے ضروری ہے، یعنی ایمان و اعتقاد حق اور اللہ کی نعمتوں اور اس کی صفات میں تفکر و تدبر، تو وہ اس گھر کی طرح ویران ہوگا جو اسباب و سامان اور زیب و زینت سے خالی ہو۔ (۲)

اس حدیث اور اس کی تشریح سے معلوم ہوا کہ دل کی آبادی، قرآن اور اس پر ایمان و عمل سے ہے، اس کے بغیر دل آباد نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ویران گھر کی طرح ہوتا ہے۔

(۸) « عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلَجِ

(۱) ترمذی: ۲/۱۱۹، دارمی: ۲/۲۰

(۲) مرقات: ۳/۳۵۴

وَالْبَرْدِ وَنَقَّ قَلْبِي كَمَا يُنْقِي الثُّوبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ.» (۱)

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں) فرماتے تھے، اے اللہ! میری خطاؤں کو برف اور اولے کے پانی سے دھو دے اور میرے قلب کو اس طرح صاف کر دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔)

اس حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نقل کی گئی ہے جس میں ایک درخواست آپ نے یہ فرمائی ہے کہ اے اللہ! میری خطاؤں کو برف اور اولے کے پانی سے دھو دے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ گناہ اور خطا میں جہنم کی تیزی اور گرمی ہوتی ہے، لہذا اس کو انتہائی ٹھنڈے پانیوں سے دھونے کی درخواست فرمائی ہے۔

یا اس لیے کہ گناہ میں سیاہی ہوتی ہے اور برف اور اولے سفید، تو اس طرف اشارہ ہے کہ مغفرت سے گناہ کی سیاہی، سفیدی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دوسری درخواست یہ فرمائی کہ اے اللہ! میرے دل کو اس طرح صاف کر دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میرے دل کو باطنی گناہوں اور خطاؤں سے صاف کر دے اور یہ باطنی گناہ، برے اخلاق اور اور گندی عادات ہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”میرے دل کو اس طرح صاف فرما دے جیسے سفید کپڑے کو میل

سے صاف کیا جاتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلب اصل

فطرت کے اعتبار سے سلیم، نظیف اور سفید ہوتا ہے؛ لیکن گناہوں کے

ارتکاب اور عیوب سے اپنے آپ کو ملوث کر لینے کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے۔“ (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل گناہوں کی وجہ سے کالا اور سیاہ ہو جاتا ہے اور اخلاق رذیلہ اور ردی عادات سے اس کا اصلی رنگ و روپ بگڑ جاتا ہے۔ لہذا اس کی اصلاح کے لیے جہاں محنت و مجاہدہ درکار ہے، وہیں اللہ سے دعا کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ کسی کی محنت و مجاہدہ اور عمل و تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب نہ فرمائے۔ لہذا سنت نبوی کے مطابق دل کی صفائی کے لیے الحاح و زاری کے ساتھ اللہ سے دعا بھی کرنا چاہئے۔

دعا و اختتام:

ان چند گذارشات پر اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ظاہر و باطن دونوں کو سنوارنے اور شریعت کے مطابق ان کو ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے اور ظاہر سے زیادہ باطن کی طرف توجہ کی توفیق عطا فرمائے۔ جیسا کہ حدیث میں دعا ہے کہ:

« اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِنْْ عَلَانِيَّتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَّتِيْ صَالِحَةً. »

(ترجمہ: اے اللہ میرے باطن کو ظاہر سے بہتر بنا دے اور میرے ظاہر کو صالح بنا دے۔)

فقط

محمد شعیب اللہ

یکم ربیع الاول ۱۴۲۰ھ جون ۲۰۰۰ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرف آغاز

الحمد لولیه والصلوة علی نبیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔
 اما بعد: ایک مسلمان پر جہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ضروری و فرض ہیں اور جھوٹ، دھوکہ دہی، رشوت، وسوسہ جیسی برائیاں حرام ہیں، اسی طرح اس پر اخلاص، حب الہی، خوف الہی، صبر و شکر، اعتماد و توکل علی اللہ، وغیرہ قلبی اعمال بھی ضروری ہیں اور حب مال، حب جاہ، کینہ، حسد، تکبر، ریاکاری وغیرہ روحانی برائیاں حرام و ناجائز ہیں، شریعت میں ظاہری اعمال کے احکام کے ساتھ باطنی اعمال کے احکام بھی آئے ہیں، اپنے آپ کو ان دونوں قسم کے احکام کا پابند بنانے کے لیے جس راستہ پر چلتے ہیں اور وہ یقیناً صراطِ مستقیم ہے، اسی کو سلوک کہا جاتا ہے۔

زیر نظر رسالہ میں ”راہ سلوک“ کی ضرورت و اہمیت کے ساتھ، اس راہ کے مسافرین کے لیے مختصر پروگرام و نظام اور اس راہ کی ضروریات و لوازمات، اور اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور پریشانیوں کو قرآن، حدیث اور بزرگانِ امت کے اقوال و ارشادات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

اگرچہ اس مضمون کا بہت پہلے سے خیال تھا؛ مگر ہجوم افکار و کثرتِ کار کے باعث اس خیال کو عملی جامہ پہنایا نہ جاسکا تھا۔ مگر قریب میں اللہ تعالیٰ نے ایک موقعہ

فرصت کا عطا فرمایا تو اس کو اس کام کے لیے غنیمت سمجھا، وہ یہ کہ جامعہ ”مسیح العلوم“ میں ششماہی امتحان کے بعد حسب معمول تعطیل ہوئی تو جامعہ کے استاذ مولوی آصف اقبال صاحب عمری نے ان کے گھر (گنگھیری، کرشناگری) چلنے کی دعوت دی، تو ۵، ربیع الآخر ۱۴۲۲ھ بروز منگل، گنگھیری حاضری ہوئی۔ دل باغ و بہار ہو گیا کہ اس چھوٹی سی آبادی کے گاؤں میں باغات اور کھیتوں، پہاڑوں اور جھیلوں کے درمیان کھلی فضا اور خوش گوار موقعہ پر موصوف کا گھر واقع ہے، جو اپنی سادگی اور قدامت کے ساتھ ساتھ، صفائی، ستھرائی، سلیقہ مندی اور تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہے۔ دو دن یہاں گزارنا تھا تو خیال ہوا کہ اس فرصت میں اُس خیال کہن کو لباس تازہ پہنا کر عملی شکل دیدوں۔ الحمد للہ اس رسالہ کا بنیادی مسودہ دو دن کے مابین مختلف اوقات میں جن کی مجموعی مقدار پانچ چھ گھنٹے ہوگی، تیار ہو گیا۔ پھر گھر واپسی کے بعد حوالجات و ضروری تشریحات کے ساتھ اس کو مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مفید و نافع بنائے اور ہم سب کو اپنے قرب و رضا کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

(الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم)

۵، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ ۲۷، جولائی ۲۰۰۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہر مومن، قانون شرع کا پابند ہے

ہر مومن کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا مکلف و پابند بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و طریقہ کے مطابق گزارے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾
(النِّسَاءُ: ۵۹)

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اور اولی الامر (یعنی علما و حکام کی اطاعت کرو۔)
ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُبِينًا﴾
(الْأَحْزَابُ: ۳۶)

(کسی مومن مرد یا عورت کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان (مومنین) کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی

نافرمانی کرتا ہے، وہ کھلی گمراہی میں ہے۔)

ایک جگہ کامیابی و نجات کے اصول کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ (نور: ۵۲)

(اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی

اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، ایسے ہی

لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر چارہ کار نہیں اور مومن کو خدا اور رسول کے احکام و فیصلوں کا پابند رہنا ضروری ہے، وہ آزاد نہیں ہے اور اسی اطاعت میں اس کی کامیابی پوشیدہ ہے۔

اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

« لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَاَلِدِهِ

وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ. » (۱)

(تم میں سے کوئی (کامل) مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب

تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اولاد اور تمام لوگوں سے

زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔)

ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ:

« لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ

بِهِ. » (۲)

(۱) بخاری: ۵، مسلم: ۶۳، نسائی: ۴۹۲۷، ابن ماجہ: ۶۶، احمد: ۱۳۴/۲

(۲) مشکوٰۃ: ۳۰، الاربعین النوویۃ: ۴۱

(تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش،
میری لائی ہوئی تعلیم کے تابع نہ ہو جائے۔)

ایک حدیث میں ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تین آدمی خدا کے نزدیک سب سے
زیادہ مغضوب و ناپسندیدہ ہیں ایک حرم میں الحاد یعنی ظلم کرنے والا، دوسرا اسلام میں رہ
کر جاہلیت کا طریقہ تلاش کرنے والا اور تیسرا بغیر حق کے کسی مسلمان آدمی کے خون
کا مطالبہ کرنے والا تا کہ اس کا خون بہائے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے:

« كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قِيلَ: وَمَنْ أَبَى
قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى. » (۲)
(میرے تمام امتی جنت میں داخل ہوں گے، سوائے اس کے جس
نے انکار کیا، آپ سے پوچھا گیا کہ انکار کرنے والا کون ہے؟ فرمایا کہ
جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری
نافرمانی کی، اس نے انکار کیا۔)

بہ طور نمونہ چند احادیث یہاں نقل کی گئی ہیں، ورنہ اس مضمون پر احادیث کا دفتر
کا دفتر موجود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کے بغیر چارہ کار نہیں۔
لہذا ہر مسلمان کو اپنے ہر معاملہ میں اللہ اور رسول کے احکام و قوانین کو مد نظر رکھ کر کام
کرنا چاہئے اور کسی بھی معاملہ میں اس کو من مانی و آزاد زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔

(۱) بخاری: ۶۸۸۲

(۲) بخاری: ۷۲۸۰، احمد: ۸۳۷۳

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کی بندگی اور رسول اللہ کی پیروی، زندگی کے تمام احوال و امور میں کرنا ضروری ہے۔ ظاہری امور میں بھی اور باطنی امور میں بھی عقائد و ایمانیات میں بھی اور اعمال و عبادات میں بھی، معاشرت و سماجیات میں بھی اور اخلاق و کردار میں بھی، آپسی معاملات میں بھی اور سیاسی امور میں بھی، اس لیے کہ دین و شریعت مکمل ہیں، جن میں سب کچھ ہے۔ لہذا تمام امور میں اللہ کی بندگی اور رسول اللہ کی پیروی لازم و ضروری ہے۔

شریعت میں ظاہری و باطنی دونوں قسم کے احکام ہیں

دین کے دو اہم اور بنیادی حصے ہیں، ایک کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے اور دوسرے کا تعلق باطنی اعمال سے ہے۔

ظاہری اعمال جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ، وغیرہ، اور باطنی اعمال جیسے اخلاص، تواضع، حُب خداوندی، عشق محمدی، خوفِ الہی، توکل، انابت، خشیت، تقویٰ وغیرہ، جس طرح ہم کو ظاہری عبادات و اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے، اسی طرح ہم کو باطنی عبادات و اعمال کا بھی مامور کیا گیا ہے اور قرآن و حدیث میں بے شمار نصوص، اس پر دلالت کرتی ہیں۔

مثلاً اخلاص کی ضرورت و اہمیت اور اس کے بالمقابل ریاء و سمعہ کی مذمت اور برائی، قرآن و حدیث میں جگہ جگہ آئی ہے۔ اور یہ اخلاص قلبی عمل و عبادت ہے اور ریاء کاری قلبی مرض و بیماری ہے۔
قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءُ﴾

(البینۃ: ۵)

(اور لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا؛ مگر اس بات کا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ دین کو خالص اللہ کے لیے کر دیں اور یہ کہ اسی کی طرف توجہ کرنے والے ہوں۔)
اس آیت میں بتایا گیا کہ عبادت میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے۔
اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ،
الَّذِينَ هُمْ يُرَاوْنَ﴾ (الماعون: ۵)

(پس ان نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں اور جو ریا کاری کرتے ہیں۔)
اس آیت میں ریا کاری سے عبادت کرنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے اور وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح حدیث کی طرف آئیے، ایک حدیث میں فرمایا:
”اللہ تعالیٰ اعمال میں سے نہیں قبول کرتا؛ مگر صرف وہ جو خالص اس کے لیے ہو۔“ (۱)

اور ریا کاری کی مذمت میں آیا ہے:
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اور لوگوں میں شہرت کے لیے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن لوگوں میں ذلیل و رسوا کریں گے۔“ (۲)

(۱) الترغیب: ۵۵/۱

(۲) الترغیب: ۶۵-۶۶/۱

اسی طرح محبت خداوندی اور عشق نبوی ضروری ہے، بغیر اس کے ایمان کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا، پھر یہ اللہ و رسول کی محبت، ساری محبتوں پر غالب ہونا بھی لازم ہے، بغیر اس کے ایمان کامل نہیں ہوتا، چنانچہ قرآن و حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔
ایک جگہ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (البقرة: ۱۶۵)

(جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔)
اور حدیث میں ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (حوالہ اوپر گزر چکا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ:
«لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا نَفْسِي الَّتِي بَيْنَ جَنْبِي.»

(کہ آپ میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میرے نفس کے جو کہ میرے پہلو میں ہے۔)
آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مجھے اپنے نفس سے زیادہ محبوب نہ سمجھے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے۔ میرے نزدیک آپ میرے نفس سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ نے اس پر فرمایا کہ: الْآنَ يَا عُمَرُ! کہ ہاں اب بات بنی اے عمر رضی اللہ عنہ۔ (۱)

معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول ﷺ نے محبت شدید و غالبہ ہونا، مطلوب ہے اور یہ بھی عملِ قلب ہے۔

اسی طرح حیا ہے، جس کے بارے میں حدیث میں ہے:

« الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ. »

(کہ حیا ایمان کا جزء ہے۔) (۱)

اور اس کے بالمقابل بے حیائی کی مذمت آئی ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ انبیاء سابقین کی جو بات لوگوں تک پہنچی ہے ان میں سے ایک یہ کہ اگر تجھے حیا ہی نہ ہو تو جو چاہے کر۔ (۲)

معلوم ہوا کہ حیا اسلام میں پسندیدہ عمل ہے۔ اور بے حیائی و بے شرمی، ناپسندیدہ عمل ہے۔ اور اس عمل کا تعلق بھی قلب و دل سے ہے۔ اسی طرح خوف خداوندی ایک محبوب و مطلوب عمل ہے۔ اور بے خوفی ایک خوفناک عمل، قرآن میں فرمایا گیا:

(البَقَرَةُ: ۱۵۰)

﴿وَإِخْشَاؤُنِي﴾

(کہ مجھ سے ڈرو۔)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے:

« مَنْ خَافَ أَذْلَجَ وَمَنْ أَذْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ، إِلَّا إِنَّ سِلْعَةَ

اللَّهِ غَالِيَةٌ إِلَّا إِنَّ سِلْعَةَ اللَّهِ الْجَنَّةُ. » (۳)

(۱) بخاری الايمان: ۲۲، مسلم: ۵۲، ترمذی: ۲۵۴۰، نسائی: ۴۹۴۷

(۲) بخاری: ۳۴۸۳، ابوداؤد: ۴۱۶۲، ابن ماجہ: ۴۱۷۳، احمد: ۱۶۴۷۰

(۳) ترمذی: صفة القيامة: ۲۳۷۴

(جس نے خوف کیا، وہ رات ہی سے چلنا شروع کر دیا۔ اور جو رات سے چلا تو منزل کو پہنچ گیا، سن لو کہ اللہ کا سودا گراں ہے۔ اور سن لو کہ اللہ کا سودا جنت ہے۔)

اس میں خوف کا فائدہ بتایا ہے کہ خوف کرنے والا پہلے ہی تیار ہو کر چل پڑتا ہے، اسی طرح اللہ سے خوف کرنے والا، پہلے ہی سے نیکی کی طرف چل پڑتا ہے، نیز ایک طویل حدیث میں ان سات افراد کا ذکر کیا گیا ہے، جن کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دی جائے گی، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو اللہ کے ڈر سے روتا ہو۔ (۱) معلوم ہوا کہ خوف خداوندی، ایک پسندیدہ اور مطلوب عمل ہے، اسی طرح توکل رضا بالقضاء، تواضع، وغیرہ صفات حمیدہ مطلوب ہیں اور ان کے بالمقابل بری صفات مذموم و ممنوع ہیں، جن کی تفصیل قرآن و حدیث میں موجود ہے، غرض کہ جس طرح ہم ظاہری عبادات و اعمال کے مکلف ہیں اسی طرح ہم باطنی عبادات و اعمال کے بھی مکلف ہیں، جیسا کہ اوپر کی وضاحت و تفصیل سے معلوم ہو گیا۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ بات سمجھ لیں کہ شریعت کے اسی باطنی حصہ کی تحصیل اور ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کا نام سلوک و تصوف ہے۔ میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ اپنی کتاب شریعت و تصوف میں فرماتے ہیں:

”شریعت کا وہ جو جو اعمال باطنی سے متعلق ہے، تصوف و سلوک کہلاتا ہے..... گویا کہ تصوف دین کی روح و معنی یا کیف و کمال کا نام

(۱) بخاری، الرقاق: ۶۴۷۹، مسلم الزکاة: ۱۷۱۲، ترمذی، الزہد: ۲۳۱۳، نسائی:

آداب القضاء: ۵۲۸۵، احمد: ۹۲۸۸، مالک: ۱۵۰۱

ہے، جس کا کام باطن کو زائل یعنی اخلاق ذمیمہ، شہوت، آفات لسانی، غضب، حقد، حسد، حب دنیا، حب جاہ، بخل، حرص، ریاء، عجب، غرور سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ، توبہ، صبر، شکر، خوف، رجا، زہد، توحید و توکل، محبت، شوق، اخلاص، صدق، مراقبہ، محاسبہ و تفکر سے آراستہ کرنا ہے، تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے جو مقصود حیات ہے۔“ (۱)

سلوک کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ دین کے دو اجزا ہیں اور دونوں ہی کے ہم مکلف ہیں۔ تو اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دین کے ان دونوں اجزا پر جب تک عمل نہ ہوگا ہماری دین داری نامکمل و ناقص ہے؛ لہذا دینداری میں کمال بدون سلوک میں داخل ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری ہے کہ ہر مومن اعمال و عبادات ظاہرہ کے ساتھ ساتھ، اعمال و عبادات باطنہ کی تحصیل میں بھی لگے؛ اس لیے کہ دونوں ہی فرض و ضروری ہیں۔ بل کہ فی الواقع اعمال باطنہ، اعمال ظاہرہ کے لیے بمنزلہ روح کے ہیں مثلاً نماز کے ظاہری ارکان، (قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، وغیرہ) اور آداب و سنن کے ساتھ، اگر روح اخلاص نہ ہو اور خشوع و خضوع نہ ہو تو وہ نماز، بے روح ڈھانچہ کی طرح ہے۔ اسی طرح اور عبادات و اعمال کا مقصود بھی وہی باطنی اعمال ہیں۔ اس لیے اس کی تحصیل کے لیے آدمی کو پوری توجہ اور ہمت سے کام لینا چاہئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلوک میں مجاہدہ کی اہمیت

اوپر کی تفصیل نے یہ واضح کر دیا کہ کوئی آدمی اس راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے مطابق کرنے اور بنانے کا عزم و ارادہ کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہے، جو کہ ایک مبارک عزم اور خوش آئند اقدام ہے، اسی قصد و عزم اور کوشش و محنت کو شریعت میں مجاہدہ کہتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کامیابی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ

الْمُحْسِنِينَ﴾ (الْجَنْبُوتُ: ۶۹)

(جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ضرور ان کو ہمارے راستے دکھاتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔)

اس آیت کے بارے میں علما کے دو قول ہیں، بعض نے اس سے کفار سے جہاد کرنا مراد لیا ہے۔ (۱)

اور بہت سے علما نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ جہاد نہیں؛ بل کہ اس سے مراد جہادِ با نفس ہے؛ چنانچہ حضرت ابن عطیہ رحمۃ اللہ نے فرمایا یہ آیت عرفی جہاد کے حکم سے

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۶۱/۱۰

پہلے نازل ہوئی ہے اور اس سے مراد اللہ کے دین اور اللہ کی مرضیات کی طلب میں کوشش و مجاہدہ ہے اور ابوسلیمان دارانی رَحْمَةُ اللہِ نے فرمایا کہ آیت میں صرف جہاد بالکفار مراد نہیں ہے؛ بل کہ دین کی نصرت اور باطل پرستوں کی تردید اور ظالموں کا قلع قمع کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی اس میں داخل ہے اور اس میں اللہ کی اطاعت میں نفس کا مجاہدہ بھی داخل ہے۔ اور یہ جہاد اکبر ہے اور حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہماری اطاعت میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو ہمارے ثواب کا راستہ بتاتے ہیں۔ (۱)

غرض یہ کہ اس آیت میں مجاہدہ کا ذکر ہے اور اس پر وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راستہ کھولے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزل مقصود تک اس کو پہنچایا جائے گا؛ کیوں کہ راستہ دکھانا اور کھولنا تو اسی لیے ہوتا ہے کہ منزل تک رسائی ہو ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

« يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي ، فَإِنْ ذَكَرْنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرْنِي فِي مَلَأٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرِ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِ رَاعاً وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِ رَاعاً تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعاً وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً. »

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں میرے بندے کے گمان کے پاس ہوں جو وہ مجھ سے رکھتا ہے۔ (یعنی میں اس کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں) اگر وہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو اس کے ساتھ

(۱) تفسیر قرطبی: ۳۶۴/۱۳-۳۶۵/۱۳

ہوتا ہوں، اگر وہ مجھ کو دل میں یاد کرتا ہے، تو میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ کو کسی مجمع میں یاد کرتا ہے، تو میں اس کو اس سے بہتر (فرشتوں کے) مجمع میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے، تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ (۱)

اس حدیث پاک میں جو فرمایا کہ جو اللہ کی طرف قریب ہو گیا چلے گا تو اس سے مراد وہی مجاہدہ ہے: کہ آدمی مجاہدہ کے ذریعہ جب اللہ سے قریب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے قریب ہوتے ہیں یعنی اپنی رضا و ثواب سے نوازتے ہیں علمائے سلوک و اولیائے اللہ نے فرمایا کہ بغیر مجاہدہ کے اس راہ میں کامیابی نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ۔ چنانچہ امام قشیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”جان لو کہ جو آدمی اپنے ابتدائی مرحلہ میں صاحب مجاہدہ نہیں ہوتا وہ اس راہ کی بوجھ بھی نہیں پاسکتا۔“ (۲)

امام قشیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”جس آدمی نے یہ گمان و خیال کیا کہ بغیر مجاہدہ و ریاضت کے اس راہ میں سے کچھ اس پر کھول دیا جائے گا تو وہ غلطی میں ہے۔“ (۳)

اسی سلسلے میں حضرت حسن القزازی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) بخاری: ۷۴۰۵، مسلم: ۴۸۳۲، ترمذی: ۳۵۲۷، احمد: ۸۹۸۳، ابن ماجہ مختصراً: ۳۸۱۲

(۲) رسالہ قشیریہ: ۱۳۳

(۳) رسالہ قشیریہ: ۱۳۴

”یہ راستہ (سلوک و تصوف کا) تین باتوں پر مبنی ہے، ایک یہ کہ بغیر سخت حاجت کے نہ کھائے، دوسری یہ کہ بغیر نیند کے غلبہ کے نہ سوئے اور تیسری یہ کہ بغیر ضرورت کے نہ بولے۔ (۱)

غرض یہ کہ آدمی جب تک کھانے پینے اور نیند کی قربانی دے کر اور زبان کو قابو میں رکھ کر مجاہدہ نہ کرے گا، اس وقت تک یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ لہذا اے سالک اگر تو نے اس راہ کو طے کرنا پسند کیا ہے اور اللہ کا قرب اور اس کی رضا چاہتا ہے تو مجاہدہ کر اور آگے بڑھ۔

مجاہدہ کی حقیقت

مجاہدہ کے معنی ہیں ”نفس کی مرادات اور مرضیات کے بہ جائے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرادات و مرضیات پر چلانے کی کوشش کرنا“ اس کے دو اجزاء ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر نفس کو چلانا، اگرچہ نفس ان پر چلنا نہ چاہے اور ایسی باتوں کو مامورات کہتے ہیں۔ پھر یہ مامورات بھی دو قسم کے ہیں: ایک ظاہر سے متعلق دوسرے باطن سے متعلق، جن کی تفصیل اوپر عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے یہ کہ اللہ و رسول ﷺ نے جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے نفس کو بچانا اور دور رکھنا، ایسی باتوں کو منہیات کہتے ہیں، پھر یہ منہیات بھی دو قسم کے ہیں ایک ظاہر سے متعلق جیسے: سود، جھوٹ، رشوت، شراب نوشی، زنا کاری

وغیرہ، دوسرے باطن سے متعلق جیسے ریاء کاری، بے خونی، تکبر، حسد، کینہ، بغض وعداوت، حب دنیا، حب جاہ، حرص، بخل، غرور و عجب وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ اللہ و رسول ﷺ نے جن باتوں کو اختیار کرنے اور بجالانے کا حکم دیا ہے۔ ان پر نفس کو چلانا اور پابند بنانا اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے بچانا اور دور رکھنا، مجاہدہ کہلاتا ہے اور اس کو جہاد اکبر بھی کہتے ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

« الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ لِلَّهِ. » (۱)

(مجاہد وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے۔)

علامہ مناوی رحمۃ اللہ نے علامہ علائی رحمۃ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور اس کی سند جید ہے۔ (۲)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مجاہد اس کو قرار دیا ہے جو اپنے نفس سے اللہ کے لیے جہاد کرے اور ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ جہاد سے واپسی پر صحابہ کرام سے فرمایا کہ:

« رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ. » (۳)

(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔)

غرض یہ کہ کفار کے ساتھ جہاد سے بھی بڑا جہاد نفس کا مقابلہ کرنا ہے کیوں کہ جو آدمی نفس کے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ غیروں کو اللہ کے دین کی طرف لانے کی

(۱) کتاب الزہد لابن المبارک: ۴۶۳، ترمذی: ۱۵۴۶، احمد: ۲۲۸۲۶

(۲) فیض القدیر: ۲۶۲/۶

(۳) تخریج الاحیاء للعراقی: ۷/۳

کیا کوشش کرے گا اور ان کا کس طرح مقابلہ کرے گا؟

لہذا سالک کو چاہئے کہ نفس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کو اللہ کے اوامر پر آمادہ کرے اور شہوات و خواہشات سے اس کو روک کر رکھے یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے حضرت ابوالعباس السیاری رحمۃ اللہ سے پوچھا گیا کہ مرید اپنے نفس کے ساتھ کس چیز کے ذریعہ مجاہدہ و ریاضت کرے؟ فرمایا کہ اوامر پر جمے رہے ممنوعات سے بچنے اور صالحین کی صحبت اور فقراء کی خدمت سے۔ (۱)

یہیں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سالک کو جہاں اوامر کی اطاعت و تعمیل ضروری ہے وہیں ممنوعات و محرمات سے پرہیز بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ نیکیاں تو کر لیتے ہیں؛ مگر گناہوں سے نہیں بچتے سالک کے لیے یہ سخت مضر ہے۔ اگر نیکیاں غذا اور دوا کی طرح ہے تو گناہوں سے بچنا پرہیز کی طرح ہے۔ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کی بتائی ہوئی غذا اور دوا تو پابندی سے کھائے؛ مگر جو پرہیز کی چیزیں بتائی گئیں ان سے نہ بچے تو اس کو کب صحت ہو سکتی ہے؟ اس لیے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ نیک کام تو اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ کر لیتے ہیں، چنانچہ نماز جس طرح نمازی پڑھتا ہے، بہت سے شرابی، کبابی بھی پڑھ لیتے ہیں؛ مگر گناہ سے بچنا صرف متقی و پرہیزگار لوگوں کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اللہ کی ولایت صرف متقی لوگوں کو ملتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّ أَوْلِيَاءَ وَهٖ إِلَّا الْمُتَّقُونَ﴾ (الأنفال: ۳۴)

(اللہ کے دوست صرف وہ ہیں جو گناہ سے پرہیز کرتے ہیں۔)

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نیکی و عبادت کا نور اسی وقت باقی رہتا ہے جب کہ

گناہوں سے بچا جائے، ورنہ وہ نور زائل ہو جاتا ہے؛ بل کہ بعض گناہوں کے اثر سے نیکیاں سوخت ہو جاتی ہیں، جیسے حسد کہ اس کے بارے میں حدیث میں ہے:

« إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ

الْحَطَبَ. » (۱)

(حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔)

مرشدنا حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ ایک دفعہ کار میں بیٹھ کر تشریف لے جا رہے تھے، سخت گرمی تھی اور کار میں اے۔سی۔ (A.C) بھی چالو کر دیا گیا؛ مگر بہت دیر ہونے کے باوجود ٹھنڈک پیدا نہیں ہوئی تو ڈرائیور نے کہا کہ کوئی دریچہ کا گلاس پوری طرح بند نہیں ہوگا اسی لئے اے، سی کام نہیں کر رہا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا تو ایک طرف کا گلاس تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جب اس کو بند کیا گیا تو اے، سی نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ اور کار میں ٹھنڈک آگئی اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ اس واقعہ سے عبرت لیجئے کہ جب تک یہ دریچہ کھلا تھا کار میں ٹھنڈک نہیں آئی اسی طرح اگر آنکھوں اور کانوں وغیرہ کے یہ دریچے اور شیشے کھلے رہیں گے تو دل میں ایمان کی ٹھنڈک محسوس نہیں ہو سکتی۔ لہذا حرام چیزوں سے ان آنکھوں اور کانوں اور زبان وغیرہ کو بند رکھنا چاہئے۔ غرض گناہوں سے بچنا بھی سالک کا اہم کام اور مجاہدہ کا اہم جز ہے۔ خواہ وہ ظاہری گناہ ہوں یا باطنی گناہ ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سالک کا پہلا قدم-توبہ

جب کسی اللہ کے بندے کو اللہ تعالیٰ اس راستہ کی طرف رہنمائی فرمائیں اور اس کے دل میں اس کا جذبہ پیدا فرمائیں تو سب سے پہلے اس کو اپنی کچھلی زندگی سے توبہ کرنا چاہئے، توبہ سالکین کے منازل میں سے اول منزل اور طالبین کے مقامات میں سے اولین مقام ہے۔

توبہ کی فضیلت و ضرورت بے شمار آیات و احادیث سے ثابت ہے؛

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾
(نور: ۳۱)

(تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو، اے مومنو! تاکہ تم کامیاب ہو سکو۔)

اور حدیث میں ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو اور اس سے گناہوں کی معافی چاہو کہ میں بھی دن میں سو دفعہ توبہ کرتا ہوں۔^(۱)
ایک اور حدیث میں ہے:

(۱) مسلم: ۱۲۸۷۱، احمد: ۱۷۱۷۳

« إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيئُ النَّهَارِ،
وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيئُ اللَّيْلِ حَتَّى تَطْلُعَ
الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا. »

(اللہ تعالیٰ رات میں (اپنی رحمت کا ہاتھ) پھیلاتے ہیں تاکہ دن
کا گنہگار توبہ کر لے اور دن میں ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ رات کا گنہگار
توبہ کر لے) (یہ توبہ کا سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ سورج مغرب کی
طرف سے طلوع ہو۔) (۱)

لہذا سب سے پہلے آدمی کو اپنے تمام صغیرہ و کبیرہ کھلے و چھپے ظاہری و باطنی
گناہوں سے توبہ کرنا چاہئے، توبہ کی حقیقت تین چیزیں ہیں:

- (۱) اپنے گناہوں پر ندامت و پشیمانی کا احساس۔
- (۲) تمام گناہوں سے فی الفور و فی الحال دوری و علاحدگی۔
- (۳) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور پختہ ارادہ۔ (۲)

جب آدمی سچے دل سے اس طریقہ پر توبہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس بندہ کو معافی
و بخشش عطا فرماتے ہیں اور اس سے راضی و خوش ہو جاتے ہیں، چنانچہ حدیث میں
ہے کہ:

اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ پر جب کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرے، اس آدمی سے
زیادہ خوش ہوتے ہیں جو جنگل میں اپنی سواری پر تھا اور اس پر اس کا کھانا پینا بھی تھا
پس وہ سواری گم ہو گئی، وہ آدمی مایوس ہو کر ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا۔ اسی

(۱) مسلم: ۴۹۵۴، احمد: ۱۸۷۰۸

(۲) ریاض الصالحین: ۱۱، رسالہ قشیریہ: ۱۲۸

درمیان اس نے دیکھا کہ اس کی وہ سواری اس کے پاس کھڑی ہے۔ اور خوشی میں اس اونٹنی کو پکڑا اور خوشی کے غلبہ میں غلطی سے کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب۔

(اس بندے کی خوشی سے زیادہ اللہ کو توبہ پر خوشی ہوتی ہے۔) (۱)

ایک حدیث میں ہے:

«التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ.» (۲)

(کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔)
غرض سچے دل سے توبہ کرنے کی ضرورت ہے بغیر اس کے آگے بڑھنا ممکن نہیں: بعض لوگ صحیح طریقہ سے توبہ کئے بغیر آگے بڑھنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں پھر جب ترقی نہیں دیکھتے تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں؛ لہذا ہر سال کو چاہیے کہ وہ سب سے اول قدم و سیڑھی سمجھ کر صحیح طور پر توبہ کرے۔
توبہ کے بارے میں علماء فرماتے ہیں:

”گناہ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن سے حقوق اللہ میں فتور و خلل پڑ جاتا ہے دوسرے وہ جن سے حقوق العباد میں خلل ہو جاتا ہے، جہاں تک حقوق اللہ سے متعلق گناہوں سے توبہ ہے تو وہ اللہ سے ندامت کے ساتھ سچے دل سے معافی مانگنے سے ہو جائے گی اور ان میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج کے ادا کرنے میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کو اب ادا کر دینا چاہئے، نمازوں کا حساب لگا کر روزانہ کچھ نہ کچھ نمازیں

(۱) مسلم: ۴۹۲۹، بخاری: ۶۳۰۸، ترمذی: ۶۴۲۲

(۲) ابن ماجہ: ۴۲۴۰

قضاء پڑھ لے اسی طرح روزے جو چھوٹ گئے ہوں ان کی قضا کرے
اور زکوٰۃ ادا کرنے میں غفلت ہوئی ہو تو جتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو
جلد اس کو ادا کر دے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہ کیا ہو تو جلد سے
جلد اس کو بھی ادا کر دے۔ اسی طرح تمام عبادات کا جائزہ لیکر ان کی کو
تاہیوں کا تذکرہ کرے۔“

اور رہے وہ حقوق جن کا تعلق بندوں سے ہے ان کی کوتاہیوں سے توبہ کا طریقہ
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معافی کے ساتھ ان لوگوں سے بھی معافی مانگنا چاہیے جن کی
حق تلفی کی ہے۔ مثلاً کسی کی غیبت کی تھی تو اس سے بھی معافی مانگے جس کی غیبت کی
ہے؛ اسی طرح اگر کسی کی کوئی چیز غصب یا چوری کی ہو تو اس کو معافی کے ساتھ واپس
کرے، یہ ہے توبہ کا مکمل طریقہ جس کو حضرات علماء نے بیان کیا ہے۔

توبہ کرنے کے بعد (جیسا کہ اوپر حدیث کی روشنی میں بتایا گیا) آدمی گناہوں
سے پاک و صاف ہو جاتا ہے؛ لیکن اس کے بعد اگر پھر کچھ گناہ ہو جائے تو سالک کو
چاہئے کہ فوراً توبہ و استغفار کرے۔ مایوس ہو کر تعطلی کا شکار نہ ہو جائے۔ بعض
سالمکین توبہ کر کے کام شروع کرتے ہیں اور دوبارہ یا سہ بارہ گناہوں کا صدور ہو گیا تو
شیطان ان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتا ہے وہ یوں سمجھتا ہے کہ توبہ کی پھر
توبہ کو توڑ دیا۔ اب پھر کس منہ سے اللہ کی جناب میں جائے گا؟ اور کیسے تیری معافی
ہوگی؟

غالب کو شیطان نے یہی پٹی پڑائی تھی، چناں چہ غالب نے کہا تھا۔
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ شعر مایوسی بلکہ تعطلی پیدا کرتا ہے اور دراصل شیطانی وسوسہ ہے اس کے مقابلہ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ کے یہ اشعار سالک کو مشعل راہ بنانا چاہئے فرماتے ہیں۔

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
ان کو رو رو کے میں مناؤں گا
اپنی قسمت کو یوں بناؤں گا

لہذا سالک کو مایوس نہ ہونا چاہئے؛ بل کہ گناہ کے بعد پھر اسی در پر آنا اور گڑ گڑانا اور معافی مانگ کر اس اللہ کو منانا چاہئے اور رو کر منانا چاہئے اور شرم کو خاک میں ملانا چاہئے۔

ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرید نے توبہ کی پھر چند دنوں بعد برائی کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بعد ایک دن غور کرنے لگا کہ اگر میں پھر توبہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس پر غیب سے آواز آئی کہ: یا فلاں!

”اَطَعْتَنَا فَشَكَرْنَاكَ، ثُمَّ تَرَكْتَنَا فَأَمْهَلْنَاكَ، وَإِنْ عُدْتَ إِلَيْنَا قَبْلُنَاكَ“.

(اے فلاں! تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم نے تجھے جزاء دی پھر تو نے ہم کو چھوڑ دیا تو ہم نے تجھ کو مہلت دی اور اگر تو پھر ہماری طرف لوٹ آئے گا تو ہم تجھے قبول کر لیں گے۔)

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ نے اللہ سے یوں عرض کیا:

”اے اللہ! میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے توبہ کی اور پھر گناہ نہ کروں گا کیوں کہ میں میری فطرت کو جانتا ہوں اور نہ میں اس بات کی ضمانت

دیتا ہوں کہ گناہ چھوڑ دوں گا؛ کیوں کہ میں میرے ضعف و کمزوری کو جانتا ہوں؛ لیکن میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میں پھر گناہ نہیں کروں گا کہ ہو سکتا ہے کہ دوبارہ گناہ سے پہلے میں مرجاؤں۔ (اور وعدہ پر قائم رہ جاؤں۔) (۱)

غرض یہ کہ اگر سالک سے گناہ ہو جائے تو مایوس نہ ہو اور اپنی عاجزی اور ضعف و کمزوری کو اللہ کے سامنے پیش کرے کہ اے اللہ میں اتنا کمزور ہوں اور بد خلقی و بد اطواری کا شکار ہوں کہ بار بار توبہ توڑ رہا ہوں اور پھر بھی وعدہ تو نہیں کر سکتا کہ پھر گناہ نہ کروں گا مگر عزم کئے لیتا ہوں کہ نہ کروں گا۔
 بہ ہر حال! اللہ کے دربار کو چھوڑ انہیں جاسکتا ہے شرم بن کر پھر وہیں آنا ہے اور اللہ کو یہ ادا پسند آتی ہے۔

سالک کے لیے علم دین ضروری ہے

اس راہ کے سالک کو علم شریعت کے حاصل کیے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ وہ جس راہ پر چلنے کے ارادہ و عزم سے قدم بڑھا رہا ہے وہ راستہ شریعت و دین ہی کا راستہ ہے اور وہ قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہے لہذا دین و شریعت کا علم جب تک نہ ہوگا کوئی اس راہ کو طے نہیں کر سکتا۔

جابل صوفیوں نے اپنی جہالت سے یہ سمجھا اور سمجھایا ہے کہ یہ راہ سلوک و تصوف قرآن و حدیث سے ہٹ کر کوئی اور علم ہے اور وہ سینہ بسینہ آتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے چالیس پارہ ہیں اور دس پارے تصوف و معرفت کی

باتوں پر مشتمل ہیں اور وہ عام لوگوں کو نہیں دئے گئے اور یہ تئیں پارے شریعت کے علم پر مشتمل ہیں؛ مگر یاد رکھو یہ باتیں کافرانہ و جاہلانہ ہیں اور یہ لوگ دراصل صوفی نہیں شیطانی ہیں جو اولیائے اللہ اور صوفیائے کرام کے بھیس میں لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں جو اصلی و حقیقی صوفیاء کرام ہیں ان کے نزدیک قرآن و حدیث اور شرع شریف اصل ہے جس سے دین کے سارے امور نکلتے ہیں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ہمارا یہ راستہ و طریقہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے اصولوں سے مقید ہے۔

نیز فرمایا کہ ”جس نے قرآن پاک حفظ نہ کیا اور حدیث نہ لکھا اس کی اس راستہ میں اقتداء نہیں کی جائے گی۔ کیوں کہ ہمارا یہ (تصوف کا) علم کتاب و سنت سے مقید ہے۔ (۱)

اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”شریعت کے تین جزء ہیں۔ علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں جزء نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت متحقق ہوگئی تو حق تعالیٰ سبحانہ کی رضا جو تمام دنیوی و اخروی سعادتوں سے فائق و اعلیٰ ہے وہ بھی متحقق ہوگئی یعنی حاصل ہوگئی اس لیے کہ شریعت تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کی ضامن و کفیل ہے۔ اور کوئی مطلب و مقصود ایسا نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان اس کا محتاج ہو طریقت و حقیقت جس سے صوفیہ ممتاز ہیں دونوں شریعت کی خادم ہیں ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزء اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے لہذا ان دونوں سے بھی مقصود شریعت کی تکمیل ہے۔ نہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو۔“ (۲)

(۱) رسالہ قشیریہ: ۵۱

(۲) مکتوبات: ۳۶/۱

معلوم ہوا کہ علم شریعت اصل ہے اور اسی سے حقیقت و طریقت کے اسرار و رموز بھی معلوم ہوتے ہیں اور علم شریعت کے بغیر کوئی شخص اس راہ کو قطعاً طے نہیں کر سکتا۔ مشہور صوفی و بزرگ حضرت دادا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”کشف المحجوب“ میں فرماتے ہیں:

”علم و عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں لہذا علم کے ساتھ عمل ہمیشہ پیوست رہنا چاہیے۔ اسی طرح بغیر علم کے عمل رائیگاں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« الْمُتَعَبَّدُ بِلَا فِقْهِ كَالْحِمَارِ فِي طَاخُونَةٍ. »

(بے علم عبادت گزار اس گدھے کی مانند ہے جو آٹے کی چکی سے بندھا ہوا ہو) چکی سے بندھا ہوا گدھا اگر چہ دوڑتا ہے؛ مگر وہ اپنے محور ہی میں گھومتا رہتا ہے اور کوئی مسافت طے نہیں کر پاتا۔ (۱) اسی طرح ایک اور بزرگ اور صوفی حضرت احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

”جو عمل و کوشش شریعت کے خلاف کسی اور طریقے پر ہو اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اگر کوئی عابد پانچ سو برس تک خلاف شریعت عبادت کرتا رہا تو یہ عبادت اسی کے منہ پر ماری جائے گی اور اس کی گردن پر گناہ الگ ہوگا، جس شخص کو احکام دین کی سمجھ حاصل ہو اس کی دو رکعتیں اللہ کے نزدیک جاہل درویش کی دو ہزار رکعتوں سے افضل ہیں۔“ (۲)

(۱) کشف المحجوب: ۳۷

(۲) ارشادات حضرت رفاعی: ۶۷

معلوم ہوا کہ حضرات صوفیا کے نزدیک بھی بغیر علم شریعت کے کوئی اس راستہ کو طے نہیں کر سکتا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

« طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ » (۱)

(علم کا طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔)

اور علم کا حاصل کرنا مختلف صورتوں سے ہوتا ہے کسی عالم سے سبقاً سبقاً کوئی دینی کتاب پڑھے یا اس کی مجلس میں پابندی سے بیٹھ کر بغیر کتاب کے سن سن کر حاصل کرے یا کسی عالم سے پوچھ پوچھ کر حاصل کرے وغیرہ۔ غرض کسی بھی صورت سے علم دین ضرور حاصل کرے۔ حضرت احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا ہے اور اگر کسی جاہل کو ولی بناتے ہیں تو اس کو عالم بنا دیتے ہیں؛ ولی، دین کے علم سے جاہل نہیں ہو سکتا۔ بل کہ وہ خوب جانتا ہے کہ نماز کس طرح پڑھنا چاہئے، زکوٰۃ کس طرح دینا چاہئے، حج کس طرح کرنا چاہئے۔“ (۲)

اور جو بعض جاہل صوفی شریعت اور طریقت کو الگ الگ قرار دے کر دھوکہ دیتے ہیں؛ اس کے بارے میں بھی حضرت رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد سن رکھو کہ:

”طریقت“ شریعت کا عین ہے؛ مگر بعض لوگ اولیائے اللہ پر تہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طریقت اور شریعت الگ الگ ہیں۔“ (۳)

(۱) ابن ماجہ: ۲۲۰، مشکوٰۃ: ۳۴

(۲) ارشادات رفاعی: ۷۰

(۳) رموز رفاعیہ: ۳

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

تم ایسا مت کہو جیسا بعض جاہل صوفی کہا کرتے ہیں کہ ہم اہل باطن ہیں اور علما اہل ظاہر ہیں۔ یہ بات غلط ہے، کیوں کہ دین ظاہر و باطن دونوں کا جامع ہے اس کا باطن، ظاہر کا مغز ہے۔ اور ظاہر، باطن کا ظرف ہے یعنی اس کا محافظ ہے۔ (۱)

اوپر کی تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ اس راہ سلوک میں کتاب و سنت ہی کا علم رہبری کرے گا اور یہ کہ شریعت و طریقت آپس میں متخالف و متضاد نہیں ہیں؛ بل کہ شریعت کے ایک جزء کا نام طریقت ہے، لہذا اے سالک ان جاہل صوفیاء کی باتوں سے ہرگز دھوکہ نہ کھانا جو شریعت کو چھوڑ کر زندگی گزارتے اور احوال و کوائف اور وجد و استغراق کے دعوے کرتے اور کرب دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو نماز و دیگر عبادات معاف ہو گئیں ہم معرفت والے ہیں، حضرات صوفیاء نے بار بار اس پر تنبیہ کر دی ہے، کہ اس سلوک سے سوائے اتباع شریعت و حصول رضا کچھ مطلب نہیں ہے اور جو لوگ مذکورہ دعوے کرتے ہیں ان کی باتوں میں نہ آنے کی تلقین و ہدایت کی ہے۔

حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ کے ساتھ ایسے حال و تعلق کا دعویٰ کرے جو اس کو علم شرعی

کی حدود سے باہر کر دیتا ہے تو تو اس کے قریب بھی ہرگز نہ جانا۔“ (۲)

معلوم ہوا کہ شریعت کے خلاف کوئی حال و کیفیت کا دعویٰ کرے تو وہ صوفی نہیں ہے؛ بل کہ شیطانی ہے۔ لہذا اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے سامنے ایک شخص نے معرفت کی بات

(۱) ارشاد رفاعی: ۶۷

(۲) الرسالة القشیریہ: ۵۳

چھیڑی اور کہا کہ اہل معرفت اس حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ نیکی و عبادت اور قرب خداوندی کے کاموں (نماز، ذکر، وغیرہ) کو ترک کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ عبادات ان سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا:

”یہ ان لوگوں کا کہنا ہے جو اعمال و عبادات کے ساقط ہونے کی بات کرتے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ بڑا گناہ ہے اور جو شخص چوری کرتا اور زنا کرتا ہے وہ اس کہنے والے سے اچھا ہے۔“

نیز آپ نے فرمایا کہ یہ راہ سلوک، مخلوق پر بند ہے۔ سوائے اس شخص کے جو رسول اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی اتباع کرتا ہو۔ (۱)

غرض یہ کہ اصل چیز اتباع سنت و شریعت ہے، جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا اور اس کے بغیر کچھ بھی حاصل نہ ہوگا؛ لہذا سالک کو علم شریعت سے سستی و غفلت ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدرسہ میں داخلہ لے کر مکمل مولوی و عالم بننا ضروری ہے بلکہ مراد ضروری امور کی تحصیل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

عقائد سے متعلق تو حید و صفات باری تعالیٰ آخرت، تقدیر، رسالت و نبوت کے مسائل جاننا ضروری ہے؛ پھر نماز و روزہ کے احکام اور اگر مالدار ہو تو زکوٰۃ کے مسائل و احکام اور جس پر حج فرض ہو، اس کو حج کے احکام اور جو تاجر ہو تو خرید و فروخت کے مسائل جاننا لازم ہے، اسی طرح صنعت پیشہ و ملازمت پیشہ لوگوں پر اس کام سے متعلق احکام کا جاننا ضروری ہے، اسی طرح نکاح، طلاق کے مسائل جاننا اس پر ضروری ہے۔ جو نکاح کرنا چاہتا ہو، نیز اخلاق سے متعلق علم ضروری ہے جیسے

اخلاص، تواضع، وغیرہ تاکہ تکبر و ریا سے بچ سکے، اسی طرح حسد، کینہ بغض وغیرہ کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ ان اخلاقی برائیوں سے بچ سکے۔ (۱)

ان باتوں کی تفصیل علما سے پوچھ لینا چاہیے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور آدمی جاہل نہ رہے اور عبادت رائیگاں نہ جائے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شیخ کامل کی تلاش

سلوک و طریقت کا یہ راستہ نازک و لطیف راستہ ہے جس کا مقصد قرب و رضائے حق کا حصول ہے؛ اس کے لیے کسی متبع سنت شیخ کامل کی رہبری و رہنمائی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ دین کے اور علوم اور دنیا کے مختلف فنون میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے کہ ان کا حصول اور ان میں مہارت، ماہر علم و فن کی رہبری و رہنمائی سے ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتیٰ کے بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جاسکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہر گز کوئی خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدون کسی کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں ہو سکتا؛ اسی کو کہا ہے:

صحبتِ صالح ترا صالح کند ☆ صحبتِ طالح ترا طالح کند
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا ☆ گو نشیند در حضور اولیاء
یک زمانہ صحبتے با اولیاء ☆ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء
صحبتِ نیکان اگر یک ساعت است ☆ بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

مطلب یہ کہ نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنادے گی، اسی طرح بد بخت کی صحبت تم کو بد بخت بنادے گی جو شخص خدا تعالیٰ کی ہم نشینی کا طالب ہو تو اس کو اولیائے کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت سو سالہ بے ریا طاعت سے بہتر ہے نیکوں کی صحبت اگر ایک گھڑی بھی نصیب ہو جائے تو وہ سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ جس طرح دنیوی فنون اور دینی علوم سب میں سنت اللہ یہی ہے کہ رہبر و استاد کی رہنمائی میں حاصل ہوتے ہیں اسی طرح راہ سلوک بھی جو کہ لطیف و نازک راہ ہے کسی کی رہبری و رہنمائی میں طے ہوتی ہے۔
قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔)

اس میں اس جانب واضح اشارہ ہے کہ تقویٰ کا حصول جو کہ راہ سلوک کی اساس اور راس ہے؛ صادقین کی معیت و صحبت کے ذریعہ ہوتا ہے اور صادقین وہ ہیں جو قولاً فعلاً و حالاً ہر طرح اپنے اندر صدق و سچائی رکھتے ہوں۔

حضرت مرشدی مسیح الامت رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی، اقوال کو بھی اور احوال کو بھی، اقوال کا صدق یہ ہے کہ بات سچی اور سچی ہو، یعنی واقعہ کے مطابق ہو، جو شخص اس صفت سے موصوف ہو، اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو، حکم شرعی کے

خلاف نہ ہو، پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہتے ہیں اور احوال کا صدق یہ ہے کہ احوال سنت کے مطابق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہیں وہ احوال کا ذبہ ہیں اور جس کے احوال و کیفیات سنت کے مطابق ہوتے ہیں اس کو صادق الافعال کہتے ہیں۔“ (۱)

پس جو شخص ایسا ہو کہ اس کی زبان بھی شریعت کے مطابق چلتی ہے۔ اس کا عمل بھی شریعت کے موافق ہے اور اس کے احوال و کیفیات بھی شریعت کے دائرہ میں ہیں تو ایسا آدمی ”صادق“ کہلاتا ہے، اس کی صحبت و معیت مفید و معین ہوگی اور تقویٰ کا راستہ اس سے معلوم ہوگا۔

یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے: خواہ اچھی صحبت ہو یا بری، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ وَ جَلِيسِ الشُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِعِ الْكَبِيرِ فَحَامِلُ الْمِسْكِ، إِمَّا أَنْ يُحْذِيكَ وَإِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحًا طَيِّبَةً وَ نَافِعِ الْكَبِيرِ إِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ رِيحًا مُنْتَنَةً. »

(نیک اور بُرے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے عطر والا اور لو بار، عطر والا یا تو تجھ کو عطر دے گا یا تو خود اس سے خرید لے گا۔ یا (کم از کم) اس کی خوشبو پائے گا۔ اور رہا لو ہار تو وہ یا تو تیرے کپڑے جلادے

گا، یا (کم از کم) اس (کی بھٹی) کی بدبو تو محسوس کرے گا۔ (۱)

اس حدیث سے صالح و نیک آدمیوں کی صحبت و معیت کا فائدہ و فضیلت اور بڑی اور گندی صحبتوں کی بُرائی و نقصان بیان کیا گیا ہے۔

لہذا اچھی و نیک صحبت اور اولیائے اللہ و مقربانِ خداوندی کی معیت اختیار کرنا چاہئے اور شریعت کے خلاف اور سنت کے خلاف چلنے والوں کی صحبت سے دور رہنا چاہیے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب برتاپ گڈھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شعر میں فرمایا کہ
تنہا نہ چل سکیں گے محبت کی راہ میں
میں چل رہا ہوں، آپ میرے ساتھ آئیے
ایک اور بزرگ فرماتے ہیں

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

یعنی اللہ سے قرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے کہ اللہ سے قرب و تعلق رکھنے والوں سے تعلق و ربط پیدا کیا جائے۔ اس شعر میں ملنے سے مراد قرب و تعلق ہے نہ کہ ظاہری طور پر ملنا۔

بہ ہر حال یہ معلوم ہوا کہ راہ سلوک کے طے کرنے کے لیے، کسی کامل شیخ کی رہبری حاصل کرنا چاہیے۔

شیخ کامل کی پہچان

جب شیخ کامل کی تلاش کرو تو یہ نہ دیکھو کہ وہ صاحبِ کرامت و صاحبِ کشف

(۱) بخاری: ۲۱۰۱، مسلم: ۴۷۶۲، احمد: ۱۸۷۹۸، واللفظ لمسلم

ہے یا نہیں؛ بل کہ یہ دیکھو کہ وہ منبع سنت و شریعت ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس نکتہ کو نہ جاننے کی وجہ سے بہت دھوکہ کھاتے اور آخر الامر محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے یہاں شیخ کامل کی پہچان کے لیے چند علامات لکھی جاتی ہیں، جو بزرگوں نے بیان فرمائی ہیں؛ ان کے مطابق کوئی مل جائے تو اس کو رہبر بنانا چاہئے۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ ”قصد السبیل“ میں فرمایا کہ:

پیر کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں۔

(۱) ضرورت کے موافق دین کا علم ہو۔

(۲) عقیدے، عمل اور عادتیں اسکی شرع کے موافق ہوں۔

(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔

(۴) کسی پیر کامل کے پاس کچھ دنوں تک رہا ہو۔

(۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش (اللہ والے) منصف مزاج

ہوں، وہ اس کو اچھا جانتے ہوں۔

(۶) عام لوگوں کی نسبت خاص لوگ یعنی جو سمجھدار اور دیندار ہیں۔ وہ اس کے

زیادہ معتقد ہوں۔

(۷) اس کے مریدوں میں اکثر مرید شرع کے پابند ہوں اور ان کو دنیا کی طمع نہ ہو۔

(۸) وہ پیر اپنے مریدوں کی تعلیم دل سے کرتا ہو۔ اور چاہتا ہو کہ یہ درست

ہو جائیں اور اگر مریدوں کی کوئی بری بات دیکھتا یا سنتا ہو تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو،

یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں

زیادتی معلوم ہوتی ہو۔

(۱۰) وہ خود بھی ذکر و شغل کرتا ہو۔ (۱)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان علامات کے بعد ایک اہم ضروری بات پر متنبہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”جس شخص میں یہ نشانیاں موجود ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں، یا پوشیدہ یا آئندہ ہونے والی باتیں اس کو معلوم ہوتی ہیں یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے، وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ اپنی باطنی قوت سے کچھ کام کر دیتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ یہ باتیں پیروولی کے لیے ہونا ضروری نہیں۔“ (۲)

غرض یہ کہ پیروشیخ میں جو اصل چیز دیکھنا ہے، وہ دین و شریعت کی پابندی و اتباع ہے، ہاں اللہ والوں سے کرامت کا ہونا یا کبھی اللہ کی طرف سے کسی واقعہ کا کشف ہونا یا کسی بات کا الہام ہونا، حق ہے۔ مگر ولایت کے لیے لازم نہیں ہے۔ پھر بزرگوں نے کرامت وغیرہ کو ایسی اہمیت نہیں دی کہ اس پر ولایت کا مدار رکھا جائے۔

حضرت ابو محمد الرقش رحمہ اللہ کے سامنے ذکر ہوا کہ فلاں صاحب پانی پر چلتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس و خواہش کے خلاف چلنے پر قدرت دے دیں، وہ ہوا میں چلنے والے سے زیادہ عظیم ہے۔ (۳)

حضرت ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”اگر تم کسی کو دیکھو کہ وہ کرامات دیا گیا ہے، حتیٰ کہ وہ ہوا میں اڑتا

(۱) از تسہیل قصد السبیل: ۱۶

(۲) تسہیل قصد السبیل: ۱۶

(۳) رسالہ قشیریہ: ۷۲

ہے تب بھی اس سے دھوکا نہ کھانا۔ جب تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ تم اس کو اللہ کے حکم اور نہی اور حدودِ شرعیہ کی حفاظت اور شریعت کے سامنے جھک جانے کے سلسلہ میں کیسا پاتے ہو؟ (۱)

لہذا جو اصل چیز ہے، اس کو دیکھنا چاہیے اور شیخ کامل کی تلاش کے لیے اس کو معیار بنانا چاہیے۔

شیخ کے حقوق و آداب

سلوک کے اہم مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ متبع سنت شیخ کا انتخاب کرنے کے بعد شیخ کے حقوق و آداب بھی پورے طور پر بجالائے؛ کیوں کہ شیخ جو کہ اللہ کا راستہ بتانے والا ہے، اس کی حیثیت باپ کے جیسی ہے، جس طرح علم ظاہر کی تعلیم دینے والے استاذ کی حیثیت ہوتی ہے، باپ اگر جسمانی تربیت و اصلاح و ترقی کا واسطہ و ذریعہ ہے تو شیخ روحانی و باطنی تربیت و اصلاح و ترقی کا ذریعہ و وسیلہ ہے؛ لہذا جس طرح باپ کے پھر استاذ کے حقوق و آداب ہیں اسی طرح شیخ کے بھی حقوق و آداب ہیں، جن کی رعایت و حفاظت ضروری ہے، بغیر رعایت ادب کے آدمی محروم رہ جاتا ہے۔

بے ادب محروم گشت از فضل رب

اس لیے شیخ کے چند اہم حقوق و آداب نقل کئے جاتے ہیں۔

مرشدی حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ نے ”شریعت و تصوف“ میں تفصیل سے ان حقوق و آداب کو بیان فرمایا ہے، یہاں چند کا خلاصہ پیش ہے۔

(۱) اپنے شیخ سے عقیدت ہونا چاہئے؛ بغیر عقیدت و محبت۔ ظاہر ہے کہ۔ کوئی خاص فائدہ و فیض حاصل نہیں ہو سکتا؛ اس عقیدت کا لازمہ یہ ہے کہ کسی اور طرف توجہ نہ کرے کہ فلاں اور فلاں کے پاس بھی چکر کاٹتا پھرے، صوفیا اس کو وحدتِ مطلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) مرشد و مصلح کی پوری طرح اطاعت کرے اور دین و شریعت پر چلانے کے لیے وہ جن باتوں اور تدبیروں کی ہدایت کرے، اس کو پورے وثوق سے عمل میں لائے۔

(۳) شیخ سے بدگمانی نہ کرے، ویسے بدگمانی تو کسی سے بھی جائز نہیں۔ لیکن شیخ سے بدگمانی کی وجہ سے آدمی اس کے فیوض و برکات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۴) شیخ کی عظمت و ادب بہت کرے، اس کے سامنے، زور سے نہ بولے، نہ اس پر اعتراض کرے، اس کی طرف پیر نہ کرے، اس کی جگہ پر نہ بیٹھے۔ اس سے اونچی جگہ پر نہ بیٹھے مجلس میں اس کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے؛ ادھر ادھر مشغول نہ ہو، اس کہ مجلس میں کسی سے بات چیت نہ کرے۔

(۵) جس قدر ہو سکے، شیخ کی خدمت میں رہنے کی کوشش کرے، بلا ضرورت اس سے الگ نہ ہو۔

(۶) اس کی ناراضی و خفگی سے کے اسباب سے بچنا چاہیے۔
بہر حال اس نازک و اہم رشتہ کو اس کی نزاکتوں کے ساتھ نباہنا چاہئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شیخ سے استفادہ کا طریقہ

شیخ سے استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حالات (اچھے یا بُرے) سب کے سب پوری امانت و دیانت کے ساتھ شیخ کے سامنے رکھ دے اور اس امید پر نہ رہے کہ شیخ کو کشف ہو جائے گا، یا الہام سے پتہ چل جائے گا، کیوں کہ اولاً تو شیخ کو کشف و الہام ہونا ضروری نہیں (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے) اور اگر ہو بھی تو ضروری نہیں کہ شیخ اس کے بھروسہ کسی کا علاج کرے؛ لہذا سالک کو چاہیے کہ پوری امانت داری سے اپنے حالات شیخ کے سامنے رکھ دے اور اس میں کوتاہی نہ کرے۔

بعض لوگ بیعت تو ہو جاتے ہیں؛ مگر کوئی اصلاحی تعلق اپنے شیخ سے نہیں رکھتے ایسی بیعت نام کی بیعت ہے؛ اصل بیعت یہی ہے کہ شیخ سے اصلاحی تعلق رکھے اور اپنے احوال پیش کر کے، اصلاح کا طالب ہو اور شیخ کی باتوں پر عمل کرے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے ایک مرید نے جب کچھ دنوں اپنے حال احوال سے مطلع نہیں کیا، تو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس کو یہ خط لکھا:

”برادرم خواجہ جمال الدین حسین رحمہ اللہ نے مدت سے اپنے احوال کی کیفیت سے اطلاع نہیں دی، آپ نے سنا نہیں کہ مشائخ اس مرید کو جو تین دن تک اپنے احوال و واقعات کو اپنے شیخ کی خدمت میں

عرض نہ کرے۔ کفِ پا“ فرماتے ہیں۔ خیر جو کچھ ہوا، پھر ایسا نہ کریں اور جو کچھ ظاہر ہوتا رہے لکھتے رہا کریں۔“ (۱)

معلوم ہوا کہ شیخ کو اپنے احوال کی اطلاع اور پھر اس کی اتباع، مرید کے لیے ضروری ہے تا کہ وہ روز بروز روحانی ترقی کرتا رہے۔

اس کو یوں سمجھا جائے جیسے مریض، اپنے احوال و بیماری کے حالات ڈاکٹر و طبیب کو بتاتا ہے اور اس میں کوئی عار و شرم محسوس نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی شرم کر کے، ڈاکٹر کو اپنی بیماری نہ بتائے، تو کبھی اس کا علاج نہیں ہو سکتا: مثلاً ایک آدمی بیمار ہو اور وہ ڈاکٹر کے پاس جائے؛ مگر ڈاکٹر کو اپنی بیماری نہ بتائے؛ بل کہ اس کے برخلاف، یہ بتائے کہ میں بڑا تندرست ہوں، مجھے کوئی بیماری نہیں ہے تو کیا ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا؟ ہرگز نہیں، اسی طرح اگر کوئی مرید اپنے روحانی امراض و احوال نہ بتائے تو شیخ اس کا کیا علاج کرے گا؟ اور اگر مرید خدا نخواستہ بیماری کو چھپا کر، اپنا صحت مند و تندرست ہونا، ظاہر کرے تو یہ اور خطرناک ہے۔ غرض یہ کہ یہ سلوک کا راستہ دراصل ایک طبِ روحانی ہے اور شیخ معالج و ڈاکٹر ہے اور مرید مریض ہے؛ لہذا مریض کو چاہیے کہ اپنے احوال و امراض کی شیخ کو اطلاع کر کے اس سے علاج معلوم کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

حضرات صحابہ کرام، رسول ﷺ سے اسی طرح اپنے احوال پیش کر کے اصلاح چاہتے تھے۔

مثلاً حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز و قرأت کے

درمیان حائل ہو جاتا ہے اور نماز کو خلط ملط کر دیتا ہے۔ (یعنی وسوسہ ڈال کر خشوع و خضوع میں اور وظائف نماز میں گڑبڑ کر دیتا ہے)۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک شیطان ہے جس کو خنزیر کہا جاتا ہے۔ پس جب اس کو محسوس کرو تو اللہ کی پناہ چاہو، اور اپنے بائیں طرف تین بار تھٹکا دو، حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو وہ شیطان مجھ سے دور ہو گیا۔ (۱)

ایک دفعہ چند اصحاب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے دل میں ایسے ایسے وسوسے اور خیالات پاتے ہیں کہ ان کو زبان پر لانا بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو صریح ایمان کی علامت ہے۔ (پریشان نہ ہونا چاہئے)۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک آدمی چھپ کر عمل کرتا ہے اور جب لوگ اس پر مطلع ہو جاتے ہیں تو اس پر اس کو خوشی ہوتی ہے۔ (کہیں یہ اخلاص کے خلاف تو نہیں؟) آپ نے فرمایا کہ اس کو دوا جریلیں گے ایک چھپا کر عبادت کرنے کا، دوسرا اس کے ظاہر ہو جانے کا۔ (۳) علماء نے لکھا ہے کہ دوا جریلیں اس لیے کہ ایک تو وہ عبادت کو اخلاص کی وجہ سے چھپاتا رہا، دوسرے اس لیے کہ وہ ظاہر ہو گئی تو اس سے دوسروں کو ترغیب کا فائدہ ہوا، غرض یہ کہ صحابہ کرام اپنے احوال پیش کر کے اس کا حل چاہتے؛ ایسے متعدد واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔

(۱) مسلم: ۴۰۸۳، احمد: ۱۷۲۲۴

(۲) مسلم: ۱۰/۸۸، ابو داؤد: ۴۴۲۷، احمد: ۹۳۱۷

(۳) ترمذی: ۲۳۰۶، ابن ماجہ: ۴۲۱۶

احقر نے اس پر ایک مضمون ”اصلاح باطن احادیث کی روشنی میں“ کے عنوان سے مرتب کیا ہے جو آئینہ مظاہر علوم سہارنپور میں قسطوار شائع ہو رہا ہے۔
 بہ ہر حال سالک کو اس میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے، حضرت عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ نے اپنے اشعار میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کا قول پیش کیا ہے: جس کو یاد رکھنا چاہئے۔

چار شرطیں لازمی ہیں استغاضہ کے لیے
 اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد
 یہ مقفی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی
 حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد
 اس کی شرح بندہ نے ”شفاء القلوب“ میں لکھ دی ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

راہ سلوک سے مقصود، رضاء الہی ہے

سالک کو اس راہ پر چلنے سے مقصود، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء ہونا چاہئے، کوئی اور چیز مقصود نہ ہونا چاہئے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَى،
 فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ
 وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِمْرَأَةٍ
 يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. » (۱)

(۱) بخاری: ۱، مسلم: ۳۵۳۰، ترمذی: ۵۷۱، نسائی: ۷۴، ابو داؤد: ۸۸۲، ابن ماجہ: ۴۲۱۷، احمد: ۱۶۳

(اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے: اور ہر آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے۔ اور جو دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔)

لہذا راہِ سلوک پر چلنے سے مقصود صرف اللہ کی خوشنودی و رضا ہونا چاہئے نہ کہ کچھ اور، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ۔

تجھ سے کوئی کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سلوک کو طے کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے سارے دنیوی کام بن جائیں گے؛ کرامت ظاہر ہونے لگے گی، بیٹھے بیٹھے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ وغیرہ؛ مگر یہ بات دل سے نکال کر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کام کرنا چاہئے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کرامت بھی دے دیں اور سارے مسئلے حل کر دیں تو یہ ان کا انعام ہے۔ مگر سالک کو اس نیت و مقصد سے سلوک میں لگنا نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان باتوں کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

مرشدی حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ”شریعت و تصوف“ میں فرمایا:

”جب حقیقت سلوک معلوم ہوگئی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ

اس میں نہ کشف و کرامات ضروری ہیں، نہ قیامت میں بخشوانے کی

ذمہ داری ہے، نہ دنیا میں کار بر آری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گندوں سے

کام بن جایا کریں، یا مقدمات، دعا سے فتح ہو جائیں، یا روزگار میں

ترقی ہو، یا جھاڑ پھونک تعویذات سے بیماری جاتی رہے یا ہونیوالی بات بتلا دی جایا کرے۔ نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے؛ اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے، خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں، مرید کو ارادہ نہ کرنا پڑے، یا ذہن و حافظہ بڑھ جائے، نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کی میعاد کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے؛ عبادت میں کوئی خطرہ ہی نہ آوے، یا یہ کہ خوب رونا آوے، ایسی محویت ہو جائے کہ اپنی پرانی خبر نہ رہے اور نہ ذکر و شغل میں انوار وغیرہ کا نظر آنا، نہ کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے، نہ اچھے خوابوں کا نظر آنا، یا الہامات کا ہونا ضروری ہے۔ بس اصل مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہے اسی کو پیش نظر رکھے۔“ (۱)

غرض یہ کہ اس راہ میں سوائے رضا الہی کہ کوئی چیز مقصود نہیں، بعض سہولتیں کیفیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، کہ ہم کو رونا آئے عبادت میں لذت و مزہ آئے وغیرہ یہ بھی مقصود نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ دے دیں تو شکر کرنا چاہئے، ورنہ ان چیزوں کو مقصود سمجھ کر ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کیوں کہ یہ اخلاص کے منافی و خلاف ہے؛ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

احوال و کیفیات مقصود نہیں

اس راہ میں چلنے والے کو بعض اوقات اور خاص طور پر ابتداء میں کچھ کیفیات پیش آتی ہیں، مثلاً نماز و ذکر و تلاوت میں خوب جی لگنا اور مزہ و لذت آنا، اپنی پچھلی حالت پر اور اپنے گناہوں پر رونا آنا وغیرہ، سالک کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ساری کیفیات محمود تو ہیں؛ مگر اس راہ کا مقصود نہیں ہیں، مقصود تو رضاء الہی ہے اور اس کا راستہ ایمان و اعمال ہیں، اگر ایک بندہ ہر حال و صورت میں اللہ کے لیے شرعی اعمال بجالاتا رہے، تو اس کو ضرور وہ مقصود اعظم یعنی رضاء الہی حاصل ہوگی، خواہ یہ کیفیات حاصل ہو یا نہ ہوں؛ اگر سالک ان کیفیات کو مقصود سمجھ کر، ان کے پیچھے پڑ گیا، تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کیفیات کے حاصل نہ ہونے پر مایوس ہو کر اصل کام ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس لیے کیفیات کے بجائے اعمال پر نگاہ رکھنا چاہئے، ہاں اگر کیفیات بھی اعمال کے ساتھ حاصل ہو جائیں تو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش نظر رکھنا چاہئے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ حنظلہ رضی اللہ عنہ منافق ہو گیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا سبحان اللہ! تم کیا کہتے ہو؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ گویا ہم ان چیزوں کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؛ مگر جب بیوی

بچوں اور کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ حالت نہیں رہتی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بخدا میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں، پھر دونوں حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور یہ بات جو دل کو کھٹک رہی تھی، بیان کی، تو آپ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوُتِدُ وَمُؤْنٌ عَلَى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحْتُكُمْ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ! سَاعَةً وَسَاعَةً (ثَلَاثَ مَرَّاتٍ).»

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تم اس کیفیت پر ہمیشہ رہو، جو میرے پاس ہوتی ہے اور ذکر کے وقت ہوتی ہے، تو تم سے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں، فرشتے مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ رضی اللہ عنہ! یہ (کیفیت) کبھی کبھی ہوتی ہے (یا کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی) تین بار فرمایا۔^(۱))

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو ہمارے دل نرم ہو جاتے ہیں اور ہم دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اہل آخرت میں سے ہو جاتے ہیں؛ مگر جب آپ کے پاس سے چلے جاتے اور اپنے اہل و عیال میں مشغول ہو جاتے ہیں تو پھر ہم اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس تم جس حالت میں ہوتے ہو، یہاں سے جانے کے بعد بھی اسی حالت پر باقی

(۱) مسلم: ۴۹۳۷، مشکوٰۃ: ۱۹۷، ترمذی: ۲۴۳۸، ابن ماجہ مختصر: ۴۲۲۹

احمد: ۱۶۹۴۹، واللفظ لمسلم

رہو تو فرشتے تمہارے گھروں میں آ کر تمہاری زیارت کریں، (ایک روایت میں مصافحہ کا ذکر ہے)۔ (۱)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے فائدہ لکھا ہے:

”سالکین اس سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ ہماری فلاں حالت ضعیف ہوگئی، یا فلاں کیفیت زائل ہوگئی، شاید ہم کو تنزل ہو گیا ہو اور اس سے مایوس ہو کر شکستہ دل ہو جاتے ہیں، شیوخ کالمین نے ان کی غلطی رفع کرنے کے لیے تحقیق فرمادیا ہے کہ حالات کا غلبہ دائم نہیں ہوتا بالخصوص مبتدی کہ اس کو بہت تغیر و تبدل پیش آتا ہے جس کو تلوین کہتے ہیں اور اہل تمکین کی بھی حالت میں ان کے مرتبہ کے موافق تفاوت ہوتا ہے، اس حدیث سے اس کا بھی اثبات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کیسی، ایک ساعت کیسی غرض یہ لوازم سلوک سے ہے، ضرر نہیں اس سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔“ (۲)

غرض یہ کہ سالک کو اعمال پر نظر رکھنا چاہئے، احوال کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے کیوں کہ احوال و کیفیات غیر اختیاری چیزیں ہیں اور اعمال اختیاری ہیں اور پوری شریعت کا مدار افعال و اعمال اختیار پر ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ نے ایک صاحب کے خط کے جواب میں اس راہ سلوک کا خلاصہ نہایت جامع الفاظ میں لکھا اور اس تحریر کا نام ”الطَّم فی السَّم“ رکھا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

(۱) ترمذی: ۲۲۲۹، احمد: ۷۷۰۰، مسند دی حمیدی: ۱۱۵۰

(۲) التکشف: ۲۶۵

”تمام اصلاح کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کاموں کے پیچھے نہ پڑے جو اس کے اختیار اور قبضہ میں نہ ہوں اور ایسے کاموں میں سستی نہ کرے جو اس کے اختیار اور قبضہ میں ہوں۔ بل کہ اپنی ہمت سے کام لے اور اگر ہمت کے باوجود پھر بھی کچھ کوتاہی ہو جائے تو حق تعالیٰ سے معافی چاہے اور آئندہ کے لیے توبہ کرے۔ اور یہ دعا کرے:

اے اللہ! مجھے اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق دے اسی کا نام اصلاح ہے۔^(۱)
اس سلسلے میں حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ کے یہ اشعار بھی یاد رکھنا چاہئے۔ فرماتے ہیں۔

لگا رہ اسی میں جو ہے اختیاری
نہ پڑ امر غیر اختیاری کے پیچھے
عبادت کئے جا مزہ گو نہ آئے
نہ آدھی کو چھوڑ بھی ساری کے پیچھے

نیز فرمایا۔

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر تیرا فرض تو ہے دل لگانا
اس فصل کے آخر میں یہ بات عرض کردوں کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، جب وہ چاہتے ہیں تو کیف و حال کے ذریعہ ترقی دیتے ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں، بلا کیف و حال کے ترقی دیتے ہیں اس لیے ہر حال میں ترقی کی فکر کرے اور عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی رحمۃ اللہ کے یہ اشعار پڑھ لیا کرے۔

(۱) ماخوذ از تسہیل قصد السبیل: ۵۶

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیف مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اُتقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے جاتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

اللہ و رسول کی محبت اس راہ کی کنجی ہے

سالک کی ترقی کا ایک بڑا زینہ اور اہم ذریعہ و وسیلہ اللہ تعالیٰ اور رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت شدیدہ ہے، اسی لیے اس کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے
فضائل بیان کئے گئے ہیں اور تمام چیزوں کی محبت پر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کی محبت کو غالب رکھنے حکم ہے۔

ایک جگہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ نَّ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ (التَّوْبَةُ: ۲۴)

(آپ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ
اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ
و خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے گھائے
کا تم کو خطرہ ہے اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (یہ ساری چیزیں) تم کو

اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری و محبوب ہوں، تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں؛ (یعنی تم پر عذاب آجائے) اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”الفاظ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اس پر غالب نہ آئے اور جس نے اس درجے کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحق عذاب ہو گیا، اس کو عذاب الہی کا منتظر رہنا چاہئے۔ (۱)

اس سلسلے کی بعض حدیثیں شروع رسالہ میں پیش کی جا چکی ہیں، جن میں اللہ کے رسول سے محبت کو کمال ایمان کا لازمہ قرار دیا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ہے جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے محبت غالبہ و شدیدہ کا سوال کیا ہے؛ محبت کے پیدا ہونے میں اس دعا کو عجیب تاثیر حاصل ہے؛ وہ یہ ہے:

”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اَلْاَشْيَاءِ اِلَيَّ وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ اَخَوْفَ اَلْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَاقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشُّوْقِ اِلَى لِقَائِكَ وَاِذَا اَقْرَرْتُ اَعْيُنَ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاقْرِرْ عَيْنِيْ مِنْ عِبَادَتِكَ.“ (۲)

(اے اللہ تیری محبت، میرے نزدیک تمام چیزوں کی محبت

(۱) معارف القرآن: ۱۱۰/۴

(۲) کنز العمال: ۹۰/۴ حدیث: ۳۶۴۵

سے زیادہ محبوب بنادے اور تیرا خوف میرے نزدیک تمام چیزوں کے خوف سے زیادہ کر دے اور تیری ملاقات کا شوق دے کر دنیا کی حاجات کو مجھ سے منقطع کر دے اور جب تو دنیا والوں کی آنکھوں کو دنیا دے کر ٹھنڈا کرتا ہے تو میری آنکھوں کو تیری عبادت سے ٹھنڈک عطا فرما۔)

جب بندہ کو اللہ و رسول کی شدید محبت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کو ایمانی حلاوت و مٹھاس مل جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

”تین چیزیں جس میں پائی جائیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت پائے گا؛ ایک یہ کہ اس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام اور چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں: دوسرے یہ کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہو: تیسرے یہ کہ کفر کی طرف واپس جانا اس کو ایسا برا اور مکروہ معلوم ہو جیسے کہ اس کو آگ میں ڈالا جانا مکروہ معلوم ہوتا ہے۔“

یہ ایمانی حلاوت جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر عطا ہوتی ہے: وہ کیا چیز ہے؟ علمائے اس کی تفسیر میں تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

(۱) استلذاذ الطاعات.

(۲) تحمل المشاق فی الدین.

(۳) ایثار الدین علی أعراض الدنیا. (۱)

اس کی شرح یہ ہے کہ حلاوتِ ایمان تین چیزوں کا نام ہے! ایک یہ کہ طاعتوں اور عبادتوں میں لذت و مزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ نماز میں، تلاوت میں، ذکر میں اور

(۱) فتح الباری: ۶۱/۱، فیض القدیر: ۳/مرقات

دیگر طاعتوں میں عجیب لذت و مٹھاس معلوم ہوتی ہے؛ کسی نے اسی کو کہا ہے۔

اللہ اللہ چہ شیریں است نام
شیر و شکر شود جانم تمام

دوسری چیز یہ کہ دین کے سلسلے میں مشقتوں کو برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اور گناہوں سے بچنے میں جو کلفت اور لوگوں کو معلوم ہوتی ہے وہ کلفت یہ بڑی آسانی سے برداشت کر لیتا ہے بلکہ اس کو اس میں مزہ آتا ہے۔

اور وہ بزبان حال یوں کہتا ہے۔

قیود شرع پہ واللہ سو آزادیاں قربان
کہاں یہ حظ نفسانی کہاں وہ لطف روحانی

اور تیسری چیز یہ کہ دین کو دنیا کے مال و متاع اور چیزوں پر وہ ترجیح دیتا ہے اس کی نظر میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ لاکھوں روپیوں اور اسباب عیش و سامان فخر کو دین کی خاطر لات مار دیتا ہے؛ اس لیے کہ اس کو اللہ و رسول کی محبت حاصل ہے اس محبت میں وہ ہر چیز کو قربان کر سکتا ہے۔

غرض یہ کہ سالک کے لیے قریب ترین راستہ محبت الہی و محبت نبوی کا راستہ ہے، مگر اس سے مراد محض دعویٰ و نعرہ نہیں ہے بل کہ سچی محبت ہے اور سچی محبت کی کچھ علامات ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی اور اتباع کی جائے۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ:

تَعْصِي الْإِلَهِ وَ أَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ ☆ وَ هَذَا لَعُمْرِي فِي الْقِيَاسِ بَدِيعُ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَا طَعْتَهُ ☆ فَإِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعُ

(ترجمہ: یعنی تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ قسم ہے کہ عجیب بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محبت اپنے محبوب کا تابع دار ہوتا ہے۔) لہذا محض دعویٰ محبت نہیں، بلکہ سچی و پکی محبت کے ساتھ اللہ و رسول کے احکام پر چلنا اور ان کی نافرمانی سے بچنا چاہئے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ اللہ و رسول ﷺ کا ذکر کیا جائے، مشہور ہے:

”مَنْ أَحَبَّ شَيْئًا أَكْثَرَ ذِكْرُهُ“

(جو کسی سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔)

لہذا اللہ کا ذکر چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کرتے رہنا چاہئے، اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کو بھی ہر موقع پر یاد کر کے آپ کے افعال و اعمال بلکہ احوال میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی تعظیم کی جائے، اور دین کی تعظیم کی جائے۔

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ والوں اور رسول اللہ ﷺ کے خاندان والوں سے بھی محبت رکھی جائے اور اللہ و رسول سے دشمنی کرنے والوں سے بغض و نفرت رکھی جائے: اور ان سے تعلق نہ رکھا جائے۔

یہ سب علامات قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ہم نے اختصار کے پیش نظر اجمالاً ان کا ذکر کیا ہے۔

بہ ہر حال جب ایسی سچی محبت ہوگی تو ان شاء اللہ سالک ترقی کرے گا اور اس کی برکت سے جلد ہی منزل پر پہنچ جائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرب فرائض و قرب نوافل

سالکین کا اس راہ سے مقصود چوں کہ قرب حق ہوتا ہے، لہذا ان کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب فرائض و واجبات کی ادائیگی و بجا آوری پر موقوف ہے۔ اس قرب کو قرب فرائض کہتے ہیں، پھر مزید قرب نوافل کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو قرب نوافل کہتے ہیں؛ سالک کو دونوں قسم کے قرب کی جستجو کرنا چاہیے۔ حدیث پاک میں ان دونوں قسم کے قرب کا ذکر آیا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أَحْبَبْتُهُ فَاكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لِأَعْطِيَنَّهُ وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِذَّنَّهُ. الخ.» (۱)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھتا ہے، میں اس کو جنگ کا اعلان دیتا ہوں۔ اور میرا بندہ میری طرف کسی بھی ایسی چیز سے

(۱) بخاری الرقاق: ۶۵۰۲، ابن حبان: ۳۳۷، بیہقی: ۱۵۶/۲، الزہد الکبیر: ۲۶۹/۲

تقرب حاصل نہیں کرتا جو مجھے ان چیزوں سے زیادہ پسند ہو جو میں نے اس پر فرض کی ہیں اور بندہ میری طرف نوافل کے ذریعہ برابر تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں ضرور بالضرور اس کو عطا کرتا ہوں اور جب وہ مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔)

اس میں قرب فرائض و قرب نوافل دونوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ قرب فرائض کا مدار فرائض کی پابندی پر ہے؛ فرائض سے کیا مراد ہے؟ ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو ضروری قرار دی گئی ہے، خواہ وہ اوامر کا اقتضال ہو یا زواجر یعنی ناجائز کاموں سے پرہیز ہو۔^(۱)

مطلب یہ ہوا کہ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان کو انجام دینا اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنا، فرض و ضروری ہے، جب بندہ اوامر کی پابندی اور ناجائز کاموں سے پرہیز کرے گا تو قرب فرائض میسر آئے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر صرف نیک کام عبادات وغیرہ تو کرتا ہو؛ مگر حرام کاموں سے پرہیز نہ کرتا ہو تو اس کو قرب حاصل نہیں ہو سکتا یہ تو قرب فرائض ہے۔

اور قرب نوافل، نوافل و مستحبات و سنتوں کی پابندی سے حاصل ہوگا؛ اور نوافل

میں خواہ نفل نماز ہو یا ذکر و اذکار، تلاوت، ہو یا کسی پر احسان ہو یا حسن اخلاق کی باتیں ہوں، وغیرہ سب نوافل میں داخل ہیں؛ جب بندہ ان امور کی پابندی کرتا ہے تو اس کو مزید قرب عطا کیا جاتا ہے جس کو قرب نوافل کہتے ہیں۔
اور اس تقرب پر بندہ کو اللہ کی محبت عطا ہوتی ہے؛ جس کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں۔

(۱) ایک یہ فرمایا کہ ”میں اس کے کان‘ آنکھ اور ہاتھ پیر بن جاتا ہوں“ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس میں علماء نے تفصیلی کلام کیا ہے؛ راجح قول پر اس کی تفسیر یہ ہے کہ جب بندہ برابر نوافل کی پابندی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بندہ کی گناہوں سے حفاظت کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پیر اور آنکھ و کان سے صرف وہ افعال و اعمال صادر ہوتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں، اور اللہ کی ناراضی کے اعمال و افعال سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ لہذا وہ کان سے صرف وہ بات سنے گا۔ جو اللہ کو پسند ہے اور آنکھ سے وہی دیکھے گا جو اللہ کو منظور ہے اور ہاتھ سے وہی چیز پکڑے گا جو اللہ چاہتا ہے اور پیر سے اسی طرف چلے گا جہاں اللہ کی رضا ہے۔ (۱)
غرض یہ کہ اس قرب کے نتیجہ میں، وہ اللہ کی مرضی و خوشنودی ہی کو مقصود زندگی بنائے گا اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کو اللہ کی مرضیات ہی کے لیے استعمال کرے گا، اور نا مرضیات اور گناہوں سے بچائے گا۔

ایک سوال کا جواب

ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس حدیث میں صرف چار

(۱) مرقات: ۵۵/۵، فتح الباری: ۳۴۴/۱۱، الاسماء والصفات للبيهقي: ۲۵۱/۲، جامع العلوم والحکم: ۳۶۶/۱

اعضاء (کان، آنکھ، ہاتھ و پیر) کا ذکر کیوں ہے، دیگر اعضاء کا ذکر کیوں نہیں؟ جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں دیگر اعضاء کا ذکر بھی آیا ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں زبان اور دل کا ذکر بھی ہے، اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما کی احادیث میں بھی ان کا ذکر ہے۔ (۱)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عموماً انسان کا کاروبار، انہی چار اعضاء سے ہوتا ہے۔ لہذا ان کی تخصیص کی گئی۔ (۲)

دوسری علامت یہ بتائی گئی کہ یہ محبوب بندہ، اللہ سے جو مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں، اس پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ بہت سے اللہ کے مقرب بندے دعا کرتے ہیں مگر جو مانگتے ہیں وہ ان کو نہیں ملتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قبولیت دعا کے مختلف انداز ہیں۔ کبھی تو بعینہ وہی مطلوبہ چیز عطا کر دی جاتی ہے اور کبھی اس کے بجائے اس سے بہتر کوئی چیز دیدی جاتی ہے اور کبھی اس دعا کی برکت سے کسی مصیبت سے بچا لیا جاتا ہے اور کبھی اس دعا کو آخرت کے لیے رکھ دیا جاتا ہے، ایک حدیث میں جو حضرت ابو سعید خدری و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے تو روایت کی ہے، قبولیت دعا کے تین طریقے مذکور ہیں؛ یا تو وہ چیز عطا کی جاتی ہے یا آخرت کے لیے اس دعا کو ذخیرہ بنا دیا جاتا ہے یا کسی برائی کو دفع کر دیا جاتا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں گناہ دور کرنے کا ذکر ہے۔ (۳)

تیسری بات یہ فرمائی کہ یہ بندہ اگر اللہ سے پناہ چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور

(۱) نوادر الاصول: ۲/۲۳۳، فتح الباری: ۱۱/۲۲۲

(۲) الاسماء والصفات: ۲/۳۵۱

(۳) احمد عن ابی سعید خدری: ۱۰۷۰۹، ترمذی عن ابی ہریرہ: ۳۵۳۱

پناہ عطا فرماتے ہیں، یعنی جن خوفناک چیزوں سے وہ پناہ چاہتا ہے چاہے وہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی اللہ تعالیٰ اس کو ان چیزوں سے پناہ عطا فرماتے ہیں۔

سالک نتائج کی فکر نہ کرے

سالک کے لیے ایک بہت ہی اہم و ضروری بات یہ ہے کہ وہ رضاعِ الہی کو اپنے اعمال و عبادات و مجاہدات کا ثمرہ سمجھ کر، مسلسل کام میں لگا رہے اور نتائج کی فکر و جستجو میں نہ پڑے، بہت سے سالکین اس فکر میں پڑ کر ہلاک ہو چکے ہیں؛ کیونکہ شیطان اس ذریعہ سے مایوسی پیدا کر کے کام سے معطل کر دیتا ہے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ کے یہ اشعار ہمیشہ پیش نظر ہونا چاہئے۔

ضر میں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در، اس پہ ہو کیوں تیری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

نیز فرمایا۔

سوچ ماضی کو نہ استقبال کو
ٹھیک رکھ تو بس اپنے حال کو
کیا ہوا کیا ہوگا اس غم میں نہ پڑ
تو عبث سر لے نہ اس جنجال کو

بندے کا کام لگا رہنا ہے، نتائج کا مرتب کرنا، اللہ کا کام ہے، اگر بندہ اپنا کام برابر کرتا رہے گا۔ تو کسی نہ کسی وقت ضرور، اللہ تعالیٰ کا در کھلے گا اور اس کو نواز دے گا،

مگر بندہ کو اس فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اس کو اپنا کام کرتے رہنا چاہئے، یہی دراصل حقیقی بندگی و غلامی ہے۔

راہِ سلوک کی رکاوٹیں

ایک اہم بات سالک کو سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ اس راہ میں بھی مختلف قسم کے چور اور ڈاکو ہیں جو سالک کا متاعِ ایمان و عمل چھین کر، اس کو ہلاک کر دیتے ہیں، ان سے سالک کو بہت چوکنار ہونا چاہیے اور یہ بہت سی چیزیں ہیں اور علمائے سلوک نے ان پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ”الفوائد“ میں اس پر عمدہ کلام کیا ہے، ہم اسی کو یہاں اپنے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

”علامہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ سیرالی اللہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو بڑے دھوکے اور راستہ کو قطع کرنے والی چیزیں پیش آتی ہیں، پہلے اس کو شہوتوں و لذتوں بڑے بڑے عہدوں، لباس و پوشاک سے دھوکہ لگتا ہے، اگر وہ ان چیزوں میں پھنس کر اسی پر رک گیا تو اس کا راستہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اگر ان چیزوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گیا اور اپنی خدا طلبی میں سچا رہا تو اب دوسری طرح کی آزمائش و ابتلاء پیش آتا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس کے پیچھے چلنے لگیں، ہاتھوں کو بوسہ دیا جانے لگے، کسی جگہ پہنچے تو لوگ اس کو اعزاز و اکرام سے جگہ دینے لگیں، دعا کے سلسلہ میں لوگ اس کی طرف اشارہ کرنے لگیں کہ یہ مستجاب الدعاء ہے اور اس کی برکت کی امید کی جانے لگے وغیرہ۔ سالک ان باتوں سے متاثر ہو کر،

انہی چیزوں کو منزل سمجھا اور اسی پر رک گیا تو اللہ کا راستہ منقطع ہو جائے گا اور اس کی ریاضت و عبادت کا یہی چند دنیوی و حقیر چیزیں نتیجہ بنیں گی اور اگر وہ یہاں نہیں ٹھہرا؛ بلکہ ان چیزوں کو لات مار کر آگے بڑھ گیا، تو پھر کشف و کرامات وغیرہ کے ذریعہ اس کی آزمائش ہوتی ہے، سالک اگر انہی چیزوں کو مقصد سمجھ کر رک گیا تو وہ اللہ سے کٹ جائے گا اور یہی کشف و کرامات اس کا حصہ و نصیبہ ہوں گے اور اگر وہ یہاں بھی نہ رکا اور آگے بڑھ گیا، تو پھر ایک اور طرح آزمائش ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کو خلوت و تنہائی سے انس، جمعیت قلب و یکسوئی خاطر کی لذت اور دنیا سے فراغت دے کر اس کی آزمائش کی جاتی ہے، اگر وہ انہی چیزوں کو منزل مقصود سمجھ کر، یہیں رک گیا تو اللہ تعالیٰ سے کٹ کر رہ جائے گا۔ اور اگر یہاں بھی نہ رکا اور اللہ کی رضا و مراد کی طرف نظر کرتے ہوئے چلتا رہا، تا کہ وہ اللہ کا غلام ہو جائے اور ہر جگہ اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات و پسندیدہ چیزوں پر قائم ہو جائے، خواہ وہ تعب و پریشانی میں ہو یا آرام و راحت میں، چاہے وہ نعمتوں و لذتوں میں ہو یا غم و الم میں، چاہے اس کو لوگوں میں مشہور کیا جائے یا لوگوں سے مستور رکھا جائے، وہ اپنے لیے کسی خاص حالت کو اختیار نہیں کرتا، سوائے اس حالت کے جو اس کا خدا اس کے لیے پسند کرے۔“ (۱)

اس تفصیل نے بتا دیا کہ اس راستہ میں راہ کو قطع کرنے والی اور آزمائش کرنے والی بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، مگر سالک کو چاہئے کہ وہ کسی طرف کو بھی نظر ڈالے

بغیر صرف اللہ کی طرف نظر کرتا ہوا چلتا رہے۔ اس کے سوا کسی بھی منزل کو منزل نہ سمجھے، مولانا روم نے فرمایا ۔

اے برادر بے نہایت در گہیست
آنچہ بروے میری بروے مایست

سالک کے لیے اہم کتابیں

سالک کو دینی و اصلاحی کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ مگر اس سلسلہ میں اپنے شیخ سے مشورہ کر لینا چاہئے تاکہ مفید کتابیں ہی نظر سے گذریں، آج کل بہت سے بد دین و ملحد اور جاہل لوگوں کی کتابیں بھی بازار میں چلتی ہیں۔ اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ ان کو پھیلایا جاتا ہے۔ لہذا مطالعہ کرنے میں احتیاط لازم ہے، سالک کے لیے ایک مختصر سی فہرست لکھی جاتی ہے، جو ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔

(۱) تفسیر معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ

(۲) معارف الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ

(۳) ترجمہ ریاض الصالحین علامہ نووی رحمۃ اللہ

(۴) بہشتی زیور (پانچ حصے)

(۵) مواعظ و ملفوظات (حضرت تھانوی رحمۃ اللہ)

(۶) مواعظ و ملفوظات (حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ)

(۷) مواعظ و ملفوظات (حضرت شاہ ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ)

(۸) معارف مثنوی (حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ)

(۹) قصص الاولیا (مترجم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ)

(۱۰) شریعت و تصوف (حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ)

نوٹ: تفسیر و حدیث بہتر ہے کہ کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور اگر کوئی عالم نہ مل سکیں تو روزانہ دو چار صفحے پڑھ لیں اور جو مقام سمجھ میں نہ آئے اس کو نشان لگا کر رکھ لیں، جب کوئی عالم ملیں تو ان سے پوچھ لیں۔

معمولاتِ سالک

سالک کی ترقی کا ایک اہم اور بڑا ذریعہ وزینہ، معمولات کی پابندی ہے۔ یہاں چند ابتدائی معمولات، ذکر کئے جاتے ہیں، اصل تو یہ ہے کہ طالب و سالک شیخ سے رجوع کر کے اپنے لیے معمولات مقرر کرے۔ اور حسب استعداد، و حسب ضرورت و مصلحت، شیخ اس کے لیے معمولات بتائے۔ اور کمی و بیشی کرتا رہے، یہاں چند عام معمولات ذکر کئے جاتے ہیں۔

نماز باجماعت کا اہتمام

پنج وقتہ نمازوں کی پابندی کرے۔ اور جماعت کا پورا اہتمام کرے اور نمازوں کو خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنے کا التزام کرے، لا پرواہی و بے خیالی کے ساتھ ادا نہ کرے۔ کہ یہ منافقین کا طریقہ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں منافقین کے بارے میں فرمایا کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی و لا پرواہی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ (مائدہ)

اور مومنوں کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾

(المؤمنون: ۱-۲)

(تحقیق کہ مومن لوگ کامیاب ہو گئے جو کہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔)

لہذا پوری اہمیت کے ساتھ، اور بشارت کے ساتھ نمازوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے۔

نماز تہجد کا اہتمام

تہجد کا بھی اہتمام کرے، تہجد اگرچہ نقلی نماز ہے۔ مگر ہر زمانہ کے اولیاء اللہ کا خاص معمول رہا ہے۔ اور یہ تمام نوافل میں سب سے اہم و افضل ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیام لیل (تہجد کی نماز) کو لازم پکڑ لو، کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہا ہے اور تمہارے لیے قرب خداوندی کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ اور برائیوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (۱)

لہذا اس کی پابندی کرنا چاہئے، اگرچہ دو رکعت ہی سہی، اور جتنا زیادہ ہو، اچھا ہے، تہجد کی زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت سنت سے ثابت ہیں۔

عجز و نیاز، گریہ و زاری

تہجد کے وقت یا جب بھی موقع ہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے رونا، گڑ گڑانا، عاجزی و انکساری کرنا، ایک بہترین عبادت ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ خاص بندوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقُنُتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ

بِالْأَسْحَارِ﴾ (الْعَمَلَانِ : ۱۷)

(جو صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، عبادت کرنے

والے، اللہ کے لیے خرچ کرنے والے اور صبح کے وقت استغفار کرنے والے ہیں۔)

اللہ تعالیٰ کا عاشق، صبح کے وقت اللہ کے سامنے گڑ گرائے، راتوں کو اٹھ کر روئے اور پلائے، یہ اللہ کو پسند ہے، وہ کیا اللہ کا عاشق، جو راتوں میں اس کو نہیں پکارتا اور اس کی یاد میں نہیں روتا۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

لَقَدْ هَتَفْتُ فِي جُنْحِ اللَّيْلِ حَمَامَةً
عَلَى فَنٍّ وَهْنًا وَإِنِّي نَائِمٌ
كَذَبْتُ وَرَبِّ الْبَيْتِ لَوْ كُنْتُ عَاشِقًا
لَمَّا سَبَقْتَنِي بِاَلْبُكَاءِ الْحَمَائِمِ
وَأَزْعُمُ أَنِّي هَائِمٌ ذُو صَبَابَةٍ
لِرَبِّي وَلَا أَبْكِي وَتَبْكِي الْبَهَائِمُ

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ کبوتری رات کے حصہ میں ڈالی پر بیٹھ کر روتی ہے۔ اور میں سوتا رہتا ہوں، کعبہ کے رب کی قسم میرا دعویٰ عشق جھوٹا ہے۔ اگر میں عاشق خدا ہوتا تو، رونے و گڑ گڑانے میں کبوتر مجھ پر سبقت نہ کرتے، میرا دعویٰ ہے کہ میں میرے رب کا عاشق ہوں۔ حالاں کہ روتا نہیں اور جانور اللہ کے عشق میں روتے ہیں۔

غرض یہ کہ سالک کو ایک معمول یہ بنانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے گڑ گرائے۔ رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنا لے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے ”کہ روؤ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بناؤ“ (۱)

نیز سالک کو اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھی رونا چاہئے، ایک حدیث میں آیا ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يُخْرِجُ

مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوعٌ وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ
ثُمَّ يُصِيبُ شَيْئًا مِنْ حُرٍّ وَجْهِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللَّهُ عَلَى
النَّارِ. «(۱)»

(نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو بندہ مومن کہ اس کی
آنکھوں سے اللہ کی ڈر کی وجہ سے آنسو جاری ہو گئے اگرچہ وہ مکھی کے
سر کے برابر ہی کیوں نہ ہوں اور وہ اس کے چہرہ پر لگ جائے تو اللہ اس
کو دوزخ پر حرام کر دے گا۔)

ذکر اللہ کی عادت

ذکر اللہ کا خوب اہتمام کرے کہ یہ مفتاح سلوک ہے اور قرآن و حدیث میں
ذکر اللہ کی اہمیت و فضیلت بڑے اہتمام سے بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے لیے
فضائل ذکر (مصنفہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی
رحمۃ اللہ) کا مطالعہ کیجئے۔

چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اور اپنے کام کاج کے ساتھ ذکر اللہ کی مشق کرنا چاہئے اور
حضرات صوفیائے کرام نے اس دوام ذکر کی مشق کے لیے بارہ تسبیح کا معمول تجویز کیا
ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ چار زانو با ادب، خشوع و خضوع کے ساتھ قبلہ رخ بیٹھے اور
اکیس مرتبہ استغفار پڑھے، پھر سات بار درود شریف پڑھے، پھر تین مرتبہ یہ دعا پڑھے۔

”اللَّهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي عَنْ غَيْرِكَ وَنَوِّرْ قَلْبِي بِنُورِ
مَعْرِفَتِكَ أَبَدًا يَا اللَّهُ يَا اللَّهُ يَا اللَّهُ.“

(اے اللہ میرے دل کو غیر اللہ سے پاک کر دے اور میرے

دل کو تیری معرفت کے نور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منور و معمور
کر دے۔)

اس کے بعد خوب دھیان کے ساتھ دو سو مرتبہ ”لا الہ الا اللہ“ کا ذکر اس طرح
کرے کہ سر کو سینہ کے بائیں جانب دل کے برابر لا کر ”لا الہ“ کہتے ہوئے سر کو
بائیں جانب کندھے کی طرف کر کے ذرا سا جھٹکا دے اور یہ تصور کرے کہ غیر اللہ کی
محبت دل سے نکال کر پھینک رہا ہوں، پھر ”الا اللہ“ کہتے ہوئے دل پر ہلکی سی ضرب
لگائے اور یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آ رہی ہے، ذکر کے درمیان پانچ
دس مرتبہ پر ”محمد رسول اللہ“ بھی ملا لے، یہ دو تسبیح (دو سو مرتبہ) ہوں۔
پھر چار تسبیح (یعنی چار سو مرتبہ) ”الا اللہ“ کا ذکر کرے اور دل پر ہلکی ہلکی ضرب
لگاتا جائے اور اللہ کی محبت کا تصور قائم رکھے۔

پھر چھ تسبیح (چھ سو مرتبہ) ”اللہ اللہ“ کا ذکر کرے اور اس میں سینہ کے دائیں و
بائیں دونوں طرف ضرب لگائے، یا پہلے لفظ اللہ پر دل پر ضرب اور دوسرے لفظ اللہ
پر اوپر کی جانب سر کر کے ضرب لگائے۔

پھر ایک تسبیح (سو مرتبہ) صرف لفظ ”اللہ“ کا ورد کرے اور سینہ پر ضرب لگاتا
جائے اور اپنی بے بسی، مجبوری، محتاجی کا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور جلالت و
بزرگی کا تصور رکھے۔

یہ کل تیرہ تسبیحات ہیں؛ مگر عرف میں ان کا نام بارہ تسبیحات ہے۔

انتباہ: اصل مقصود ذکر ہے اور یہ خاص طریقہ ضرب و شغل کا محض ذکر اللہ کو
دل میں اتارنے اور بٹھانے کی ایک تدبیر و ترکیب ہے، جو تجربہ سے مفید و نافع معلوم
ہوئی ہے اور اسی وجہ سے صوفیاء و اولیاء اللہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے، جیسا کہ دین

کے اور بہت سے کاموں میں تجربات کی بناء پر ذرائع و وسائل کے درجہ میں کچھ چیزوں کو اختیار کیا جاتا ہے؛ مگر یہ ذرائع و وسائل مقصود نہیں ہوتے، اسی طرح اصل مقصد ذکر اللہ ہے اور یہ اشغال، محض ذرائع کے درجہ میں اختیار فرمائے گئے ہیں لہذا ان کو مقصود نہ سمجھنا چاہئے اور نہ باعث اجر و ثواب، اجر و ثواب تو ذکر پر ہے اور اس کا وسیلہ ہونے کی بناء پر، ان وسائل پر بھی ہو سکتا ہے۔

ان مذکورہ اذکار کے علاوہ، روزانہ صبح شام تین تین تسبیح کا معمول بنائے ایک تسبیح ”لا الہ الا اللہ“ کی ایک استغفار کی اور ایک درود شریف کی، اور چلتے پھرتے ”لا الہ الا اللہ“ یا اور کوئی ذکر کرتے رہنا چاہئے۔

تلاوت قرآن مجید کا معمول

قرآن پاک کی تلاوت، افضل الاذکار ہے اور تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، مشہور ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور پوچھا کہ اے اللہ میں آپ کی قربت چاہتا ہوں، اس کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک کی تلاوت کرو، اس سے میرا قرب حاصل ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الْأُتْرُجَةِ رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَا رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ. » (۱)

(اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، نارنگی کی طرح

(۱) بخاری: ۵۴۲۷، مسلم: ۱۳۲۸، ترمذی: ۲۷۹۱، نسائی: ۴۹۵۳، ابو داؤد:

۴۱۹۱، ابن ماجہ: ۲۱۰، احمد: ۸۷۲۸ / دارمی: ۳۲۲۹

ہے، جس کی بو بھی پاکیزہ اور مزہ بھی عمدہ ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔ جس کی کوئی خوشبو نہیں ہوتی؛ مگر مزہ میٹھا ہوتا ہے۔)

ایک حدیث میں ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ: إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ؛ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ كَزَّةٌ ذِكْرُ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ. » (۱)

(نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب کہ اس کو پانی پہنچے، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کی صفائی کیا ہے؟ فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی کثرت سے تلاوت کرنا۔)

غرض یہ کہ تلاوت بڑی اہم چیز ہے؛ لہذا روزانہ کچھ نہ کچھ تلاوت کا معمول بنانا چاہئے، غیر حافظ کم از کم پاؤں سپارہ اور حافظ کم از کم ایک سپارہ پڑھے۔ اور صبح روزانہ یسین شریف اور بعد مغرب سورۃ واقعہ اور سونے سے پہلے سورۃ الم سجدہ اور سورۃ ملک اور سوتے وقت آیۃ الکرسی، آمن الرسول، سورۃ قل ھو اللہ احد، سورۃ فلق و سورۃ ناس کا معمول رکھے۔ کہ ان سب کے فضائل احادیث میں وارد ہیں۔ نیز جمعہ کے دن خاص طور پر سورۃ کہف کا اہتمام کرے۔

درود شریف کا اہتمام

روزانہ صبح شام، ایک ایک تسبیح درود شریف کا معمول رکھے اور جمعہ کے دن اس

کی خوب کثرت کرے احادیث میں درود شریف کے بہت فضائل آئے ہیں۔
ایک حدیث میں ہے:

”جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمت فرماتے ہیں۔ (۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین وہ آدمی ہوگا جو مجھ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجتا تھا۔“ (۲)

لہذا درود شریف کا اہتمام کرنا چاہئے کہ اس سے بھی سالک کو درجات قرب نصیب ہوتے ہیں۔

دعاؤں کا اہتمام

کوئی بھی کام ہو، چاہے دنیا کا یا دین کا، بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق کے نہیں ہو سکتا؛ اس لیے سالک کو اس راستہ کے طے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے اور دیگر ضروریات و حاجات کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے دعا کی بڑی اہمیت و ضرورت و فضیلت ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

«الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ.» (۳)

(دعا عبادت کا مغز ہے۔)

(۱) مسلم: ۵۷۷، ترمذی: ۵۳۴۷، نسائی: ۶۷۱، ابو داؤد: ۴۳۹، احمد: ۶۲۸۰

(۲) ترمذی: ۴۴۶، قال حدیث حسن غریب، ترمذی: ۳۲۹۳

(۳) ترمذی: ۳۲۹۳

ایک حدیث میں دعا کو رحمت کی گنجی فرمایا گیا ہے اور ایک حدیث میں مومن کا ہتھیار فرمایا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اشرف العبادۃ دعا ہے۔ نیز فرمایا گیا کہ جو اللہ سے سوال نہیں کرتا۔ اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ کہتا ہے۔ اے رب! اے رب! تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ اے میرے بندے! حاضر ہوں۔ مانگ، عطا کیا جائے گا۔ (۱)

غرض دعا کا اہتمام کرنا چاہئے اور خاص طور پر جو دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، وہ چونکہ اللہ کے نزدیک مقبول بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی ہیں اس لیے ان دعاؤں کو پڑھنے کا اہتمام کیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ آپ نے ایسی ایسی باتوں کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے۔ کہ کسی انسان کا ذہن ان باتوں کی طرف نہیں جاتا، پھر یہ دعائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے کلام ہے جس طرح قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا آپ سے کلام ہے۔ لہذا اس کے مقبول ہونے اور مؤثر ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی ”مناجات مقبول“ یا ملا علی قاری رحمۃ اللہ کی ”الحزب الاعظم“ جو آپ کی مستند دعاؤں کے مجموعے ہیں۔ ان کی روزانہ ایک ایک منزل کا معمول بنالیا جائے اور پوری منزل مشکل ہو تو کچھ دعائیں ہی دھیان سے پڑھ لیا کرے۔

نفل روزوں کا اہتمام

رمضان کے روزوں کے علاوہ نفل روزوں کا بھی اہتمام کرنا چاہئے، جس سے خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو کہ سلوک کے لیے لازم

(۱) یہ احادیث کنز العمال: ۲/۲۸ تا ۲۹ پر ہیں

ہے، خصوصاً ایام بیض (یعنی ہر ماہ کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ) کے روزے کہ ان کی فضیلت آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ماہ کے تین روزے، پوری زندگی روزہ رکھنے کی طرح ہے۔ (۱)

اللہ کے راستہ میں صدقہ

وقتاً فوقتاً اللہ کی راہ میں صدقہ خیرات بھی کیا کرے، اس سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِنَ اللَّهِ، قَرِيبٌ مِنَ النَّاسِ، قَرِيبٌ مِنَ الْجَنَّةِ، بَعِيدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ بَعِيدٌ مِنَ الْجَنَّةِ، قَرِيبٌ مِنَ النَّارِ وَلَجَاهِلٌ سَخِيٌّ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيلٍ. » (۲)

(سخی، اللہ سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔ اور بخیل، اللہ سے دور، لوگوں سے دور، جنت سے دور اور دوزخ سے قریب ہے۔ اور جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے محبوب ہے۔)

ایک حدیث میں ہے کہ سخاوت، اللہ عظمیٰ کی صفت ہے۔ (۳)
الغرض سالک کو سخاوت کا عادی ہونا چاہیے یہ اللہ کے خاص بندوں کی صفت ہے۔

(۱) بخاری: ۱۹۷۹، مسلم: ۱۹۷۳، نسائی: ۲۳۵، ابو داؤد: ۴۰۷۲، احمد: ۶۲۷۱

(۲) کنز العمال: ۱۵۹۲۳

(۳) کنز العمال: ۱۵۹۲۳، ترمذی: ۲۲۴۰، احمد: ۲۵۳۷

مراقبہ و محاسبہ

روزانہ سونے سے پہلے، مراقبہ کرے: مراقبہ بہت سے امور کا ہوتا ہے: مثلاً اللہ تعالیٰ کی جلالت و عظمت کا، جیسے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا خیال کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ (۱)

اور موت کا مراقبہ کہ میں مرجاؤں گا؛ لوگ مجھ کو دفن کر دیں گے۔ قبر میں سوال ہوگا منکر نکیر کا سامنا ہوگا۔ وغیرہ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں سے سمجھو۔ (۲)

اس طرح کچھ دیر روزانہ مراقبہ کیا کرے، اس سے اپنے حالات کو درست کرنے میں مدد ملے گی۔

اسی طرح سونے سے قبل محاسبہ کرے یعنی دن بھر کے اپنے اعمال و عبادات کا نیکیوں اور برائیوں کا جائزہ لے اور نیکیوں پر اللہ کا شکر ادا کرے اور مزید کی توفیق کا سوال کرے اور برائیوں پر توبہ کرے اور آئندہ نہ کرنے کے لیے بھی توفیق کا سوال کرے۔

هذا ما اردت ايراده في هذا المقام بتوفيق الله العلام
والله ارجو ان يوفقني واياكم للخير الهادي الى دار السلام

(۱) ترمذی: ۲۲۴۰، احمد: ۲۵۳۷

(۲) ترمذی: ۲۲۵۵، ابن ماجہ: ۴۱۰۴، احمد: ۴۷۶۰

احکامِ شعبان و شبِ برأت
تحقیق کے آئینے میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقدیم

یہ کتابچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، دراصل احقر کے تین مضامین کا مجموعہ ہے، جو ماہ شعبان و شب برأت کے بارے میں مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور بعض اخبارات میں شائع بھی ہوئے تھے، ماہ شعبان اور خصوصاً شب برأت کے فضائل اور احکام پر ان مضامین پر مدلل بحث کی گئی ہے اور افراط و تفریط سے بچتے ہوئے وہ ”نقطۂ اعتدال“ پیش کیا گیا ہے، جس کو جمہور علماء حق نے اختیار کیا ہے، اور اس میں ایک طرف یہ واضح کیا گیا ہے کہ شب برأت کی فضیلت کو مان کر جو لوگ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور بدعات اور خرافات میں مبتلا ہو کر حقیقی فضیلت سے محروم ہو جاتے ہیں، وہ افراط و احداث فی الدین کی بیماری کا شکار ہیں، تو دوسری طرف ان تفریط کرنے والوں کی کوتاہی پر تنبیہ بھی کی گئی ہے، جو شب برأت کی فضیلت کے اصرار میں اور دلائل و براہین کی روشنی میں ماہ شعبان و شب برأت کی فضیلت و عظمت کو ثابت کیا گیا ہے۔

خصوصاً غیر مقلدین جو ہمیشہ جزوی و فروعی مسائل میں خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے اور سلف صالحین کے برخلاف جزوی مسائل میں تشدد اور انتہاء پسندی کا مظاہرہ کر کے بین المسلمین تفریق اور اختلاف ڈالتے ہیں، چوں کہ وہ اس مسئلہ میں بھی اپنی روش کے مطابق احادیث و آثار اور سلف صالحین کے اقوال

سب سے آنکھے بند کر کے اپنی ایک الگ ہی رائے رکھتے ہیں، لہذا خصوصیت سے اس رسالے میں ان کے مقتدر علما کے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ خصوصاً علامہ ناصر الدین الالبانی جو غیر مقلدین کے نزدیک بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، ان کا حوالہ بھی تفصیلاً پیش کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ شب برأت کی فضیلت ثابت شدہ حقیقت ہے، جس سے انکار سوائے ضد کے کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے نازک ترین دور میں جب کہ اہل اسلام کے خلاف دنیا کی مادی طاقتیں مجتمع اور تمام باطل ملتیں سر جوڑ کر سازشوں میں لگی ہوئی ہیں، ان جزوی مسائل پر بحث ایک غیر ضروری اور مقصد سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ آج چاہئے تو یہ تھا کہ تمام فرق اسلامیہ اپنے اختلاف کو بالاطاق رکھ کر باطل قوتوں اور طاقتوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی دیوار کے مانند اور جسد واحد بن کر کھڑے ہو جاتے اور ساری دنیا پر حکومت الہیہ کی برتری و فوقیت کو ثابت کر دیتے۔

مگر افسوس کہ اب اس کے بجائے بعض لوگ ان فروعی مسائل میں الجھ کر اس اصل کام اور ذمہ داری سے شعوری یا غیر شعوری طور پر غافل اور غیروں کا لقمہ تر بننے جا رہے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل پر ابھارنے والے غیر مقلدین جو حقیقت سے بے خبری کے ساتھ تعصب اور تفرق کا شکار ہیں اور حدود سے متجاوز ہو کر ناروا تشدد اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حنفیت اور تمام فقہی مکاتب اور صحابہ و اسلاف اور بزرگان دین سے امت کو بدظنی میں مبتلا کرتے ہیں، ان کی ان ناروا تحریکات و کارروائیوں کے جواب میں بادل ناخواستہ ان مسائل پر کہنا اور لکھنا پڑ رہا ہے۔

غرض ان بے اعتدالیوں کی بنا پر ضرورت معلوم ہوئی کہ اس موضوع پر لکھے گئے ان مضامین کو جزوی ترمیم و اضافہ اور مزید حوالجات سے مزین کر کے شائع کیا جائے۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقبولیت و نافعیت سے نوازے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

۲۰/ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ماہ شعبان - فضائل و اعمال

تمہید

ماہ شعبان اسلامی کیلنڈر کا ایک محترم و معظم مہینہ ہے اور ہمارے لیے رحمتوں اور برکتوں، فضیلتوں اور سعادتوں کو لے کر آتا ہے اور ہم سے طالب ہوتا ہے کہ ہم ان سعادتوں اور برکتوں سے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنا حصہ حاصل کر لیں۔ مگر بہت سے لوگ اس ماہ کی آمد و رفت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس سے بے توجہی و غفلت برتتے اور ان سعادتوں اور برکتوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور بعض حضرات اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر اس مہینہ میں بعض بدعات و خرافات کے مرتکب ہوتے ہیں اور سعادتوں اور برکتوں کے بجائے حرمان نصیبی، بلکہ اور اس سے بڑھکر بد بختیوں اور نحوستوں کے مستحق قرار پاتے ہیں، حالاں کہ مسلمان کی بحیثیت مسلمان ہونے کے سب سے پہلی اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہر معاملہ میں قانون خداوندی اور شریعت محمدیہ سے استفادہ کرے، اور جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے ان کو ضرور کرے اور جن سے منع کیا گیا ہے، ان سے پوری طرح پرہیز کرے، من مانی رسومات، من گھڑت خرافات سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رکھے۔ اسی طرح جب کوئی مہینہ آئے تو پہلے معلوم کرے کہ شریعت نے اسکے بارے میں کیا کرنے اور کیا نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

ماہ شعبان کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں؛ مگر ان میں سے اکثر روایات ضعیف ہیں۔ تاہم بعض صحیح احادیث سے بھی شعبان کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان سے زیادہ رمضان چھوڑ کر کسی اور مہینہ میں روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (۱)

بعض احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ سوائے چند دنوں کے شعبان بھر روزہ رکھتے تھے۔ یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک روزہ رکھنے کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ مہینہ شعبان تھا۔ (۲)

(۲) نسائی: ۳۴۱/۱

ایک حدیث میں شعبان کے مہینہ کی ایک خاص فضیلت یہ بتائی گئی ہے کہ اس ماہ میں اللہ رب العالمین کے دربار میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔

چناں چہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کو کسی مہینہ میں اتنے روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، جتنے کہ آپ شعبان میں رکھتے ہیں؟ آپ نے یہ فرمایا کہ ہاں وہ (شعبان) ایک مہینہ ہے۔ رجب و رمضان کے درمیان جس سے لوگ غافل رہتے ہیں اور وہ ایسا مہینہ ہے جس میں اللہ رب العالمین کے دربار میں اعمال پیش ہوتے ہیں۔ لہذا میں پسند کرتا ہوں کہ ہر عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے دار ہوں۔^(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔
اس پر کوئی جرح نہیں کی ہے؛ بل کہ فرمایا کہ ابن خزمیہ رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو صحیح
قرار دیا ہے۔ (۲)

نیز یہی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ابو یعلیٰ نے ذکر کی ہے جس

(۱) طحاوي: ۲۸۸/۱، نسائی: ۳۲۲/۱، مسند اسماعیله: ۱۲۶/۱

(٢) فتح الباري: ٢/٢١٥

میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اس ماہ میں) ہر اس نفس کا فیصلہ لکھ دیتا ہے جو اس سال مرنے والا ہے: بندہ میں چاہتا ہوں کہ میری موت روزِ دارِ ہونے کی حالت میں آئے۔ (۱)
ان دو روایات سے معلوم ہوا کہ شعبان کی دو خاص فضیلتیں ہیں، ایک یہ کہ اس مہینہ میں اللہ کے حضور میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ بندوں کی موت کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ متعدد احادیث میں مذکور ہے کہ ہر پیر و جمعرات کو اعمال پیش کئے جاتے ہیں، جب ہر پیر و جمعرات کو اعمال پیش ہو جاتے ہیں تو شعبان میں پھر کون سے اعمال مخصوص طور پر پیش کئے جاتے ہیں؟
اس شبہ کا جواب علامہ سندھی رحمۃ اللہ نے حاشیہ نسائی میں دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال ایک تو روز کے روز اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں، پھر ایک ہفتہ کے اکھٹے پیش ہوتے ہیں، پھر سال میں ایک دفعہ شعبان میں پورے سال کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، رہی اس کی حکمت تو وہ اللہ ہی زیادہ جانتے ہیں۔ (۲)
غرض شعبان کے مہینہ میں انسانوں کے اعمال اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے اسی مہینہ میں اس سال مرنے والوں کا نام لکھ دیا جاتا ہے۔

شعبان سے غفلت پر نکیر

اوپر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رجب و رمضان کے درمیان آنے والے مہینہ ”شعبان“ سے غفلت برتنا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قبل نکیر

(۱) مسند ابو یعلیٰ: ۳۱۱/۸

(۲) حاشیہ نسائی از علامہ سندھی: ۳۲۲/۱

ان کے علاوہ شعبان کی ایک اور فضیلت بھی ہے، وہ یہ کہ یہ مہینہ رمضان شریف سے ملا ہوا ہے، گویا یہ رمضان کا پیش خیمہ ہے۔ اس اعتبار سے بھی شعبان کو خصوصیت حاصل ہے، جیسے مقدس مقام و جگہ کے اطراف و اکناف کے حصے بھی قابل تعظیم ہوتے ہیں، ایسے ہی مقدس زمانے سے متصل زمانہ بھی قابل احترام و تعظیم ہوتا ہے۔ اس کی طرف ترمذی کی ایک ضعیف حدیث میں اشارہ ملتا ہے۔

فائدہ علمیہ: اگرچہ یہ حدیث مسلم کی ایک حدیث سے بظاہر متعارض نظر آتی ہے، جس میں ہے کہ رمضان کے بعد سب سے افضل محرم کا روزہ ہے اور اسی وجہ سے ابن حجر رحمۃ اللہ نے ترمذی کی اس حدیث کو رد فرمایا ہے؛ مگر میرے نزدیک دونوں میں کوئی تعارض حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ کیوں کہ محرم کے روزہ کی افضلیت جس کا ذکر مسلم کی حدیث میں ہے وہ بالذات اور اصالتاً ہے، جب کہ ترمذی کی حدیث میں مذکور شعبان کے روزہ کی فضیلت بالتبع ہے، یعنی رمضان کی تعظیم و حرمت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خود حدیث میں مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایک کو اصالتاً افضل، دوسرے کو تبعاً افضل قرار دیا گیا تو تعارض نہ رہا۔ واللہ اعلم

۴۴۴

غرض شعبان کے مہینہ میں بذاتِ خود بھی فضیلت ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا اور رمضان کی وجہ سے بھی اس کو فضیلت حاصل ہے، جیسا کہ اس حدیث کا مقتضی ہے۔

شعبان کے اعمال

اب سوال یہ ہے کہ اس معظم و محترم مہینہ میں کیا کوئی مخصوص عمل ہے؟ ظاہر ہے کہ ہماری شریعت میں ہمیں یا کسی اور کو اس بات کی گنجائش نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی عمل تراش لے۔ خواہ وہ عمل دوسرے موقعہ پر دین میں ثابت ہو۔ مگر اس موقع سے ہٹا کر دوسرے موقع پر بھی اس مخصوص عمل کو اختیار کرنا بلا دلیل شرعی جائز نہ ہوگا۔ مثلاً: نماز تراویح رمضان میں مشروع ہے اور بڑے ثواب کا کام ہے؛ مگر کوئی اس عمل کو شعبان میں بھی جاری کرے اور کہنے لگے کہ اتنے بڑے عمل کو اگر شعبان جیسے معظم مہینہ میں ہم کریں تو ثواب کے مستحق ہوں گے، تو یہ غلط اور خلاف شرع ہے؛ اس لیے یہ غور کرنا چاہیے کہ شعبان کے اندر شریعت میں مخصوص کوئی عمل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب اوپر پیش کردہ احادیث سے نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس مہینہ میں کثرت کے ساتھ روزہ رکھنا چاہیے، یہ عمل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے منصوص طور پر منقول ہے، البتہ بعض احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ہدایت فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ نصف شعبان (پندرہ شعبان) کے بعد رمضان آنے تک روزہ نہ رکھا جائے۔^(۱)

شعبان میں رمضان کی تیاری

اس حدیث میں بظاہر ایک چیز (نصف شعبان کے بعد روزہ) سے منع فرمایا ہے؛ مگر حقیقت میں یہ ایک اور چیز کا حکم دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کو بھی شعبان

(۱) ترمذی: ۱/۱۵۵، طحاوی: ۱/۲۸۷

کے اعمال میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھنا چاہیے، اس کی وجہ اور حکمت یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد رمضان سے پہلے روزہ رکھنے سے ہو سکتا ہے کہ کچھ ضعف اور کمزوری پیدا ہو اور یہ ضعف و کمزوری رمضان کے روزوں اور عبادتوں میں سستی و کاہلی کا باعث بن جائے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں سے محرومی کا سبب بن جائے؛ اس لیے آپ نے نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنے سے منع فرمادیا۔

تو یہ منع کرنا دراصل رمضان کے لیے تیار رہنے اور تیار ہونے کا حکم ہے کہ رمضان سے قبل روزہ رکھ کر کمزور نہ ہو؛ بل کہ روزہ نہ رکھو اور اپنے آپ کو رمضان کے لیے تیار کر لو، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شعبان میں جس طرح ایک عمل کثرت کے ساتھ روزہ رکھنے کا ہے، دوسرا عمل رمضان کے لیے تیاری کرنے کا بھی ہے؛ لہذا رمضان میں روزہ رکھنے اور تراویح اور دیگر عبادات میں چستی اور دلجمعی کے ساتھ لگنے کے لیے شعبان ہی سے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے۔ مثلاً کمزور آدمی اچھی اور عمدہ غذاؤں اور دواؤں کے ذریعے اپنے آپ کو تیار کر لے، بیمار آدمی علاج و معالجہ کر کے اپنے آپ کو تیار کر لے، کسی کو سفر کا خیال ہو تو شعبان ہی میں اس سے فارغ ہو جائے، یہ ہے منشاء نبی کریم ﷺ کا۔ غرض یہ کہ شعبان فضیلت والا مہینہ ہے، اس میں روزے رکھے جائیں اور رمضان کی تیاری کی جائے۔ اب میں شبِ برأت کی فضیلت پر کلام کروں گا۔

شبِ برأت دلائل کے آئینہ میں

شبِ برأت کا اسلام میں کوئی مقام ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا اور کیسا؟ نیز ہمیں اس میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے یہ چند پہلو ہیں جن پر یہاں روشنی ڈالوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، بعض لوگ شبِ برأت کی فضیلت و حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور بعض لوگ اس کو اس مقام تک پہنچاتے ہیں، جس کی وہ مستحق نہیں، پھر اس فضیلت کے قائل اکثر حضرات ایسے ہیں، جو اس میں بہت سی من گھڑت رسومات و بدعات میں مبتلا ہیں؛ اس لیے یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس میں مسلک اعتدال کو پیش کرتے ہیں۔

شبِ برأت کی فضیلت

جہاں تک شبِ برأت کی فضیلت کا مسئلہ ہے، اس میں متعدد احادیث وارد ہیں، جیسا کہ آگے عرض کروں گا۔ البتہ شبِ برأت کی فضیلت کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہے یا نہیں؟ اس میں علما کی دورائے ہیں اور اس اختلاف کا منشا قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر میں اختلاف ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ . فِيهَا يُفْرَقُ

كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٌ﴾ (الْبَحَّارُ : ۴۳)

(بلاشبہ ہم نے اس (قرآن) کو مبارک رات میں نازل کیا، بیشک

ہم ڈرانے والے ہیں، اس رات میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا

جاتا ہے۔)

ان آیات کی تفسیر میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ مراد شبِ برأت ہے کہ اس میں فیصلے کئے جاتے ہیں، اسی کو حضرت عکرمہ اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے؛ مگر جمہور مفسرین نے اس پر سختی سے رد کیا ہے؛ کیوں کہ ان آیات میں مذکور ہے کہ اس مبارک رات میں اللہ نے قرآن نازل فرمایا اور یہ مسلم و ظاہر ہے کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے، تو لا محالہ اس سے بھی لیلۃ القدر ہی مراد ہے اور ہونا

چاہیے اور چوں کہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے اور قرآن میں یہ دوسری جگہ آیا ہے کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے؛ اس لیے یہی تفسیر رائج بل کہ متعین ہے۔ غرض قرآن کی اس آیت میں اگر شبِ برأت مراد ہو تو اس کی فضیلت قرآن سے بھی ثابت ہوگی، ورنہ نہیں، اور چونکہ رائج تفسیر کے مطابق شبِ برأت مراد نہیں، اس لیے قرآن سے اس کی فضیلت کا ثبوت مشکل ہے، اس کی تفصیل ہمارے اگلے مضمون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

البتہ احادیث میں اس کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور اس سلسلے میں بہت سے صحابہ سے روایات آئی ہیں، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے منشور میں ان کو جمع کر دیا ہے، اغلب یہ ہے کہ پچیس سے زائد احادیث اس سلسلے میں مروی و منقول ہیں؛ مگر اکثر احادیث ضعیف و منکر اور شدید الضعف ہیں؛ مگر جو روایات بہت ضعیف ہیں، ان کو چھوڑ کر بھی متعدد روایات ایسی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں؛ اس لیے سرے سے ان روایات کا انکار اصولِ محدثین کے اعتبار سے بھی درست نہیں؛ کیوں کہ محدثین نے اصول لکھا ہے کہ متعدد ضعیف روایات جمع ہو جائیں تو وہ درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہیں۔

شبِ برأت کی فضیلت میں صحیح حدیث

یہ تو ایک عمومی اصول حدیث کی رو سے عرض کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ناظرین کے لیے یہ انکشاف حیرت زدہ ہوگا کہ اس سلسلے میں ایک حدیث صحیح بھی وارد ہوئی ہے، عالم اسلام کے مشہور سلفی عالم مسلک اہل حدیث کے شارح و داعی علامہ ناصر الدین البانی نے ”اصلاح المساجد“ مصنفہ علامہ جمال الدین القاسمی کے حاشیہ پر ابن ابی عاصم کی ”السنة“ اور ابن حبان کی ”الصحيح“ کے حوالے سے

حدیث نقل کی ہے، یہ حدیث بہ طریق مالک ابن یخامر عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مروی ہے، الفاظ یہ ہیں:

«يَطْلُعُ اللَّهُ إِلَى خَلْقِهِ فِي لَيْلَةِ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ

لِجَمِيعِ خَلْقِهِ إِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ.»

(شعبان کی پندرھویں شب میں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے

ہیں اور سوائے مشرک اور کینہ پرور کے سب کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔) (۱)

اس حدیث کو نقل کر کے شیخ البانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے رجال

(راوی) ثقہ (قابل اعتماد) ہیں اور حدیث صحیح ہے۔ (۲)

اس صحیح حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ شعبان کی پندرھویں شب جس کو شب

برأت کہتے ہیں، اس کو بلاشبہ ایک فضیلت حاصل ہے اور یہ بات بے اصل نہیں ہے،

جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔

بعض اور احادیث

اس صحیح حدیث کے ساتھ جب ان احادیث کو ملا یا جاتا ہے، جو بہ طرق ضعیفہ

شبِ برأت کی فضیلت میں آئی ہیں، تو اس کو مزید قوت ملتی ہے اور وہ ضعیف روایات

بھی قابل اعتبار قرار پاتی ہیں، جیسا کہ محدثین کا اصول ہے، یہاں ان سب روایات

کو پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ دو ایک روایات پیش کرتا ہوں۔

(۱) ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک رات انہوں

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو پریشاں ہوئیں اور تلاش کرتی ہوئی

(۱) السنة لابن أبي عاصم: ۱/۲۲۴، صحيح ابن حبان: ۲۸۱/۱۲

(۲) حاشیہ اصلاح المساجد مترجم: ۱۲۸، مطبوعہ الدار السلفیہ بمبئی

مدینہ کے قبرستان ”جنت البقیع“ کی طرف نکل گئیں۔ وہاں دیکھا کہ آپ ﷺ موجود ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی شب (پندرہویں شب) میں آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور بنو کلب (ایک قبیلہ جو عرب کے تمام قبائل میں سب سے زیادہ بکریاں پالتا تھا) کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ (۱)

یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہے، ایک اس لیے کہ حجاج بن ارطاة اس کے ایک راوی کو جمہور علما نے ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں دو جگہ انقطاع ہے، ایک حجاج اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہما اللہ کے درمیان؛ کیوں کہ حجاج کو یحییٰ سے سماع حاصل نہیں، دوسرے یحییٰ اور عروہ کے درمیان؛ کیوں کہ یحییٰ کو عروہ سے سماع حاصل نہیں؛ مگر ان میں سے بعض کا جواب ممکن ہے؛ کیوں کہ حجاج بن ارطاة کی بعض محدثین نے توثیق بھی فرمائی ہے، جیسے ثوری، ابن عیینہ رحمہما اللہ وغیرہ اور اکثر حضرات نے ان پر جو جرح کی ہے، وہ تدلیس کی ہے اور بہت سے حضرات ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں، جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔ (۲)

لہذا پہلی وجہ ضعف ختم نہیں تو ضعیف ہو گئی، دوسرے یہ کہ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے یحییٰ کا سماع عروہ سے ثابت کیا ہے، جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ (۳)

اب بس ایک وجہ ضعف کی باقی رہی، وہ ہے حجاج اور یحییٰ کے درمیان کا واسطہ نہ

(۱) ترمذی: ۱۵۶/۱، مسند اسحق بن راہویہ: ۹۷/۳، مسند احمد: ۳۳۸/۶،

عبد بن حمید: ۲۳۷/۱

(۲) تہذیب التہذیب: ۱۹۷/۲-۱۹۸

(۳) دیکھو: معارف السنن: ۲۲۱/۵

ہونا غرض یہ کہ یہ روایت اتنی ضعیف نہیں کہ بالکل ناقابل التفات ہو؛ بل کہ ضعف کے باوجود پہلی حدیث صحیح سے مؤید ہے۔

(۲) امام احمد نے مسند میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی درمیانی شب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوائے کینہ پرور اور خودکشی کرنے والے کے تمام بندوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔ (۱)

اس مضمون کی بہت سی احادیث مرفوعاً و موقوفاً مروی ہیں اور ایک دوسرے کی تائید و تقویت کرتی ہیں، معلوم ہوا کہ اس رات کو فضیلت حاصل ہے، اس کا انکار کسی اہل حق کے لیے ممکن نہیں۔

کیا شبِ برأت فیصلے کی رات ہے

اور اس رات کی فضیلت میں وارد بہت سی احادیث ہیں یہ بھی آتا ہے کہ اس رات میں اللہ کے طرف سے فیصلے ہوتے ہیں، یعنی اس شعبان سے آئندہ شعبان تک پیدا ہونے والوں، مرنے والوں کے نام لکھ کر فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ روایات سب کی سب ضعیف ہیں، جیسا کہ علما نے لکھا ہے؛ مگر یاد ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ایک روایت شعبان کی فضیلت میں اوپر ذکر کی گئی، جس کو ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں نقل کیا ہے اور سکوت فرمایا ہے جو علما کے نزدیک روایت کے صالح لہذا احتجاج ہونے کی علامت ہے۔ (۲)

(۱) مسند احمد: ۱۰/۱۲۷

(۲) مقدمہ اعلاء السنن: ۱/۵۵

اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: شعبان وہ مہینہ ہے جس میں اس ایک سال میں مرنے والوں کا نام لکھ دیا جاتا ہے، یہ روایت ان ضعیف روایات کی تائید کرتی ہے، جس سے فی الجملہ شبِ برأت کا فیصلہ کی رات ہونا ثابت ہوتا ہے، بس اتنی بات ہے کہ اس حدیث میں شعبان کا ذکر ہے اور روایات میں نصف شعبان کی رات کا یہ امکان ہے کہ شعبان کہہ کر شعبان کی ایک یہی رات مراد لی گئی ہو، مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فیصلوں کے لیے شبِ قدر کو جب مقرر کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ (الْجَنَّةِ: ۴)

لیلۃ القدر میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور احادیث سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے تو پھر شبِ برأت میں فیصلہ ہونے کا کیا مطلب؟ بعض علما نے اس اشکال کی وجہ سے شبِ قدر میں فیصلے ہونے کے دلائل چوں کہ مضبوط ہیں؛ اس لیے شبِ برأت والے دلائل کو ناقابل التفات قرار دیا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، شبِ برأت کے فیصلہ کی رات ہونے پر صحیح یا حسن روایت فی الجملہ دلالت کرتی ہے اور دیگر احادیث سے اس کو قوت ملتی ہے؛ اس لیے دیگر علما نے دونوں اقوال میں تطبیق دی ہے، اس طرح کہ شبِ برأت میں ہر کام کا فیصلہ لکھا جاتا ہے اور فرشتوں کے حوالہ کیا جاتا ہے؛ مگر نفاذ لیلۃ القدر سے ہوتا ہے؛ اس لیے دونوں راتوں کو فیصلہ کی رات کہنا درست ہے۔ چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا:

”اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شعبان کی درمیان شب میں فیصلے

واقع ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے، ہاں اختلاف اس میں ہے کہ

آیت میں یہ مراد ہے یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ آیت سے یہ مراد نہیں، غرض حدیث اور آیت سے دونوں راتوں (لیلۃ البرأت) میں فیصلوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک رات میں اجمالاً اور دوسری میں تفصیلاً فیصلوں کا وقوع ہو، یا ایک رات میں دنیوی امور کے اور دوسری میں اخروی امور کے فیصلے ہوں وغیرہ احتمالات موجود ہیں۔“ (۱)

نقطۂ اعتدال

اس تفصیل سے یہ بات کسی قدر وضاحت و صراحت کے ساتھ سامنے آگئی کہ شبِ برأت کی اصل ہے اور اس میں فضیلت ثابت ہے اور فی الجملہ اس کو فیصلہ کی رات کہنا بھی حدیث کی رو سے درست ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو اس کی حد سے آگے بڑھایا جائے، جیسا کہ ہمارے ان علاقوں میں دیکھا جاتا ہے کہ شبِ برأت کو بالکل وہ درجہ دے دیا گیا ہے، جو عید کے دن کا اسلام میں ہے، اس میں نئے کپڑے بھی بنائے جاتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کھانوں کا بھی اہتمام ہوتا ہے؛ نیز زبانوں پر بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ عید ہے۔ چنانچہ اس کو شعبان کی عید کہتے ہیں۔ جیسے رمضان کی عید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت اسلام نے اس رات کو یہ درجہ نہیں دیا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے کبھی اس رات میں عید کی طرح کا اہتمام نہیں فرمایا؛ حتیٰ کہ لوگوں کو مسجد میں یا کسی اور جگہ عبادت کے لیے جمع کرنے کا بھی اہتمام نہیں کیا گیا، بس اس کی فضیلت بیان کر کے انفرادی عبادت کی طرف متوجہ فرمادیا؛ لہذا نقطۂ اعتدال پر قائم رہنا چاہیے اور اس افراط و تفریط کو ترک کرنا چاہیے۔

شبِ برأت میں کیا کرنا چاہئے

اب رہا یہ سوال کہ شبِ برأت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں صحیح حدیث میں کوئی خاص عمل نظر سے نہیں گزرا؛ البتہ ضعیف حدیث سے چار عمل معلوم ہوتے ہیں اور چوں کہ یہ باب فضائل سے ہے؛ لہذا ان پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شعبان کی درمیانی شب ہو تو اس کی رات میں عبادت کرو اور دن میں روزہ رکھو؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس رات مغرب کے وقت آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی ہے! مغفرت مانگنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں، ارے! کوئی ہے رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں، کوئی ہے! مصیبت زدہ کہ میں اسے عافیت دوں۔ اسی طرح پکارتے ہیں حتیٰ کہ صبح طلوع ہو جاتی ہے۔ (۱)

اس حدیث کو علما نے ضعیف قرار دیا ہے؛ مگر چوں کہ فضائل میں ضعیف کو لینے کی گنجائش ہے؛ اس لیے اس کو ذکر کیا گیا ہے، اس حدیث میں تین عمل وارد ہوئے ہیں۔ رات میں قیام کر کے عبادت کرنا، دوسرے دن میں روزہ رکھنا، تیسرے اپنی مغفرت، رزق، سکون و راحت کے لیے اور دیگر حاجات کے لیے دعا کرنا اور چوتھا عمل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوا، جس کا ذکر اوپر ہوا کہ آپ اس رات قبرستان تشریف لے گئے تھے؛ لہذا اس رات قبرستان جانا بھی معلوم ہوا؛ مگر اس کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ چوں کہ یہ احادیث ضعیف ہیں؛ لہذا ان اعمال کو مستقل سنت کا درجہ دینا حدود سے تجاوز اور دین میں احداث کے مترادف ہے، اس لئے محض یہ سمجھ کر کہ فضیلت حاصل ہو، سادہ طریقہ پر ان کا اہتمام کر لیا جائے تا کہ فضیلت سے

محرومی نہ ہو، بعض لوگ قبرستان جانے کا ایسا اہتمام کرتے ہیں گویا کہ کوئی واجب کام ہو یا مستقل سنت ہو؛ اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اس کے لیے مستقل گاڑیوں کا انتظام کرتے ہیں، یہ حدود سے تجاوز ہے، جیسا کہ آگے عرض کروں گا۔

شب برأت میں دعا کا اہتمام

اور ایک خاص کام شب برأت میں یہ کرنا چاہیے کہ دعاؤں کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پانچ راتیں ہیں، جن میں دعاء رد نہیں ہوتی (یعنی ضرور قبول ہوتی ہے) وہ راتیں یہ ہیں، جمعہ کی رات، رجب کی پہلی رات، شعبان کی پندرہویں رات، اور عید کی دو راتیں (عید الفطر اور عید الاضحیٰ)۔ (۱)

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ یوں کہا جاتا تھا کہ پانچ راتوں میں دعاء قبول ہوتی ہے۔ جمعہ کی رات، عید الاضحیٰ کی رات، عید الفطر کی رات، رجب کی پہلی رات اور شعبان کی درمیانی رات۔ (۲)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا کہ ”یہ کہا جاتا تھا“ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دور صحابہ و تابعین کا ذکر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس دور میں یہ بات مشہور تھی۔

شب برأت کی بدعات

جو کام اس رات میں کرنا ہے، اس کا ذکر اوپر ہو گیا۔ اب میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رات میں بھی بہت سے کام ایسے کیے جاتے ہیں جو خلاف شریعت اور ناجائز ہیں، شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں؛ لہذا ان کاموں سے بچنا چاہئے، بعض لوگ شعبان میں یا خاص شب برأت میں اپنے گھروں کی لپائی، پتائی

(۱) شعب الایمان: ۳/۳۲۲

(۲) شعب الایمان: ۳/۳۳۱

اور مرمت وغیرہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ضرورت ہو تو یہ کام اس ماہ و شب میں بھی ہو سکتا ہے اور کسی اور وقت بھی ممکن ہے؛ مگر ضرورت کے لیے نہیں؛ بل کہ اس رات و ماہ کی خصوصیت سے اس کو کرنا بے اصل ہے۔ (۲) اس رات میں مساجد میں ضرورت سے زیادہ روشنی کرنا، میناروں کو روشنی سے سجانا بھی بے اصل؛ بل کہ شریعت کے خلاف ہے، علما نے اس پر سخت نکیر کرتے ہوئے اس کو غیر مسلموں کا طریقہ بتایا ہے۔

(۳) بعض جاہلوں میں رسم ہے کہ اس رات میں پٹانے چھوڑتے ہیں، یہ سراسر غیر اسلامی رسم ہے اور قطعی طور پر حرام۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اور وہ بھی مبارک رات کے موقعہ پر اس کا رواج ہو گیا۔

(۴) بعض لوگ اس میں حلوا پکانے اور کھانے کھلانے کو ضروری یا مستحب سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں بعض منگھڑت روایات سے استدلال کرتے ہیں، یہ بھی بے اصل اور بدعت ہے اور بعض لوگ شربت بناتے ہیں۔ یہ بھی خواہ مخواہ کی بات ہے۔

(۵) بعض لوگ اس رات میں مساجد میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں اور بعض لوگ مخصوص قسم کی نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سلسلے میں بعض لوگ ”اشغال شبِ برأت“ کے نام سے کتابچہ بھی شائع کرتے ہیں، جس میں مخصوص انداز سے نماز کا ذکر کرتے ہیں، علمائے حدیث نے ان احادیث کو موضوع و باطل قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشہور محدث علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے موضوعات میں ان احادیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ (۱)

لہذا عبادت جو چاہے کی جاسکتی ہے، نفل نماز عام طریقہ کے مطابق، دعاء، ذکر،

تلاوت وغیرہ جو چاہے کرے؛ مگر ان من گھڑت اعمال و عبادات کو ترک کرنا چاہئے۔

(۶) آج کل اس رات میں قبرستان جانے کی بات پر عمل میں انتہائی غلو ہو گیا ہے۔ لوگ وہاں جا کر خرافات میں شرکیہ اعمال بھی کرتے ہیں، بدعات قبور میں بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ سب واہیات ہے، ان سے بچنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شبِ برأت اور نقطہ اعتدال

اسلام میں شبِ برأت کی کوئی اصل اور حقیقت ہے یا نہیں اور ہے تو کیا اور کس قدر، اس سلسلے میں مختلف طبقات کی طرف سے مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں، بعض لوگ شبِ برأت کی فضیلت و عظمت اور اس کے مقام و مرتبہ کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر لیلۃ القدر کا شبہ ہونے لگتا ہے، جس کی عظمت و بزرگی نص قرآنی سے صراحتاً ثابت ہے، جب کہ شبِ برأت کا معاملہ ایسا نہیں اور بعض لوگ شبِ برأت کی فضیلت سے بالکل انکار کرتے اور اس کو ایک بے حقیقت شئی قرار دیتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ دونوں رائیں انتہا پسندانہ ہیں، پہلی رائے اگر ایک انتہا کو چھو رہی ہے تو دوسری رائے دوسری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور حق یہ ہے کہ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ ایسا نہیں کہ فضیلت ثابت نہیں ہے؛ بل کہ ثابت ہے اور ایسا بھی نہیں کہ لیلۃ القدر کی طرح اس کی فضیلت نص قرآنی سے ثابت ہو اور اس طرح کی فضیلت ہو جیسے لیلۃ القدر کی بتائی گئی ہے؛ بل کہ فی الجملہ اس کی فضیلت ثابت ہے، ذیل کے مضمون میں ہم اسی نقطہ اعتدال کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

شبِ برأت اور قرآن مجید

یہ ظاہر ہے کہ کسی شئی کی فضیلت کا ثبوت یا تو قرآن مجید سے ہونا چاہیے یا پھر احادیث شریفہ سے اس کے پیش نظر جب ہم شبِ برأت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی فضیلت اور عظمت کا کوئی سراغ قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں ملتا؛ البتہ بعض

حدیثوں سے اس کا پتہ چلتا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، بعض حضرات نے شبِ برأت کی عظمت اور بزرگی پر قرآن مجید سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سُورَةُ الدَّخَانِ کی ابتدائی آیات کو اس کا ماخذ و مستدل بنایا جاتا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

﴿حُمَ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ أَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ﴾
(الدَّخَانِ: ۴)

(حم) (اس کے معنی تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے) قسم ہے واضح کتاب کی، بلاشبہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا، ہم آگاہ کرنے والے تھے۔ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔ حکم ہو کر ہمارے پاس سے ہم بھیجنے والے ہیں۔)

ان آیات میں جو ”لیلہ مبارکہ“ (برکت والی رات) کا ذکر آیا ہے، اس سے بعض لوگ یہی شبِ برأت مراد لیتے ہیں؛ مگر جمہور علما کے نزدیک اس مبارک رات سے مراد شبِ برأت نہیں؛ بل کہ لیلۃ القدر ہے؛ کیوں کہ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ ہم نے مبارک رات میں قرآن نازل فرمایا اور خود قرآن نے دوسری جگہ بتا دیا کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے۔ تو لا محالہ اس مبارک رات سے بھی وہی لیلۃ القدر مراد ہونا چاہیے۔

علامہ ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ”البحر المحیط“ میں فرمایا کہ: ”قنادہ، زید اور حسن بصری رحمہم اللہ نے فرمایا کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ عکرمہ رحمہم اللہ اور بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے

مراد شعبان کی درمیانی رات (شبِ برأت) مراد ہے۔ ابو بکر بن عربی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں کوئی شئی ثابت نہیں ہے۔“ (۱)

امام سیوطی رحمۃ اللہ نے متعدد صحابہ اور تابعی حضرات سے یہی نقل کیا ہے کہ اس آیت میں مبارک رات سے مراد لیلة القدر ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابومالک، حضرت ابو عبد الرحمن سلمی، حضرت قتادہ، حضرت ابو نضرہ، حضرت مجاہد، حضرت ابوالجوزاء وغیرہ سے منقول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بسند صحیح ثابت ہے، جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے حاکم کی روایت سے نقل کر کے بتایا ہے کہ امام حاکم رحمۃ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ نے بہ طریق عطا خراسانی اور ابن ابی شیبہ و محمد بن نصر اور ابن المنذر رحمہم اللہ نے بہ طریق محمد بن سو قد عکرمہ سے اس کی تخریج کی ہے۔ (۲)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ ”بیان القرآن“ میں فرماتے ہیں کہ لیلة مبارکہ کی تفسیر اکثر نے شبِ قدر سے کی ہے اور بعض نے لیلة مبارکہ کی تفسیر لیلة البرأت سے کی ہے؛ لیکن چوں کہ کسی روایت میں نزولِ قرآن وارد نہیں اور شبِ قدر میں نزولِ خود قرآن میں مذکور ہے؛ اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ (۳)

مشہور فقیہ و مفسر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ اپنی تفسیر ”معارف القرآن“ میں رقمطراز ہیں:

(۱) البحر المحیط: ۳۱/۸

(۲) ذکرہ السیوطی فی الدر المنثور: ۵/۳۸-۳۹

(۳) ملخصات از بیان القرآن تفسیر، سورۃ الباقرات: ۹۵

”لیلہ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شبِ قدر ہے، جو رمضان مبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے، اس رات کو مبارک فرمانا اس لیے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شبِ قدر میں نزول ہونا، قرآن کی سُورَةُ الْقَدْرِ میں تصریح کے ساتھ آیا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی لیلہ مبارکہ سے مراد شبِ قدر ہی ہے، (آگے چل کر فرماتے ہیں) اور بعض مفسرین عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد شبِ برأت یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے؛ مگر اس رات میں نزول قرآن، دوسری تمام نصوص قرآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے اور چوں کہ بعض روایات میں شبِ برأت یعنی شعبان کی پندھرویں شب کے متعلق بھی آیا ہے کہ اس میں آجال (عمروں) اور ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں؛ اس لیے بعض حضرات نے آیت مذکورہ میں لیلہ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأت سے کر دی ہے؛ مگر یہ صحیح نہیں۔“ (۱)

غرض یہ کہ جمہور مفسرین نے خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے، اس آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہی لیتے ہیں اور عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول قول کو جس میں اس سے مراد شبِ برأت لی گئی ہے، ضعیف اور ناقابل التفات قرار دیتے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ان مفسرین کا مطلب و مقصد، شبِ برأت کا انکار نفی نہیں ہے؛ بل کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات میں ”لیلۃ مبارکہ“ جو واقع ہوا ہے، اس کی تفسیر ”شبِ برأت“ سے کرنا صحیح نہیں؛ کیوں کہ اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ اس رات میں قرآن کا نزول ہوا اور قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے نہ کہ ”لیلۃ البرأت“ میں؛ لہذا لیلۃ مبارکہ کی تفسیر میں صحیح بات یہی ہے کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے شبِ برأت کی بالکلیہ نفی و انکار پر استدلال درست نہیں، اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ لیلۃ مبارکہ سے یہ مراد نہیں۔ جیسا کہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

”وَأُورِدَ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ لَيْلَةِ النُّصْفِ مِنْ شُعْبَانَ

وَذَلِكَ لَا يَسْتَلْزِمُ أَنَّهَا الْمُرَادُ بِقَوْلِهِ فِي لَيْلَةِ مَبَارَكَةٍ.“ (۱)

(انہوں نے (سیوطی رحمۃ اللہ نے) شعبان کی درمیانی شب کی

فضیلت میں وہ روایات جو اس بارے میں آئی ہیں ان کو نقل کیا ہے۔ مگر

اس سے لازم نہیں آتا کہ لیلۃ مبارکہ سے یہی مراد ہو۔)

بہر حال بتانا یہ ہے کہ اب تک کی بحث و تفصیل سے اتنا معلوم ہوا کہ قرآن میں مذکور لیلۃ مبارکہ سے شبِ برأت ہی مراد نہیں؛ بل کہ لیلۃ القدر مراد ہے، اب رہا یہ کہ فی نفسہ اور فی الواقع شبِ برأت کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ یہ مستقل مسئلہ ہے۔ اور ہمارا جواب یہ ہے کہ شبِ برأت یعنی شعبان کی درمیانی رات کی فضیلت بعض احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور اس کی تائید و تقویت اور بعض جزوی امور کی تفصیل میں

(۱) فتح القدیر شوکانی: ۷۱۵/۴

ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی یہ شہادت طبقہ اہل حدیث کے لیے حجت ہے، اس کے بعد کسی کو انکار کی مجال نہ ہونا چاہیے، الا یہ کہ دلائل کی روشنی میں کوئی اس کا غلط ہونا ثابت کر دے۔

دوسری حدیث

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ لَيْلَةُ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ يَنْزِلُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِعِبَادِهِ إِلَّا مَا كَانَ مِنْ مُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ لَا خِيَةَ.» (۱)

(جب شعبان کی درمیانی شب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نازل ہوتے ہیں اور بس اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے اس کے جو مشرک ہو یا اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہو۔)
امام بزار رحمۃ اللہ نے اس کی تخریج کے بعد فرمایا:

”وَقَدْ رَوَى عَنْ غَيْرِ أَبِي بَكْرٍ وَإِنْ كَانَ فِي إِسْنَادِهِ شَيْءٌ فَجَلَالَةُ أَبِي بَكْرٍ تُحَسِّنُهُ.“

(یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے، اس کی سند میں اگرچہ کچھ کمی ہے؛ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جلالت و عظمت اس حدیث کی تحسین کرتی ہے۔)

نیز کہا کہ عبد الملک ابن عبد الملک معروف راوی نہیں ہے؛ لیکن اہل علم نے اس

(۱) بزار: ۱/۲۰۷، اعتقاد اہل السنة: ۳/۴۳۹، السنہ لابن ابی عاصم: ۱/۲۲۲

حدیث کو روایت کیا اور نقل کیا اور اس کو قبول کیا ہے؛ اسی لیے ہم نے بھی اس کا ذکر کیا۔ (۱)

علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ نے تحفۃ الاحوذی میں بہ حوالہ ترغیب و ترہیب کہا کہ حدیث ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تخریج بزار و بیہقی نے کی ہے، جس کی سند لا باس بہ ہے (یعنی قابل قبول) ہے۔ (۲)

شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ نے اس کی تعلیق میں اس کو صحیح قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے؛ مگر میں نے اس حدیث کو اس لئے صحیح قرار دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس کی روایت کی گئی ہے جن کی تعداد میرے نزدیک آٹھ تک پہنچتی ہے۔ (۳)

تیسری حدیث

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

« يَطْلُعُ اللَّهُ إِلَى خَلْقِهِ لَيْلَةَ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِعِبَادِهِ إِلَّا الْإِثْنَيْنِ مُشَاحِنِ وَقَاتِلِ النَّفْسِ. »

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی رات میں اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دو آدمیوں کے سوا سب بندوں کی مغفرت فرما دیتے ہیں ایک کینہ پرور، دوسرے خودکشی

(۱) مسند بزار: ۲۰۷/۱

(۲) تحفۃ الاحوذی: ۳۶۵/۳

(۳) السنہ لا ابن عاصم: ۲۲۳/۱

کرنے والے کی۔ (۱)

اس حدیث کے بارے میں مسند احمد کے محقق علامہ احمد محمد شاہ رحمہ اللہ اس کی تعلیق میں فرماتے ہیں ”اسنادہ صحیح“ یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے اور علامہ نور الدین یثمتی رحمہ اللہ نے اس کو مجمع الزوائد میں نقل کر کے فرمایا کہ اس کو احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابن لہیعہ رحمہ اللہ راوی ہیں اور یہ ”دلیل الحدیث“ (کمزور) ہیں اور باقی راوی سب ثقہ ہیں۔ (۲)

علامہ یثمتی رحمہ اللہ نے ابن لہیعہ رحمہ اللہ کے سوا سب راویوں کی توثیق کی ہے، رہا ابن لہیعہ رحمہ اللہ کا معاملہ تو بات یہ ہے کہ ان کے متعلق محدثین کی راویوں میں اختلاف ہے، بعض محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور بعض محدثین نے ان کی توثیق فرمائی ہے؛ اس لیے ان کو مطلقاً ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کی توثیق و تعریف کی ہے اور فرمایا کہ حدیث کی کثرت و ضبط و اتقان میں مصر میں ابن لہیعہ رحمہ اللہ جیسا کون تھا؟ یعنی کوئی وہاں ان کے مرتبہ کا نہیں اور سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابن لہیعہ رحمہ اللہ کے پاس اصول ہیں اور ہمارے پاس فروع نیز کہا کہ میں نے کئی حجج صرف اس لیے کیے کہ ابن لہیعہ رحمہ اللہ سے ملاقات کروں، اسی طرح احمد بن صالح رحمہ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (۳)

ایسے راوی کو مطلقاً ضعیف قرار دینا صحیح نہیں؛ اسی لیے بہت سے محدثین ان کی حدیث کو صحیح یا کم از کم حسن قرار دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ مذکورہ حدیث کی سند یا تو صحیح

(۱) مسند احمد: ۱۰/۱۲۷۔ حدیث: ۲۶۳۲

(۲) مجمع الزوائد: ۶۵/۸

(۳) تہذیب التہذیب: ۵/۳۷۵

ہے، جیسا کہ احمد محمد شاہ رحمۃ اللہ نے فرمایا، یا کم از کم حسن تو ضرور ہے۔

چوتھی حدیث

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَطْلُعُ اللَّهُ عَلَى خَلْقِهِ لَيْلَةَ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ
فَيَغْفِرُ لَهُمْ كُلَّهُمْ إِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ. »

(اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی رات میں اپنی مخلوق پر توجہ فرماتے ہیں پس سب کی مغفرت فرمادیتے ہیں سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔) (۱)

علامہ یثمتی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو بزار نے روایت کیا اور اس کی سند میں عبد الرحمن بن زیاد بن انعم راوی رحمۃ اللہ ہیں، احمد بن صالح رحمۃ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے اور جمہور نے تضعیف کی ہے، دوسرے اس سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہیں، باقی سب راوی ثقہ ہیں۔

ابن لہیعہ رحمۃ اللہ کے بارے میں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان کی تضعیف بعض نے کی ہے، نہ کہ سب نے اور عبد الرحمن بن زیاد بن انعم بھی ابن لہیعہ کے درجہ کے راوی ہیں اور نہ صرف احمد بن صالح رحمۃ اللہ نے؛ بل کہ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن المبارک اور سفیان ثوری رحمہما اللہ جیسے حضرات نے ان سے روایت کی ہے اور یحییٰ بن سعید، امام بخاری رحمہما اللہ جیسے حضرات نے ان کی توثیق کی ہے اور احمد بن صالح رحمۃ اللہ نے ان

پرتنقید کی ہے اور ان کے قول کو غیر مقبول قرار دیا ہے، جنہوں نے عبدالرحمن بن زیاد پر جرح کی ہے۔^(۱)

لہذا ان کی روایت بھی کم از کم حسن ہوگی اور پھر پہلی روایت سے تائید پا کر ضرور قابل قبول ٹھہرے گی۔

پانچویں حدیث

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا لَيْلَةَ
النَّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِأَهْلِ الْأَرْضِ إِلَّا الْمُشْرِكِ أَوْ
مُشَاحِنٍ. » (٢)

(ہمارا رب شعبان کی درمیانی شب میں آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے، سوائے مشرک اور کینہ پرور کے تمام اہل زمین کی مغفرت فرما دیتا ہے۔)

اس حدیث کو بھی شیخ البانی رحمۃ اللہ نے السنۃ کی تخریج میں سنداً ضعیف ہونے کے باوجود شواہدات کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے۔

چھٹی حدیث

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا كَانَ لَيْلَةُ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ يَطَّلِعُ اللَّهُ إِلَى خَلْقِهِ

« إِذَا كَانَ لَيْلَةُ النُّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ يَطْلُعُ اللَّهُ إِلَى خَلْقِهِ

(١) تهذيب التهذيب: ١٤٢/٦

(٢) السنه لابن ابي عاصم: ٢٢٢/١، اعتقاد اهل السنه، لالكائي: ٢٢٢/٣

فَيَغْفِرُ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَتْرُكُ أَهْلَ الضُّعَافِ وَأَهْلَ الْحِقْدِ
بِحَقِّهِمْ. (۱)

(جب شعبان کی درمیانی شب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر
توجہ فرماتے ہیں اور مومنین کی مغفرت فرما دیتے ہیں اور بغض رکھنے
والوں کو ان کے بغض کی وجہ سے (مغفرت کئے بغیر) چھوڑ دیتے
ہیں۔)

السنة کی تخریج میں شیخ البانی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور احوص
بن حکیم رحمۃ اللہ کے علاوہ اس کے تمام راوی ثقہ و معتبر ہیں، احوص حافظہ میں کمزور
ہیں، جیسا کہ تقریب میں لکھا ہے؛ مگر ان کے جیسے راوی سے استشہاد کیا جاسکتا ہے،
پس جو روایت اس کے بعد ہے اور جو شواہد اس سے پہلے گزرے ہیں، ان سے
یہ قوی ہو جاتی ہیں۔

خلاصہ کلام

ان تمام تفصیلات و تحقیقات سے روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ شبِ برأت کی
فضیلت میں صحیح حدیث وارد ہوئی ہے؛ کیوں کہ سند میں کلام ہونے کے باوجود متعدد
سندوں کی وجہ سے یہ درجہ صحت کو پہنچ چکی ہے اور بعض حدیثوں پر تو علما نے صاف
طور پر صحیح ہونے کا حکم بھی لگایا ہے، جیسا کہ اوپر حوالہ گزر چکا، خصوصاً علامہ
ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ کا کہ وہ حدیث کے معاملہ میں بڑے سخت واقع ہوئے
ہیں، پھر بھی انہوں نے حضرت معاذ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو صاف طور پر صحیح قرار دیا ہے۔
اس کے بعد کسی اہل حق اور منصف کو مجال انکار نہیں، اور جو لوگ حدیث پر عمل

کے مدعی ہیں، ان کو تو اس میں اور زیادہ حق پرستی اور حدیث سے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو قبول کرنا چاہئے۔

علامہ مبارک پوری کا ارشاد

ہم یہاں مشہور اہل حدیث عالم علامہ عبدالرحمان مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت کے بڑے محدث بھی مانے جاتے ہیں، اور اہل حدیث کے نزدیک ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کا اس سلسلہ میں ارشاد نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی میں پہلے تو فرمایا:

”اعلم انه قد ورد فی فضيلة ليلة النصف من شعبان

عدة احادیث مجموعها تدل علی أن لها اصلاً“.

(جان لو کہ شبِ برأت کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں، ان

سب کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی اصل ہے۔)

پھر چند احادیث نقل کر کے اخیر میں فرمایا:

”فهذه الاحادیث بمجموعها حجة علی من زعم أنه

لم یثبت فی فضيلة ليلة النصف من شعبان شیء“ (۱)

(یہ احادیث اپنے مجموعہ کے اعتبار سے ان لوگوں کے خلاف حجت

ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ شعبان کی درمیانی شب کی فضیلت میں کوئی

بات ثابت نہیں۔)

غور فرمایا جائے کہ علامہ مبارک پوری کس قدر وضاحت سے فرماتے ہیں کہ

جو لوگ یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شبِ برأت کی فضیلت ثابت نہیں، ان پر یہ احادیث

حجت ہیں، اگر پھر بھی ان کو کوئی نہ مانے تو کیا علاج؟

علامہ عبید اللہ مبارک پوری کی وضاحت

نیز علامہ عبید اللہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کہ وہ بھی اہل حدیث علماء میں سے ہیں اور انہوں نے مشکوٰۃ کی شرح بھی لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

” لکنہ ورد فی فضیلة لیلة النصف من شعبان احادیث

اخری وهی بمجموعها حجة علی من زعم أنه لم یثبت

فی فضیلتها شیء. “ (۱)

(لیکن شعبان کی درمیانی شب (شبِ برأت) کی فضیلت میں

دیگر احادیث وارد ہوئی ہیں اور یہ احادیث اپنے مجموعہ کے اعتبار سے

ان کے خلاف حجت ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ اس کی فضیلت میں کچھ

ثابت نہیں۔)

نیز آگے چل کر اس سلسلہ کی بہت سی احادیث کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض

احادیث سند حسن سے ثابت ہیں۔ نیز حدیث معاذ (جو ہم نے اوپر نقل کی ہے) کے

بارے میں علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ وہ حسن ہے، صحیح نہیں، اس کے بعد

فرماتے ہیں:

” وهذه الاحادیث کلها تدل علی عظم خطر لیلة

نصف شعبان و جلالۃ شانها وقد رها و انها لیست کالیا

لی الاخر فلا ینبغی أن یغفل عنها بل یتحب احیاءها با

لعبادة والدعاء والذکر والفکر. “ (۲)

(۱) مرعاة شرح مشکوٰۃ: ۳/۳۲۵

(۲) مرعاة: ۳/۳۲۱ ۳۲۲

(یہ ساری حدیثیں شعبان کی درمیانی شب کی عظمت اور اس کی شانِ جلالت پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر بھی کہ یہ رات دیگر اور راتوں کی طرح نہیں ہے، لہذا اس سے غفلت برتنا مناسب نہیں، بلکہ عبادت، دعاء، ذکر اور فکر کے ذریعہ اسمیں جاگنا مستحب ہے۔)

خاتمة الکلام

ان حوالجات اور تفصیلات سے بہ خوبی واضح ہو گیا کہ ”شبِ برأت“ کی فضیلت ثابت ہے اور خود اہل حدیث علما اس کے قائل ہیں۔ اور رات میں جاگنے اور عبادت کرنے کو مستحب قرار دیتے ہیں؛ مگر افسوس کہ آج اہل حدیث لوگوں کا عام نقطہ نظر یہ ہو گیا ہے کہ شبِ برأت کوئی چیز نہیں۔ حالاں کہ اہل حدیث علما نے اس نقطہ نظر پر تنقید کی ہے، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ سچی فہم اور اچھی نظر عطا فرمائے اور ہر ایک کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

منکرات شبِ برأت

شبِ برأت کی عظمت اور فضیلت احادیث کی روشنی میں ایک ثابت شدہ امر ہے اور ہر زمانے میں علمائے کرام اور بزرگانِ دین نے اس رات کے ساتھ عظمت و حرمت ہی کا معاملہ فرمایا ہے۔

مگر اس عظمت اور فضیلت والی رات کو من گھڑت رسومات و بدعات اور خلاف عقل و شرع خرافات سے لوگوں نے ضائع کرنا شروع کر دیا ہے، فضیلت والے مہینے ہوں یا دن، ان کا ورود و ظہور خدا کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کی قدر کرتے ہوئے ان ایام و شہور کو اللہ کی رضا جوئی میں صرف کرنا دین و عقل دونوں کا اقتضا ہے؛ مگر افسوس کہ اس شب میں عجیب طرح کے خرافات اور من گھڑت رسومات کو رائج کیا گیا ہے، اور دین کی اصل شکل و صورت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ شبِ برأت کے اس منکرات کو بیان کر کے انکار دیا جائے تاکہ ہم سب شیطانی چالبازیوں سے بچے رہیں۔ واللہ الموفق

آتش بازی کی رسم

شبِ برأت کے موقع پر آتش بازی اور پٹانے چھوڑنے کی رسم اکثر علاقہ میں رائج ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ شبِ برأت جیسی عظیم رات کے ساتھ اس فتنہ کی رسم کو کس نے اور کب جوڑا؟ لیکن جس نے بھی یہ کیا انتہائی درجہ کی معصیت کا مرتکب ہوا؛ کیوں کہ آتش بازی ایک تو سراسر غیر اسلامی اور مشرکین کی رسم ہے۔ چنانچہ غیر مسلموں

میں شادی کے موقع پر، عید و تہوار کے موقع پر اور دیگر اور خاص مواقع پر اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں غیر قوموں کی مشابہت اختیار کرنے پر سخت پابندی عائد کی گئی ہے۔

حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

« من تشبه بقوم فهو منهم. » (۱)

(جو شخص کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے شمار ہوگا۔)

اب اندازہ کیجئے کہ جو لوگ شبِ برأت میں اس غیر اسلامی بے ہودہ رسم کو اختیار کرتے ہیں، وہ اس حدیث پاک کے مطابق کن لوگوں میں شمار ہونگے، دوسرے اس میں مال و دولت کی تصبیح ہے کہ اللہ کی نعمت یوں حرام میں اڑایا جائے حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے مال کو ضائع کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان چیزوں کو منع فرمایا ہے۔ (۱) ماؤں کی نافرمانی کرنا۔ (۲) لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا۔ (۳) دوسروں کے حقوق ادا نہ کرنا۔ (۴) کسی کا مال ناحق طور پر لینا۔

اور ان چیزوں کو مکروہ قرار دیا ہے، یعنی ناپسند ٹھرایا ہے۔ (۱) فضول و لالچ یعنی بات چیت۔ (۲) خواہ مخواہ کہ سوالات کی کثرت۔ (۳) مال کو ضائع کرنا۔ (۴) اس طویل حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مال و دولت کو برباد کرنا، ضائع کرنا، اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ نیز قرآن شریف میں ہے:

(۱) ابو داؤد: ۹۵۵/۲، مسند احمد: ۹۲/۲، مسند بزار: ۳۶۸/۷

(۲) بخاری: ۳۲۲/۱، الادب المفرد: ۱۵، موطا مالک: ۳۸۸، مسلم: ۷۵/۲

﴿وَلَا تُبْذَرُ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ

الشَّيْطَانِ﴾ (بنی اسرائیل: ۲۷)

(فضول خرچی نہ کرو، کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔)
دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَكُلُّوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

(الاعراف: ۳۱)

(کھاؤ، پیو، مگر اسراف نہ کرو؛ کیوں کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو

پسند نہیں کرتا۔)

سوچئے! کہ پٹانے چھوڑنے کی رسم، اضاعت مال، تبذیر و اسراف اور فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک تو یہ فرمایا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، یعنی وہ بھی شیطان ہیں جیسے شیطان کا بھائی شیطان ہی ہو گا نہ کہ کچھ اور۔ دوسرے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا کسی کو ناپسند کرنا، اس کا انتہائی درجہ کا عذاب ہے۔ اس سے بڑا کیا عذاب اور کیا مصیبت کہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے ناپسندیدہ ٹھہریں۔

غرض اسلام میں آتش بازی کی رسم کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس میں غیروں سے مشابہت، اضاعت مال و دولت اور اسراف و تبذیر کہ گناہ شامل ہیں۔

پھر دنیوی اعتبار سے دیکھئے تو یہ سخت خطرہ کی چیز ہے، چنانچہ ہندوؤں کے تہوار دیوالی کے موقعہ پر ان پٹاخوں سے ہمیشہ نقصانات ہوتے ہیں، جانی نقصانات بھی، مالی نقصانات بھی، اسی طرح شبِ برأت کے موقعہ پر بھی نقصانات ہوتے ہیں، تو اس اعتبار سے بھی یہ رسم قابل ترک ہے۔ غرض یہ فتنہ رسم غیروں کی رسم ہے۔

لہذا ہر مسلمان کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

گھروں کی لیپ پوت

شبِ برأت کے موقع پر بہت سے لوگوں میں ایک رواج یہ ہے کہ گھروں کی مرمت لپائی پتائی کا کام کرواتے ہیں، گھروں کی مرمت اور پینٹنگ ایک دنیوی ضرورت کا کام ہے، جب ضرورت محسوس ہو تو کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ شعبان کا مہینہ ہو یا رجب کا یا کوئی اور، اسی طرح کوئی دن بھی اس کے لیے مقرر نہیں، مگر شبِ برأت یا شعبان کی تخصیص کے ساتھ اس عمل کا اہتمام دین میں اضافہ اور بدعت ہے، اس لیے کہ بدعت نام ہے اس عمل کا جو شریعت کے اصول سے ثابت نہ ہو اور اسکو دین سمجھ کر کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ گھروں کی لپائی پتائی اور مرمت کا کام شبِ برأت میں بالتخصیص کرنے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، اب اس کو ایک دنیوی کام سمجھ کر کوئی کرے اور شبِ برأت کا کوئی مخصوص عمل نہ سمجھے تو درست ہے؛ لیکن اس کو شبِ برأت یا شعبان کا عمل سمجھنا اور دین کا کام خیال کرنا بدعت نہیں تو اور کیا ہے؟ لہذا اس کو بھی ترک کرنا چاہیے۔

شبِ برأت کا حلوا

شبِ برأت کی بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں حلوا پکانے اور کھانے کھلانے کو ضروری یا فضیلت کا کام سمجھا جاتا ہے، یہ بھی سراسر بدعت اور دین میں اضافہ ہے۔

کیوں کہ شبِ برأت میں حلوا کھانے کھلانے کا کوئی ثبوت شریعت کے اصولوں سے نہیں ہوتا اور لوگ اس کو ایک دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں؛ لہذا یہ بدعت ہے۔ بعض لوگ اس رسم و بدعت کو ثابت کرنے کے لیے من گھڑت باتوں سے

استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا دندان مبارک جب شہید ہوا تھا تو آپ ﷺ نے حلوانوش فرمایا تھا، اس لیے ہم بھی حلوا پکا کر کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ان دنوں میں واقع ہوئی ہے۔ یہ حلوا ان کی فاتحہ ہے۔

مگر یہ دونوں باتیں بے اصل اور موضوع ہیں، جہاں تک پہلے واقعہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک کی شہادت کے واقعہ کا تعلق ہے، یہ شعبان میں پیش ہی نہیں آیا؛ بل کہ یہ واقعہ ماہ شوال کا ہے، کیوں کہ آپ کے دندان مبارک غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے اور واقعہ غزوہ احد ۳ ہجری ماہ شوال میں پیش آیا تھا، جیسا کہ کتب تاریخ و سیر میں مذکور ہے۔^(۱)

غرض کتب تاریخ و سیر میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ دندان مبارک کی شہادت کا واقعہ جنگ احد میں پیش آیا تھا اور احد کی جنگ شوال کے مہینہ میں ہوئی تھی تو شبِ برأت سے اس واقعہ کو جوڑنا سراسر جہالت ہے، پھر اس موقع پر حلوا پکا کر کھانے کا ذکر کسی روایت میں نہیں ملتا اور اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنگ احد کے موقع پر دندان مبارک کے ٹوٹ جانے کی بنا پر آپ نے حلوا پکا کر کھایا تو اس سے آخر شبِ برأت کو کیا نسبت و تعلق ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ شہادت دندان کا واقعہ شبِ برأت میں ہوا تھا، تب بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ آپ نے دندان کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے حلوا کھایا، مگر اس کو شبِ برأت سے کیا تعلق ہے، کیا آپ کا حلوا کھانا شبِ برأت کی وجہ سے تھا یہ تو خود اس موضوع و من گھڑت روایت میں بھی نہیں ہے۔

(۱) دیکھو: فتح الباری: ۳۴۷/۷، سیرت ابن ہشام: ۶۰/۲، سیرت النبی شبلی: ۲۱۲/۱، سیرت المصطفیٰ: ۶۲۸/۱، رحمة اللعالمین: ۱۸۹/۲

پھر ذرا سوچئے کہ اتباعِ سنت کا ایسا ہی شوق ہے تو چاہیے تھا کہ اولیس قرنی کی طرح پہلے اپنے دانت بھی توڑ لیے ہوتے پھر حلوا کھاتے۔ یہ اتباعِ سنت اور عشقِ نبوی کی عجیب قسم ہے کہ حلوا کھانے کو تو تیار، مگر دانت نہیں توڑتے، تعجب ہے: پہلے جہاد فرمائیے اور دنیا میں دین کے قیام کی پوری کوشش کیجئے، پھر ضرورت پڑے تو حلوا تناول فرمائیے، مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ شریعت کو دن رات پامال کرتے ہیں، نمازوں کو برباد کرتے ہیں، سنتوں کا خون کرتے ہیں، ایسے لوگ بھلا کیا اتباع کریں گے، یہ سنت کا اتباع نہیں، بلکہ نفس کی پیروی ہے۔

ربا یہ کہنا کہ حضرت امیر حمزہ ؓ کی شہادت اس دن ہوئی تھی، اس کے لیے صوے پر فاتحہ پڑھتے ہیں، اس میں بھی دو طرح کلام ہے۔

اولاً یہ کہ حضرت امیر حمزہ ؓ کی شہادت بھی غزوہ احد میں ہوئی تھی جو کہ شوال میں ہوا تھا، لہذا یہ کہنا صریح جہالت ہے کہ شعبان یا شبِ برأت میں ان کی شہادت ہوئی، دوسرے یہ کہ اگر اس دن شہادت ہوئی بھی ہو تو یہ فاتحہ اور حلوا، اس میں کہاں سے ثابت ہوا؟ یہ تو محض ایجادِ بندہ ہے، ایصالِ صواب کا یہ طریقہ شریعت سے قطعاً ثابت نہیں، بلکہ شریعت میں احداث و اضافہ ہے، جیسا کہ احقر نے اپنی کتاب سفر آخرت کے اسلامی احکام میں لکھا ہے، اس کو ملاحظہ کیا جائے، لہذا یہ شبِ برأت کا حلوا سوائے تصنیف یا ران و ایجادِ بندہ کے کچھ نہیں، اس لیے یہ ترک کرنے کے قابل ہے۔

روحوں کے آنے کا اعتقاد

بعض لوگوں میں شبِ برأت کے متعلق یہ اعتقاد رائج ہے کہ اس رات مردوں کی روہیں اپنے اپنے لوگوں سے ملنے گھروں کو آتی ہیں، یہ اعتقاد بھی بے اصل ہے، کسی حدیث یا آیت یا اور کسی شرعی دلیل سے شبِ برأت میں روحوں کے آنے کا

ثبوت نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ بلا شرعی دلیل کے یہ بات کس طرح مان لی جائے کہ شبِ برأت کے موقعہ پر رو حیں آتی ہیں؟

پھر اس بے اصل بات کو لیکر بعض لوگ اپنے گھروں میں عجیب طرح کی خرافات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ روحوں کے لیے دسترخوان بچھا کر ان کے لیے کھانے چنے جاتے ہیں اور اس میں اپنے مردوں کی پسندیدہ اشیاء جوڑتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کسی کو سگریٹ، بیڑی کا شوق تھا تو دسترخوان پر اس کو بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں خلاف شریعت ہونے کے ساتھ خلاف عقل بھی ہیں، خلاف شرع تو اس لیے کہ شرعی دلائل سے ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ شبِ برأت اللہ کے نبی ﷺ کے زمانے میں بھی آتی رہی اور حضرات صحابہ اور تابعین کے دور میں بھی آتی رہی؛ مگر نہ روحوں کی آمد کا عقیدہ کسی نے پیش کیا، نہ ان کے لیے دسترخوان چنا گیا۔

اگر یہ بات ہوتی تو ان حضرات سے ضرور اس سلسلہ میں کوئی بات ثابت ہوتی، بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر شبِ برأت میں روحوں کے آنے کی بات صحیح ہوتی تو اللہ کے نبی ﷺ اس رات قبرستان کیوں تشریف لے جاتے؟ (جیسا کہ ایک ضعیف روایت میں اس کا ذکر آتا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو روایت کیا ہے اور احقر نے اپنے مضمون ماہ شعبان، فضائل و اعمال میں اس روایت پر کلام کیا ہے۔)

اللہ کے نبی ﷺ اس روایت کے مطابق سوتے سوتے بستر سے اٹھ کر قبرستان تشریف لے گئے اور مردوں کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ سوال یہ ہے کہ مردے اگر آتے تو آپ وہاں کیوں جاتے؟ پھر اللہ کے نبی ﷺ

نے اس رات نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بیدار کیا اور نہ کسی صحابی کو جگایا، یا بتایا کہ اٹھو آج رو حیں آتی ہیں، ان کے لیے دسترخوان جوڑو، سوچئے کہ جو بات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و اسلاف نے بیان نہیں کی اس کو عقیدہ بنانا اور خرافاتی کام کرنا، کہاں تک درست؟ پھر یہ کام عقل کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ جو لوگ مر گئے وہ اگر دوزخی ہیں تو وہ اس رات کس طرح چھٹکارہ پا کر گھروں کو آ سکتے ہیں؟ اور اگر وہ لوگ جنتی ہیں تو کیا جنت کی نعمتیں و لذتیں چھوڑ کر دنیا کی یہ حقیر چیزیں کھانے آئیں گے؟ پھر سوچئے کہ کیا وہ جنت سے سیکریٹ اور بیڑی کا مزہ لینے یہاں آئیں گے۔ کس قدر عقل کے خلاف ہے یہ عقیدہ و عمل۔ افسوس کہ دنیا کے معاملات میں لوگ بڑے عقل مند ہو جاتے ہیں؛ مگر دین کے معاملے میں بے عقل بن جاتے ہیں۔ غرض یہ عقیدہ اور اس پر متفرع اعمال و افعال بھی غیر اسلامی ذہن کی پیداوار ہیں۔ لہذا یہ بھی قابل ترک ہے۔

اس سلسلہ کا ایک اور بے ہودہ خیال لوگوں میں رائج ہے۔ وہ یہ کہ شبِ برأت سے پہلے جو کوئی مر جائے وہ اس وقت تک مردوں میں شامل نہیں ہوتا جب تک کہ شبِ برأت میں اسکے لیے فاتحہ نہ کی جائے۔ یہ بھی محض فضول خیال اور بے اصل عقیدہ ہے، پھر مردوں میں شامل نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ زندوں میں شامل رہتا ہے؟ غرض یہ بھی غلط و فاسد عقیدہ ہے۔

مساجد کو سجانا اور سنوارنا

بعض علاقوں میں رواج ہے کہ شبِ برأت میں مساجد کو سجاتے ہیں اور سنوارتے ہیں، کہیں ققموں سے، کہیں چمکدار کاغذوں سے اور دوسری چیزوں سے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مساجد میں اس موقع پر یا کسی ایسے موقع پر بلا وجہ اور بے ضرورت

روشنی کرنا، بدعت ہے۔ یہاں ہم علامہ شاطبی رحمۃ اللہ کے چند جملے نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب ”الاعتصام“ میں لکھا ہے:

”مساجد میں آگ روشن کرنا (چراغ جلانا) سلف صالحین کی شان

نہیں تھی، اور نہ اس کے ذریعہ مساجد کو مزین کیا جاتا ہے۔ پھر بعد میں

چراغ جلا کر مزین کرنے کی بدعت جاری ہوئی۔“ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مساجد میں زائد از ضرورت چراغ جلانے کی رسم سلف صالحین کے بعد بدعتیوں کی ایجاد ہے اور اس زمانے میں جو حکم چراغ کا تھا وہی حکم اس زمانے میں قہقروں کا ہوگا۔ لہذا یہ بھی بدعت ہوگا۔ بلکہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ چراغاں کرنے کی رسم برا مکہ نے جو آگ کے پجاری تھے، جاری کی تھی، جب اسلام میں داخل ہوئے تو اسلام میں ایسی چیزیں داخل کیں جو دین کی سنت ہونے کا وہم پیدا کرتی تھیں اور ان کا مقصد آگ کی عبادت ہوتا تھا کہ جب رکوع سجدہ کریں گے تو اس آگ کی طرف جھکیں۔ (۲)

پھر اس میں مال کی اضاعت و اسراف کا گناہ بھی شامل ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں ہندوؤں اور عیسائیوں سے مشابہت ہے کہ یہ لوگ اپنے تہواروں میں اپنے مندروں اور چرچوں کو اسی طرح سجاتے اور سنوارتے ہیں۔

لہذا اس سے بھی بچنا چاہئے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں تفصیلی گفتگو کی ہے اور آخر میں یہ تحریر کیا ہے:

”خلاصہ یہ کہ شبِ برأت اور شبِ قدر وغیرہ میں مساجد کو زیادہ

(۱) الاعتصام: ۲/۲۷۳

(۲) مرقات: ۳/۱۹۸

مزین کرنا اور زیادہ روشنی کرنا اور چراغاں کی صورت اختیار کرنا دوسری بدعت ہے۔“ (۱)

مساجد میں اجتماع

شبِ برأت میں عبادت کرنا بعض ضعیف روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ وغیرہ میں ہے:

”اس رات میں عبادت کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو“۔ (۲)

مگر عبادت کے لیے مسجد میں جمع ہونا خیر القرون کی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ وہاں تو نقلی عبادات چھپ کر اپنے گھروں میں کی جاتی تھیں، اسی وجہ سے علماء کرام و فقہاء عظام نے شبِ برأت، لیلۃ القدر، رمضان کے عشرہ اخیرہ کی راتوں، عرفہ اور عیدین کی راتوں میں عبادت کے لئے مساجد میں اجتماع کو مکروہ لکھا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ ”البحر الرائق“ میں فرماتے ہیں:

”ان راتوں میں سے کسی رات میں جاگنے کے لئے مساجد میں جمع

ہونا مکروہ ہے۔“ (۳)

علامہ حسن بن عمارہ الشرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ مشہور فقیہ گزرے ہیں، انہوں نے نور الايضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں لکھا ہے:

”لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لیے

مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

(۱) امداد المفتیین: ۲۱۱

(۲) ابن ماجہ: ۹۹/۱

(۳) البحر الرائق: ۵۲/۲

آپ کے اصحاب نے ایسا نہیں کیا۔ لہذا اکثر علماء نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔“ (۱)

ان عبارت سے واضح ہوا کہ ان راتوں میں شب بیداری اور عبادت کے لیے مساجد میں جمع ہونا منکر اور برا ہے۔ ہاں بلا کسی اہتمام کے کوئی مسجد میں آگیا اور عبادت میں مشغول ہو گیا تو ٹھیک ہے؛ مگر اس کا اہتمام نہ کیا جائے۔ جیسا کہ آج کل عام رواج ہو گیا ہے۔

شبِ برأت کی مخصوص نماز کی بدعت

شبِ برأت میں عبادت کرنا مستحب ہے، جیسا کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے اور بزرگانِ سلف سے بھی اس کے اہتمام کی روایت ملتی ہے؛ مگر اس رات میں کوئی مخصوص عبادت صحیح احادیث سے ثابت نہیں، جیسے بعض لوگوں نے ”اشغالِ شبِ برأت“ کے نام سے ایک کتابچہ میں بعض مخصوص نمازوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً سو رکعات پڑھی جائیں، ہر رکعت میں سو بار ”قل هو اللہ احد“ پڑھی جائے وغیرہ۔ یہ بات ثابت نہیں اور جو بعض محدثین نے اس قسم کی روایات اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں، ان کو خود فنِ حدیث کے ائمہ نے موضوع و باطل قرار دیا ہے۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ نے شبِ برأت کی نماز میں آئی احادیث کو موضوع کہا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے یہ سورکعت والی حدیث کے بارے میں صراحت کی ہے کہ یہ موضوع ہے۔ (۲)

(۱) نور الایضاح: ۹۵، مراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی: ۲۱۹

(۲) موضوعات: ۱۲۷/۲-۱۳۰، تحفة الاحوذی: ۳-۳۶۵، مرقات: ۱۹۷/۳، معارف

السنن: ۴۱۹/۵

اسی سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ اس رات نفل نماز میں بعض جگہ جماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے یہ بھی ایک بدعت ہے۔ نفل نماز میں جماعت کا اہتمام ثابت نہیں ہے۔

اس مسئلے پر احقر کا ایک مستقل رسالہ شائع ہو چکا ہے ”جماعت تہجد کا شرعی حکم“
اس کو دیکھا جائے۔ اسی طرح احقر کا دوسرا رسالہ ”منکرات رمضان“ میں بھی اس پر
تفصیلی بحث ہے۔

زیارت قبور میں غلو

شبِ برأت میں ایک موقعہ پر اللہ کے نبی ﷺ کا قبرستان تشریف لے جانا ایک ضعیف روایت سے ثابت ہے، جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ نے اپنی سنن میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ذکر کیا ہے۔^(۱) اس روایت میں علماء حدیث نے کلام کیا ہے (جیسا کہ میں نے گذشتہ مضمون ”شعبان کے فضائل و اعمال“ میں تفصیل سے لکھا ہے۔)

یہ واقعہ تو ضعیف حدیث سے معلوم ہوا ہے ، دوسرے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ تسامح برتتے ہوئے ضعیف حدیث کے باوجود اس کو کسی درجہ میں قابل اعتناء و لائق اعتبار اس لیے مان

(۱) ترمذی: ۱/۱۵۶، ابن ماجه: ۱/۹۹

لیں کہ فضائل کے باب سے متعلق ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ کبھی کبھی بلا کسی خاص اہتمام کے شبِ برأت میں قبرستان جا کر مردوں کے حق میں دعاء مغفرت کی جاسکتی ہے۔ اور علماء نے اگر شبِ برأت کے اعمال میں قبرستان جانے کا ذکر کیا ہے تو وہ بس اسی حیثیت سے کیا ہے۔ تیسرے یہ قبرستان جانا شبِ برأت کی وجہ سے نہ تھا، بل کہ مسلم کی حدیث کے مطابق آپ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری میں ہمیشہ یہ معمول رہا کہ آپ جنت البقیع تشریف لے جاتے تھے۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی میری رات کی باری ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رات میں بقیع قبرستان میں تشریف لے جاتے اور ان پر سلام کرتے اور ان کے لیے دعاء فرماتے۔ (۱)

غرض اس عمل کا شبِ برأت سے کوئی تعلق نہیں؛ مگر اب اس میں سال بسال غلو ہو تا جا رہا ہے، قبرستان کیا ہے؟ ایک میلہ بنا ہوا ہے، اس رات وہاں جانے کے لیے مستقل سواریاں چلتی ہیں، ایک دوسرے کو ترغیب دی جاتی ہے، لوگ پورے اہتمام سے وہاں جاتے ہیں، پھر قبرستان کے پاس دیکھئے تو ہر طرح کے پھولوں کے دکانیں نظر آتی ہیں، لوگ وہاں سے پھول خرید خرید کر قبروں پر ڈالتے ہیں، گویا ایک مستقل میلہ ہے، اس کو شریعت میں اضافہ اور دین میں احداث نہ قرار دیا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ حدیث میں اس بات سے سختی سے منع کیا گیا ہے کہ قبروں کے پاس جمع ہو کر میلہ کی شکل اختیار کی جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا. »

(میری قبر کو عید مت بنالینا۔) (۲)

(۱) مسلم: ۳۱۳/۱

(۲) ابو داؤد: ۲۷۹/۱

اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے عید کے موقعہ پر اہتمام سے سب جمع ہوتے ہیں، اس طرح میری قبر کے پاس اہتمام سے جمع نہ ہونا، جب آپ نے اپنی قبر کے پاس جمع ہونے سے منع فرمادیا تو کسی اور کی قبر پر جمع ہونے کا تو کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا۔ غرض یہ کہ جو آج زیارت قبور میں غلو ہو رہا ہے یہ بھی قابل اصلاح ہے۔ ہر کام اس کے حد کے اندر ہونا چاہئے۔ اس سے آگے جانا سخت خطرہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو صحیح فہم سے نوازے اور بدعات و منکرات سے بچنے اور دین اور شریعت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد شعیب اللہ خان



دیوبندیت و بریلویت
دلائل کے آئینے میں

دیوبندیت اور بریلویت کے اہم اختلافی عقائد پر قرآن
وحدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اس میں نہ مناظرانہ طریقہ
اختیار کیا گیا ہے اور نہ فلسفیانہ نکتہ آفرینوں اور علم کلام کے پیچیدہ علمی
موشگافیوں کو جگہ دی گئی ہے؛ بل کہ سادہ و صاف قرآنی و حدیثی
دلائل کو تفہیمانہ انداز میں پیش کر کے حق کو واضح کیا گیا ہے۔

از

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

مہتمم مدرسہ مسیح العلوم، آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

افتتاحیہ

زیر نظر رسالہ ”دیوبندیّت و بریلویّت“ کے ان اختلافی مسائل پر لکھا گیا ہے جن کا تعلق باب عقائد سے ہے اور آسان زبان کے استعمال کے ساتھ، تفہیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیوبندی و بریلوی مکاتب فکر میں اگرچہ ایک طویل زمانہ سے اختلاف چلا آ رہا ہے اور ان کے اختلافی مسائل پر طرفین سے ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی، مناظرانہ طرز کی بھی ہیں اور تفہیمانہ انداز کی بھی، تیز و تند لہجے میں بھی ہیں اور سنجیدہ و متین انداز کی بھی، نیز اس سلسلہ میں بے شمار مناظرے بھی ہو چکے ہیں اور ان مناظروں کے تلخ نتائج بھی زمانے نے دیکھے ہیں۔

اس کے بعد اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کی جائے۔ مگر بعض حالات نے راقم الحروف کو اس پر مجبور کیا کہ اس پر لکھا جائے۔ وہ حالات یہ کہ بعض بریلوی علماء نے اپنی سابقہ روایات کو دہراتے ہوئے سال رواں کے ماہ ربیع الاول اور اس کے بعد سیرت و میلاد کے جلسوں میں علماء دیوبند کو کافر کہا اور اس سے عوام میں انتشار و اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ حق کی تلاش میں پریشان نظر آنے لگے جس کی بنا پر دیوبندی مسلک کی وضاحت اور علماء دیوبند کے عقائد کی تشریح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تاکہ حق و باطل کا امتیاز ہو جائے اور پریشان عوام کو دلائل کی روشنی میں ان دونوں مسلکوں میں سے حق کس کے ساتھ ہے معلوم ہو جائے۔

نیز ہم نے دیکھا کہ اصل اختلاف تو کم ہے، مگر بیان کرنے والے اس کو بڑھا چڑھا کر کے حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، اس کی توضیح کی بھی ضرورت تھی، چنانچہ راقم الحروف نے عقائد سے متعلق دیوبندی و بریلوی اختلاف کے اہم اہم مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کر کے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں نہ مناظرانہ طرز اختیار کیا گیا ہے اور نہ تیز و تند لہجہ، نہ علم عقائد و کلام کے دقیق مباحث و عمیق مضامین کو چھیڑا گیا ہے، اور نہ فلسفیانہ انداز کی بے تکی مویشگافیوں سے کام لیا گیا ہے، بلکہ قرآن و حدیث کے واضح و صاف دلائل کو حضرات علماء مفسرین و ائمہ فقہ کے اقوال و ارشادات کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ حق کو مکافقہ سمجھا جاسکے۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ حق کی تلاش و جستجو کی نیت ہی سے اس کا مطالعہ فرمائیں، تنگ نظری و تعصب سے ہرگز کام نہ لیں، کیوں کہ ہمیں اللہ و رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے نہ کسی گروہ و فرقہ و جماعت کی، اگر اس نیت سے دلائل پر غور کریں گے تو ضرور حق واضح ہو جائے گا۔ انشاء اللہ

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو قبولیت سے مشرف فرمائے اور لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت اور میرے لیے توشہ آخرت بنادے۔ آمین یا رب العالمین

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

احاطہ مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی، بنگلور

۹ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۳ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نور اور بشر

دیوبندی اور بریلوی نظریات جن امور میں ٹکراتے ہیں، ان میں سے ایک حضرت نبی کریم ﷺ کے نور و بشر ہونے کا مسئلہ ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے لوگ آپ کو بشر ماننے سے انکار کرتے ہیں اور نور قرار دیتے ہیں جبکہ دیوبندی مکتب فکر آپ ﷺ کو بشر قرار دیتا ہے۔ ان میں سے حق پر کون ہے؟ اس کا فیصلہ قرآن و حدیث، پھر وہ علماء و ائمہ کریں گے، جن کو دونوں مکاتب فکر کے لوگ مانتے ہیں۔

قرآن کیا کہتا ہے؟

پہلے قرآن کریم کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ ہم نے جہاں تک غور کیا، یہی سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم نبی کریم ﷺ کو بشر و انسان قرار دیتا ہے اور آپ کی جنس دراصل آدمیت بتاتا ہے، مگر اسی کے ساتھ آپ کے اونچے اوصاف اور کمالات کی طرف اشارہ کرنے کے آپ کو مختلف القاب سے بھی یاد کرتا ہے اور اسی سلسلہ میں آپ کو نور بھی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ

(الکہف: ۱۱۰)

وَاحِدٌ﴾

(ترجمہ: کہہ سوائے اس کے نہیں کہ میں ایک آدمی ہوں، مانند

تمہاری، وحی کی جاتی ہے طرف میری یہ کہ معبود تمہارا رب ہے۔)

اس مضمون کی ایک آیت حم سجدہ (آیت نمبر: ۶) بھی ہے اور دیگر مقامات پر بھی یہ مضمون دوسرے انداز سے مذکور ہے، اس آیت میں غور کیجئے کہ کس صفائی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بشر یعنی انسان ہیں، اور ”مثلكم“ (تمہاری مانند) کے الفاظ نے اس معنی کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ آپ کی جنس اور اصل وہی ہے جو دیگر انسانوں کی ہے۔ مگر چوں کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور آپ لوگوں کو ظلمت سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتے تھے، اس لیے آپ کو اس خصوصیت کی وجہ سے نور بھی فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾ (المائدة: ۱۵)

(تحقیق کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آئی ہے۔)

اس آیت میں نور سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے، بعض نے قرآن مراد لیا ہے۔ بعض نے اسلام اور بعض مفسرین نے نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکت کو مراد لیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ سے اس کا اوفق ہونا نقل کیا ہے۔^(۱)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے بھی نور سے آپ کی ذات کا مراد ہونا نقل کیا ہے۔^(۲) مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور پر نور ﷺ بشر نہیں تھے؛ بل کہ بشر ہونے کے ساتھ آپ نور بھی تھے؛ کیوں کہ آپ لوگوں کو کفر کی تاریکی سے ایمان کی روشنی کی طرف لاتے تھے۔ چنانچہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی صاحب جو بریلوی مکتب فکر کے مشہور مفسر ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

(۱) روح المعانی: ۹۷/۶

(۲) قرطبی: ۱۱۸/۶

سید عالم ﷺ کو نور فرمایا گیا؛ کیوں کہ آپ سے تاریکی کفر دور ہوئی اور راہِ حق واضح ہوئی۔ (۱)

مذکورہ تفصیل سے قرآن کا نقطہ نظر واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اصل جنس کے لحاظ سے بشر تھے اور راہ حق کو واضح کرنے والے ہونے کے لحاظ سے آپ نور بھی تھے۔

حدیث شریف کا فیصلہ

اس کے بعد حدیث شریف کو دیکھنا چاہئے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک حدیث درج کی ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کو نماز میں بھول ہو گئی، بعد نماز آپ کو صحابہ نے بتایا۔ تو آپ نے اس پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

”وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أُنْسِيَ كَمَا تَنْسُونَ.“ (٢)

(لیکن میں تو ایک انسان ہوں، بھولتا ہوں جیسا کہ تم بھولتے

(-2)

یہ مسلم شریف کی حدیث ہے جس کو دیوبندی بھی جانتے ہیں اور بریلوی بھی مانتے ہیں، نیز یہی حدیث بخاری شریف میں بھی موجود ہے۔ (۳)

نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ درج فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد لوگوں کو دیکھا کہ وہ تابیر کرتے ہیں، یعنی کھجور کے درخت کا پھول، مادہ درخت کے پھول سے ملا کر فصل میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس پر نبی کریم

(۱) خزائن العرفان سورہ مائدہ حاشیہ نمبر: ۵۸

(۲) صحیح مسلم: ۲۱۲/۱

(۳) بخاری: ۵۷/۱

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ان کو منع فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرو تو یہ اچھا ہے۔ لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تو پھل میں کمی آگئی اور صحابہ نے اس کا ذکر حضور ﷺ کی خدمت میں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ أَمْرِ دِينِكُمْ

فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ.» (۱)

(میں تو ایک انسان ہوں، جب میں دین کی کسی بات کا تم کو حکم دوں

تو اس کو تھام لو اور اگر اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں بھی ایک انسان

ہوں۔)

ان دونوں حدیثوں میں جو بخاری و مسلم کی روایت کردہ اور صحیح ہیں۔ صراحت کے ساتھ آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ میں انسان اور بشر ہی ہوں۔ لہذا آپ کو بشر ماننا قرآن و حدیث دونوں کے فیصلہ کے مطابق ضروری ہے۔

حضرات صحابہ کیا فرماتے ہیں

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کو جتنا قریب سے جانتے تھے۔ مخلوق میں سے کون اتنا قریب سے آپ کو جان سکتا ہے۔ پھر وہ حضرات آپ کی عظمت اور عزت جتنی کرتے تھے، کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے بارے میں جو فرمایا وہ بلاشبہ حقیقت ہی کا انکشاف ہوگا اور ساتھ ہی آپ کی تعظیم و تکریم کا بھی پورا لحاظ اس میں کیا گیا ہوگا۔

اب دیکھئے وہ حضرات کیا فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اپنا جوتا سی لیتے، کپڑا اسی لیتے اور گھر میں

وہ کام کر لیتے جو تم میں سے کوئی کر لیتا ہے اور فرمایا کہ آپ انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ الخ (۱)

امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو ”شامل نبوی“ میں بھی روایت کیا ہے۔ غور یہ کرنا ہے کہ نبی ﷺ کے متعلق خود آپ کی زوجہ مطہرہ صاف فرماتی ہیں کہ آپ بشر و انسان تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جو خصوصیت نبی کریم ﷺ سے حاصل تھی، وہ سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے آپ کو جلوت و خوت کے ہر موقع پر دیکھا ہے۔ اور فرماتی ہیں کہ آپ انسان و بشر تھے، لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نظریہ اس سے واضح ہوا کہ وہ بھی آپ کو انسان تسلیم کرتے تھے۔

قرآن، حدیث، اقوال صحابہ سب اس پر متفق ہیں کہ آپ اصل و جنس کے اعتبار سے بشر اور انسان ہیں۔ رہا آپ کا نور ہونا، یہ دوسرے اعتبار سے ہے جیسا کہ اوپر گزر گیا۔

ایک عام فہم مثال

اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے کہ بلب جو روشنی دیتا ہے، وہ اپنے اصل و جنس کے اعتبار سے شیشہ ہے، مگر اپنی صفت کے لحاظ سے نور ہے۔ لہذا بلب کی اصل کا سوال ہو تو یہی کہا جائے گا کہ وہ شیشہ ہے، اس کے باوجود وہ نور بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کہنے لگے کہ بلب تو سر اسر نور ہے، اس کو شیشہ نہ کہو تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ بلب کا نور ہونا سو فی صدی صحیح ہے؛ مگر پھر بھی وہ شیشہ ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان اور بشر تھے اور اس کے باوجود نور بھی تھے۔ جو شخص آپ کو نور مان کر بشر ہونے کا انکار کرتا ہے وہ دراصل غلط فہمی کا شکار ہے۔

بریلوی علما کے ارشادات

بریلوی مکتب فکر کے علما بھی آپ کو بشر مانتے ہیں، چناں چہ مولانا امجد علی رضوی صاحب اپنی معروف کتاب ”بہار شریعت“ میں نبیوں کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہئے۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا نہ عورت۔“ (۱)

دیکھئے کس قدر صفائی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ انبیاء سب بشر تھے۔ ”سب“ کہہ کر تمام انبیاء کو اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لہذا اس میں آقائے مدنی ﷺ بھی داخل ہو گئے۔

نیز مولانا نعیم الدین صاحب مرآۃ آبادی اپنی تفسیر خزائن العرفان میں آیت:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ اِلَيْهِمْ﴾

(النحل: ۶۳)

(تم سے پہلے نہ بھیجے ہم نے؛ مگر مرد جن کی طرف وحی کرتے تھے۔) کے تحت فرماتے ہیں:

”یہ آیت مشرکین مکہ کے جواب میں نازل ہوئی، جنہوں نے سید عالم ﷺ کی نبوت کا اس طرح انکار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے برتر ہے کہ وہ کسی بشر کو رسول بنائے۔ انہیں بتایا گیا کہ سنت الہی اسی طرح جاری ہے، ہمیشہ اس نے انسانوں میں سے مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا۔“ (۲)

اس عبارت میں مولانا نعیم الدین صاحب نے صاف طور پر بتایا ہے کہ سنت

(۱) بہار شریعت: ۸/۱

(۲) خزائن العرفان سورہ نحل ف: ۸۹

معلوم ہوا کہ علماء دیوبند بھی آپ کو نور مانتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علمائے دیوبند، حضور اکرم ﷺ کو ایک معمولی بشر نہیں کہتے، جیسا کہ بعض لوگ ان پر الزام رکھتے ہیں؛ بل کہ وہ آپ ﷺ کو سید البشر و افضل البشر کہتے ہیں اور خدا کے بعد سب سے بزرگ و برتر ہستی مانتے ہیں، ترجمان علمائے دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ علمائے دیوبند کا سرکارِ دو عالم ﷺ کے بارے میں عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”علمائے دیوبند بصدقِ قلب سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ کو افضل الکائنات، افضل البشر، اور افضل الانبیاء یقین کرتے ہیں؛ مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی اعلانیہ اقرار کرتے ہیں، وہ علماء (دیوبند) آپ کی ذاتِ بابرکات کو تمام انبیائے کرام کی تمام کمالاتِ خصوصیاتِ خلقت، اصطفائیّت، کلیمیّت، روحیت، موادِ قیّت، مخلصیت اور صدقیت وغیرہا کا جامع؛ بل کہ مبداءِ نبوتِ انبیاء اور منشاءِ ولایتِ اولیاء سمجھتے ہیں۔ (۲)

حضرت مرشدی مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ خلیفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”تعلیمات اسلام“ میں فرماتے ہیں:

”آپ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور ایک

(۱) خصائل نبوی: ۲۵۴

(۲) علمائے دیوبند کا دغی رُخ: ۱۱۸

علمائے دیوبند کی ان عبارات سے اور ان کے علاوہ سینکڑوں سیرۃ النبی و مناقب و فضائل نبی پر ان حضرات کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننے کے ساتھ تمام مخلوق میں سب سے افضل قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس پر کفر کا فتویٰ بھی صادر کرتے ہیں، جو آپ کو محض اپنے جیسا کہ ایک معمولی بشر مانے۔ چنانچہ مناظر اسلام مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”تحقیق الکفر والایمان“ میں بشریت نبی کا مسئلہ مفصل لکھ کر آخر میں رقمطراز ہیں:

”ایسے ہی وہ بھی کافر ہے جو آپ کو بالکل اپنے مثل بتلائے اور معاذ اللہ ایک دینیوی ایلچی اور قاصد کی قدر، رسالت و نبوت کی سمجھے۔“ (۲)

انکارِ بشریت کی دلیل کا جواب

اس تفصیل کے بعد بشریت نبی کی نفی و انکار کرنے والوں کی دلیل کا جواب دے دینا بھی ضروری ہے، جو لوگ حضور ﷺ کو بشر ماننے تیار نہیں، وہ قرآن و حدیث کے واضح دلائل کو چھوڑ کر ایک ایسی حدیث سے دلیل لاتے ہیں، جو ان کے مدعی پر دلالت ہی نہیں کرتی، وہ دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث ہے:

”رسول اللہ ﷺ صوم وصال یعنی بغیر سحری و افطار کے لگا تار روزے رکھتے، صحابہ نے اس کی اجازت چاہی کہ وہ بھی یوں روزہ رکھیں گے، آپ ﷺ نے اس پر فرمایا کہ ”لست کا احد کم“ کہ میں تمہارے جیسا نہیں ہوں، اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔“

(۱) تعلیمات اسلام: ۶۲/۱

(۲) رسالہ مذکورہ: ۱۵

مگر اس سے یہ سمجھنا کہ حضور انسان و بشر نہیں تھے، قصور فہم کا نتیجہ ہے؛ کیوں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میرے میں ایسی خصوصیات و کمالات ہیں جو تم میں نہیں۔ جیسے استاذ اپنے شاگرد کو اگریوں کہے کہ تم مجھ جیسے نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ شاگرد انسان نہیں یا استاد انسان نہیں۔ بل کہ اس سے بتانا یہ ہے کہ دونوں کے مرتبوں میں فرق ہے۔ اسی طرح آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ میرا مقام و مرتبہ تم جیسا نہیں؛ بل کہ میرا مقام اونچا ہے۔ اور اسی کے اقتضا سے خدا کی طرف سے مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے؛ لہذا اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ بشر نہیں تھے غلط ہے۔

خلاصہ تحقیق

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن، حدیث و آثار صحابہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر و انسان ہونا بہ صراحت ثابت ہوتا ہے؛ نیز آپ کا نور ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ لحاظ جنس و اصل کے انسان ہیں اور صفات کے لحاظ سے جیسے آپ بادی، بشیر، نذیر و غیرہ القاب سے ملقب ہیں، اسی طرح آپ نور سے بھی موسوم ہیں اور آپ کے بشر ہونے کو جس طرح دیوبندی علما مانتے ہیں، علمائے بریلوی بھی اس کے قائل ہیں اور آپ کے نور ہونے کا جس طرح بریلوی اقرار کرتے ہیں، علمائے دیوبند بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

ناظرین کرام! اس واضح و صاف مسئلہ کو بعض ضدی و اختلاف پسند طبعیتوں نے عوام میں اٹھا کر ایک دوسرے پر کچھڑا چھالنے کی فضا پیدا کر دی ہے۔ لہذا ایسے لوگوں کو موقعہ ہی نہ دیں اور ہمیشہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو راضی کرنے کی فکر کریں اور حقائق کے سامنے آ جانے کے بعد اس کو قبول کر کے اپنی آخرت کو سنوارنے کی کوشش فرمائیں۔

حاضر و ناظر

نبی کریم ﷺ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں بھی دیوبندی و بریلوی مکاتب فکر میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیوبندی حضرات، حضور ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کا شدت سے انکار کرتے ہیں اور بریلوی طبقہ کے لوگ آپ کے حاضر و ناظر ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ”حاضر و ناظر“ کا مطلب کیا ہے؟ حاضر کا مطلب ہے، وہ جو موجود ہو اور ناظر کہتے ہیں اس کو جو دیکھنے والا ہو۔ مگر اس کا یہ سادہ معنی مراد نہیں ہوتا؛ بل کہ جب یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس سے ایک ایسی شخصیت مراد لی جاتی ہے جو کائنات میں ہمہ وقت ہر جگہ موجود ہو اور ہمہ وقت ہر چیز کو دیکھتی ہو، سوال یہ ہے کہ کیا نبی کریم ﷺ کی ذات اس معنی کے لحاظ سے حاضر و ناظر ہے؟

ایک اہم نکتہ

اس مسئلے پر غور کرنے سے قبل ایک اہم نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے، وہ یہ کہ حاضر و ناظر کا جو مفہوم اوپر عرض کیا گیا ہے اور اسی معنی کو لے کر نبی کریم ﷺ کے ”حاضر و ناظر“ ہونے میں دیوبندی و بریلوی حضرات کا اختلاف بھی ہے، اس معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن مجید ”حاضر و ناظر“ ہونا، اللہ

تعالیٰ کی صفت قرار دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحَکِّیْدُ: ۴)

(کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔)

یہ اللہ کے حاضر ہونے کی دلیل ہے اور ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

(اللہ ان چیزوں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔)

بعض جگہ بصیر کا لفظ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور ایک

جگہ فرمایا:

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾

(نَبَا: ۳)

(زمین و آسمان میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔)

یہ اللہ کے ناظر ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ طے ہے کہ اللہ کی کسی صفت کو اسی معنی و مفہوم کے لحاظ سے کسی اور کے لیے ثابت ماننا شرک ہے۔ اسی لیے توحید خداوندی کا مفہوم ہی علما نے یہ بتایا ہے۔

اللہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال

میں، نہ احکام میں۔ (۱)

”یگانہ است ہم در ذات و ہم در صفات و ہم در افعال ہیچ کس

را در ہیچ امر باوے شرکت نیست۔“ (۲)

(اللہ ایک ہے ذات میں بھی، صفات میں بھی، افعال میں بھی کوئی

(۱) بہار شریعت: ۳/۱

(۲) مالا بدمنہ: ۳

شخص کسی چیز میں بھی اس کا شریک نہیں ہے۔)

ان عبارات سے واضح ہوا کہ اللہ کی صفات بھی اس کی ذات کی طرح یکتا ہیں کوئی مخلوق اس کی صفات میں بھی اس کے ساتھ شرکت نہیں رکھتی۔ اس تفصیل کے بعد اصل بات کی طرف آئیے کہ جب ”حاضر و ناظر“ ہونا، اللہ کی صفت ہے تو یہ صفت کسی اور کی اس معنی و مفہوم کے لحاظ سے کیسے ہو سکتی ہے؟

اس نکتہ سے خود ہی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ کی طرح ”حاضر و ناظر“ جاننا و ماننا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم مختصر طور پر دلیل سے یہ ثابت کریں گے، پھر اختصار ہی سے دوسرے نظریہ والوں کی دلیل پر بھی غور کریں گے۔

دلائل کی روشنی میں

اس سلسلہ میں اولاً چند احادیث کا ذکر کرتا ہوں، پھر ان سے جو سبق مل رہا ہے اس کی جانب اشارہ کروں گا۔

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ) ایک غزوہ میں حضرت نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، جب واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نئی نئی شادی کیا ہوں، آپ نے فرمایا کہ تم نے شادی کر لی ہے؟ عرض کیا ہاں۔ فرمایا: کنواری سے یا ثیبہ سے؟ عرض کیا کہ ثیبہ سے (یعنی ایسی عورت سے جو پہلے کسی سے بیاہی گئی ہے، آپ نے فرمایا کہ کنواری سے کیوں نہیں کیا؟ (۱)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دروازہ کھٹکھٹائے۔ آپ ﷺ نے پوچھا

اور اگر تجھ سے گناہ ہو گیا ہے تو اللہ سے استغفار کر اور توبہ کر۔“ (۱)

یہ چند احادیث ”ذخیرہ حدیث“ سے بطور ”نمونہ از خردارے“ پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی حدیث بتا رہی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی شادی ہوئی؛ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شادی میں حاضر نہیں تھے اور نہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا شادی کر لی؟ پھر یہ بھی پوچھا کہ باکرہ سے یا ثیبہ سے؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر تھے تو آپ کیوں پوچھتے؟ دوسری حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ آپ کے دروازے پر موجود ہیں؛ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ کون دروازے پر ہیں۔ آپ نے پوچھا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں ہوں، اس پر بھی آپ کو چوں کہ معلوم نہ ہوا کہ کون ہیں؛ لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب پر ناگواری ظاہر کی۔ اگر آپ حاضر و ناظر تھے تو آپ کو دروازے پر کون ہیں، اس کا علم نہ ہوتا؟

اسی طرح تیسری حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی ہو گئی؛ مگر آپ کو علم نہ ہوا، چوتھی اور پانچویں حدیث سے معلوم ہوا کہ حاطب رضی اللہ عنہ کا خط لکھنا، آپ کو معلوم نہ ہوا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بری ہونا، اللہ کے بتانے تک آپ کو معلوم نہ ہوا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ہدایت کی کہ اگر تم سے غلطی ہو گئی ہو تو توبہ کر لو۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر ان سب جگہوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھے اور وہاں کے حالات کے آپ ناظر بھی تھے تو آپ کو یہ سب باتیں پہلے ہی سے معلوم کیوں نہ ہونیں؟

غرض ان احادیث سے واضح ہوا کہ آپ ہر جگہ نہ حاضر ہوتے ہیں، نہ ہر چیز کے ناظر ہوتے ہیں۔ ہاں جب خدا چاہتا ہے تو بہت سی باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔

قرآن میں ”شاہد“ کا معنی

اس کے بعد یہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بعض لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”حاضر و ناظر“ کہتے ہیں وہ قرآن میں مذکور آپ کی صفت ”شاہد“ سے استدلال کرتے ہیں، قرآن نے ایک جگہ فرمایا:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴾ (الْخُرَابِ : ٢٥)

(یعنی ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔)

اس آیت میں شاہد کے معنی گواہ کے ہیں، اس سے بعض لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ حاضر و ناظر ہیں؛ کیوں کہ گواہی کے لیے واقعہ کے موقعہ پر حاضر ہونا اور اپنی آنکھوں سے اس واقعہ کو دیکھنا ضروری ہے۔ جب آپ تمام لوگوں کے بارے میں گواہی دینے والے ہیں تو سب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

مگر یہ استدلال بالکل غلط ہے، ایک تو اس لیے کہ اگر گواہ ہونے کے لیے حاضر و ناظر ہونا ضروری ہے تو قرآن نے امت محمدیہ کو بھی شاہد و گواہ قرار دیا ہے۔

چناں چہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرة: ٣٢١)

کیوں کہ وہ بھی دوسری امتوں کے خلاف اور نبیوں کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی، تو کیا کوئی عقل مند اس آیت کی رو سے پوری امت محمدیہ کو ”حاضر و ناظر“ مان سکتا ہے؟

دوسرے اس لیے کہ شاہد و گواہ ہونے کے قابل و ثوق ذرائع سے علم ہونا کافی

ہے، حاضر و ناظر ہونا ضروری نہیں۔ جو شخص کتب فقہ سے رجوع کرے گا اس کو اس کی تفصیلات ان میں مل جائیں گی۔ مثلاً فقہ حنفی کی معروف و مستند کتاب مختصر القدوری میں ہے کہ نسب، موت، نکاح، جماع اور تقرر قاضی کی شہادت بلا دیکھے بھی جائز ہے اس شرط سے کہ قابل اعتبار آدمی نے خبر دی ہو۔ (۱)

اور درمختار میں لکھا ہے کہ دس چیزوں کی شہادت بلا دیکھے جائز ہے۔ ان میں سے پانچ چیزیں وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اور پانچ چیزیں یہ ہیں، غلام کو آزاد کرنا، ولاء، مہر، وقف اور کسی کے قبضہ میں کچھ ہونا سوائے غلام کے۔ (۲)

حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ کے شاہد ہونے سے حاضر و ناظر ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور آپ کے شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی امتیں قیامت کے دن جب اپنے نبیوں کے بارے میں یہ کہیں گی کہ انہوں نے ہمیں پیغام نہیں پہنچایا تو امت محمدیہ گواہی دے گی کہ یہ جھوٹے ہیں۔ نبیوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ اس پر حضور اکرم ﷺ امت کے حق میں گواہی دیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ بھی اور آپ کی امت بھی نبیوں کے حق میں گواہی دیں گے اور اس شہادت کی بنیاد وحی الہی ہے۔

حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ کو اس معنی کر ”حاضر و ناظر“ ماننا جس معنی کر اللہ کو ”حاضر و ناظر“ مانتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ احادیث اس کا رد کرتی ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں تو بہت سے امور آپ کو بتا دیتے ہیں؛ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ہر جگہ حاضر اور ہر چیز کے ناظر ہیں۔

(۱) قدوری: ۲۵۱

(۲) رد المختار: ۴۷۰/۵

علم غیب

عالم الغیب خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور ہے؟ دیوبندی نقطہ نظر یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ اور بریلوی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم الغیب ہیں۔ مگر دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی ان دونوں گروہوں کا اختلاف شدید ہے۔ اس مسئلے میں صحیح بات تک رسائی کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم غیب کی حقیقت و اصلیت کیا ہے؟

علم غیب کی حقیقت

علماء نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ بہ قدر ضرورت کلام کرتے ہیں۔ غیب کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور مفسر علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ اپنی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں:

”الغیب فی الاصل مصدر غابت الشمس وغیرھا اذا

استترت عن العین واستعمل فی الشی الغائب الذی لم

تنصب له قرینة۔“ (۱)

غیب اصل میں ”غابت الشمس“ کا مصدر ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں: جب کہ سورج آنکھوں سے پوشیدہ ہو جائے اور یہ (لفظ غیب) اس پوشیدہ چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کے لیے کوئی قرینہ یعنی دلیل قائم نہ ہو۔

(۱) روح المعانی: ۱۰/۲۰

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ شاری بخاری فرماتے ہیں:

”وما یدرک بالدلیل لایکون غیباً۔“ (۱)

(جو چیز دلیل سے معلوم ہو جائے وہ غیب نہیں ہے۔)

ان بیانات کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ جب غیب کا لفظ استعمال میں آتا ہے تو اس کے معنی ہیں وہ چیز جو نظروں سے پوشیدہ ہو اور اس پر کسی قسم کی دلیل بھی نہ ہو اور جس پوشیدہ چیز پر دلیل قائم ہو اور اس دلیل سے اس پوشیدہ بات و چیز کا علم ہو جائے، اس کو غیب نہیں کہتے، جیسے حواس کے ذریعہ کسی مخفی بات کا علم، تجربہ سے کسی بات کا علم، یا کسی کے بتانے سے کسی مخفی بات کا علم، یہ سب علم غیب نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں قرینہ و دلیل اور واسطہ قائم ہے۔

علامہ عبدالعزیز فرہاری رحمۃ اللہ ”شرح شرح عقائد“ میں علم غیب کی تعریف بتانے کے بعد اسی بات کو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وبہذا التحقیق اندفع الاشکال فی الامور التی یزعم

انہا من الغیب ولیست منہ لکونہا مدركة بالسمع والبصر

والضرورة او الدلیل۔“ (۲)

(مذکورہ بالا تحقیق سے ان چیزوں کے بارے میں جو اشکال ہوتا تھا

وہ دفع ہو گیا۔ جن کو غیب کا گمان کر لیا گیا ہے، حالاں کہ وہ غیب نہیں،

کیوں کہ وہ کان، آنکھ یا بذاہت یا دلیل سے معلوم ہوئی ہیں۔)

اسی طرح علامہ آلوسی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مختلف ذرائع و اسباب سے جو علم

(۱) ارشاد الساری شرح بخاری: ۲۹۶/۱

(۲) نبراس: ۲۴۳

حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب نہیں، کیوں کہ وہ اسباب کے واسطے سے ہے۔ (۱)
 حاصل یہ ہے کہ علم غیب وہ ہے جو بغیر کسی واسطہ و ذریعہ کے حاصل ہو، نہ حواس
 کا واسطہ ہو، نہ اپنے تجربے کا واسطہ ہو، نہ کسی انسان، فرشتہ، جن یا خدا کا واسطہ ہو،
 ظاہر ہے کہ ایسا علم تو صرف اللہ ہی کو حاصل ہے جس میں کسی چیز کا واسطہ و ذریعہ نہیں
 ہے، باقی مخلوق کو جو علم حاصل ہو گا وہ کسی نہ کسی واسطہ و ذریعہ و سبب سے ہو گا۔ خود
 حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کے بتانے
 اور معلوم کرانے سے ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم غیب صرف اللہ کو حاصل ہے،
 کسی مخلوق کو نہیں۔ اور کسی مخلوق کو علم غیب کا حاصل ہونا ممکن بھی نہیں، کیوں کہ مخلوق کو
 اللہ کے بتائے بغیر غیب کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

مخلوق کے لیے علم غیب ممکن نہیں

چنانچہ حضرت علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ روح المعانی میں بہ صراحت
 لکھتے ہیں:

”علم غیب جس کی نفی غیر اللہ سے کئی گئی ہے وہ ہے جو کسی کو ذاتی طور پر
 حاصل ہو، یعنی اس کے ثابت ہونے میں کسی کا واسطہ نہ ہو اور یہ (بلا واسطہ
 علم کا حاصل ہونا) زمین و آسمان والوں میں کسی کے لیے بھی عقل باور نہیں
 کرتی؛ کیوں کہ یہ (مخلوقات) ذات و صفت کے لحاظ سے ممکنات میں
 سے ہیں اور ممکن ہونا ان کے لیے بلا واسطہ کسی چیز کے ثبوت سے انکار کرتا
 ہے۔ (یعنی جو ممکن و مخلوق ہے وہ بلا واسطہ علم نہیں پاسکتا۔“ (۲)

(۱) روح المعانی: ۱۲/۲۰

(۲) روح المعانی: ۱۱/۲۰

غرض یہ کہ علم غیب جس کی تفسیر اوپر آپ نے ملاحظہ فرمائی ہے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ کسی مخلوق کو اس کا حاصل ہونا غیر معقول و ناممکن بات ہے؛ کیوں کہ مخلوق کو جب بھی علم ہوگا تو کسی نہ کسی ذریعہ و وسیلہ سے ہوگا اور حضرات انبیاء و اولیا کو جو مخفی باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہ بھی اللہ کے وسیلے و ذریعے سے معلوم ہوتی ہیں، نہ کہ ذاتی طور پر لہذا وہ بھی علم غیب نہیں کہلاتا۔

قرآنی تصریحات

چنانچہ قرآن مجید علم غیب کو خاصہ باری عز اسمہ، وجل شانہ، قرار دیتا ہے اور غیر اللہ سے شدت کے ساتھ اس کی نفی کرتا ہے۔ تفصیل کے ساتھ دلائل نقل کرنے یہ موقع نہیں۔ لہذا یہاں صرف دو تین آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے، قرآن نے فرمایا:

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾

(الْجَنَّا: ۶۵)

(آپ کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو ہیں وہ غیب نہیں

جانتے مگر اللہ (جانتا ہے۔)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو، غیب کا علم صرف اللہ کو حاصل ہے؛ نیز قرآن نے خاص طور پر جناب محمد الرسول اللہ ﷺ کے بارے میں بتایا ہے کہ آپ بھی علم غیب نہیں رکھتے۔

چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا أَسْتَكْثِرُ مِنَ الْخَيْرِ﴾

(الْأَنْعَام: ۱۸۸)

(اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو بہت سا خیر جمع کر لیتا۔)

اس میں بتایا گیا ہے کہ نبی اقدس صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو غیب کا علم نہیں ہے، اگر آپ کو غیب کا علم حاصل ہوتا تو آپ کو دنیوی کوئی نقصان ہی نہ ہوتا، آپ پہلے سے اس سے بچاؤ کی تدبیر کر کے، خیر جمع کر لیتے، مگر سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو علم غیب نہ ہونے کی بنا پر کفار کی طرف سے ایذائیں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ غرض یہ کہ غیب کا علم جس کی تعریف اوپر گزری، صرف اللہ کو حاصل ہے۔

نقطہ اختلاف کی تعیین

مگر یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ دیوبندی اور بریلوی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو ذاتی طور پر علم حاصل نہیں؛ بل کہ اللہ کے ذریعہ و وسیلہ سے حاصل ہوا۔ دیوبندی علما کا یہ عقیدہ تو ظاہر ہے، بریلوی علما میں سے مولانا امجد علی رضوی صاحب نے اپنی کتاب ”بہار شریعت“ میں لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَام کو اپنے غیوب پر اطلاع دی، زمین و آسمان کا ہر ذرہ ہر نبی کے پیش نظر ہے؛ مگر یہ علم غیب کہ ان کو ہے اللہ کے دینے سے ہے۔ لہذا ان کا علم عطائی ہوا۔“ (۱)

نیز عقائد نظامیہ جو مولانا فخر الدین چشتی نظامی کی تصنیف ہے اور اب حکیم ادیس خان بریلوی نے تلخیص و ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے، اس میں لکھا ہے:

”واضح ہو کہ علم غیب کو مستقل طور پر سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، لیکن اللہ چن لیتا ہے، اپنے پسندیدہ رسولوں میں

(۲) آپ کو جو غیب کی باتیں اللہ کی طرف سے معلوم ہوئیں، اس کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

لہذا ہم اپنی اگلی بحث کو انہی نقاط پر مرکوز رکھیں گے۔ اب ہم ان میں سے پہلے نقطہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرہ ذرہ کا علم ہے؟

کیا حضور اقدس ﷺ کو زمین و آسمان کے ہر ذرہ ذرہ کا علم حاصل ہے؟ بریلوی نقطہ خیال سے اس کا جواب اثبات میں ہے۔ چنانچہ اوپر ”بہار شریعت“ کی عبارت ہم نے نقل کی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کا ہر ذرہ ہر نبی کے پیش نظر ہے اور دیوبندی علما کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اگرچہ اللہ کی طرف سے بہت سارے علوم عطا فرمائے گئے ہیں اور غیب کی بہت سی باتوں پر آپ کو مطلع کیا گیا ہے، مگر زمین و آسمان کے ہر ذرہ کا آپ کے پیش نظر ہونا، قرآن و حدیث سے ثابت نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ آپ کو ہر ذرہ کا علم نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیوبندی علما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی نظر سے دیکھتے ہیں، نہیں! وہ حضرات تو آپ کو خدا کے بعد سب سے زیادہ علم والا مانتے ہیں، چنانچہ دیوبند کے مدرسہ کے مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ ایک فتوے میں تحریر کرتے ہیں:

”وان سيدنا وشفيعنا محمداً صلى الله عليه وسلم اعلم

(یعنی ہمارے سردار و شفیع محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق میں سب سے زیادہ علم والے اور افضل ہیں، جو شخص آپ کے علم کو بچے، مجنون یا مخلوقات میں سے کسی کے برابر بتائے، یا یہ بکواس کرے کہ ابلیس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا عالم تھا، وہ کافر و ملعون ہے۔)

غرض دیوبندی حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا عالم مانتے ہیں؛ مگر اس کے باوجود قرآن و حدیث کے دلائل کی بنا پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ کو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم نہیں تھا، اس کے کچھ دلائل تو وہی حدیثیں ہیں جو گزشتہ مضمون ”حاضر و ناظر“ کے تحت ہم نے نقل کیے تھے کہ آپ کو بعض باتوں کا علم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور دلائل بھی رقم کرتا ہوں۔

(۱) ایک نکاح کے موقع پر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی موجودگی میں کچھ لڑکیاں دف بجا کر اشعار پڑھ رہی تھیں، انہی اشعار میں ایک مصرعہ یہ بھی پڑھا کہ ”ہمارے میں ایک ایسے نبی ہیں جو کل ہونے والی بات کو جانتے ہیں۔“
آپ نے فرمایا:

”اس کو چھوڑ دو اور وہ پڑھو جو پہلے سے پڑھ رہی تھیں۔“ (۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں لکھا کہ حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ کی

(۱) بحوالہ امداد الفتاویٰ: ۳۲۷/۲

(۲) بخاری: ۷۷۳/۲

روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:
 ”اس کو چھوڑ دو؛ کیوں کہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا
 ہونے والا ہے۔“ (۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خود نبی کریم ﷺ نے اپنے بارے
 میں اس بات کا انکار کیا ہے کہ آپ ہر چیز جانتے ہیں۔

(۲) بخاری و ترمذی میں ایک لمبی حدیث حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی
 ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک جہاد میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے منافق عبد اللہ
 بن ابی کوسنا کہ وہ مسلمانوں اور حضور ﷺ کے بارے میں لب کشائی کر
 رہا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کی خبر حضور اقدس ﷺ کو بذریعہ
 حضرت عمر رضی اللہ عنہ دی اور آپ نے اس کی تحقیق کے لیے آدمی بھیجا، منافقین نے انکار
 کیا اور جھوٹی قسم بھی کھالی۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زید
رضی اللہ عنہ کو جھوٹا سمجھ لیا اور منافقین کو سچا جانا، پھر جب سورہ منافقون نازل ہوئی تو آپ کو
 حقیقت معلوم ہوئی۔ (۲)

اس حدیث میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

”كَذَّبَنِي رَسُولُ اللَّهِ وَصَدَّقَهُ“

(رسول اللہ ﷺ نے مجھے جھوٹا سمجھا اور اس منافق کو سچا

سمجھا۔)

غور فرمائیے! اگر ہر ذرہ عالم کا علم آپ کو ہوتا تو اولاً آپ کو منافق کی یہ بات خود

(۱) فتح الباری: ۲۰۳/۹

(۲) بخاری، کتاب التفسیر: ۷۷/۲

ہی معلوم ہوتی، پھر آپ ﷺ کو تصدیق کے لیے آدمی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز آپ کو علم ہوتا تو آپ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تکذیب اور منافق کی تصدیق کیوں کرتے؟ معلوم ہوا کہ آپ کو ہر ذرہ ذرہ کا علم نہیں ہے۔

(۳) بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزرے، جس میں رات میں کسی مردے کو دفن کیا گیا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس کو کب دفن کیا گیا؟ صحابہ نے بتایا کہ رات میں۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟ عرض کیا گیا کہ ہم نے اس کو رات میں دفن کیا تھا، ہم نے برا سمجھا کہ آپ کو بیدار کریں، پھر آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ (۱)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک کالی عورت (یا ایک نوجوان) مسجد کی صفائی کرتی تھی، آپ ﷺ نے اس کو نہ پایا تو پوچھا کہ وہ کہاں؟ صحابہ نے بتایا کہ وہ مرگئی یا وہ مر گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ! چنانچہ صحابہ نے قبر بتائی۔ تو آپ نے نماز پڑھی۔ (۲)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے مرنے، دفن ہونے اور ان کی قبروں کا آپ کو علم نہ تھا۔ آپ کو صحابہ نے بتایا۔

(۵) ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں آئے اور کئی سوالات کئے اور آپ نے ان سوالوں کا جواب بھی دیا؛ مگر جب حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا کہ: ”ما المسئول عنها باعلم من السائل“ (کہ سائل (پوچھنے والے) سے زیادہ اس

(۱) مشکوٰۃ: ۱۴۵

(۲) مشکوٰۃ: ۱۴۵

کو نہیں معلوم جس سے پوچھا گیا ہے۔ (۱)

نمونہ کے طور پر چند احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ ورنہ تو اس سلسلے میں اتنی احادیث ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ ان احادیث پر سرسری نظر ڈالنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ بہت سے امور ایسے تھے جن کو نبی کریم ﷺ نہیں جانتے تھے۔ تو ذرہ ذرہ کا آپ کو علم حاصل ہونا خلاف تحقیق بات ہے۔

ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ جو ان دلائل کی وجہ سے بے بس ہو جاتے ہیں وہ اپنی بات کو نبھانے کے لیے کچھ عجیب عجیب تاویلوں سے کام لیتے ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو بالکل آخری عمر میں یعنی وفات سے ذرا قبل ہر ہر ذرہ کا علم دیا گیا تھا۔ ممکن ہے کسی کو ان کی تاویل سے شبہ ہو۔ لہذا اس پر بھی مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا﴾

(الْمَائِدَةُ: ۱۰۹)

(جب قیامت کے دن تمام رسولوں کو جمع کر کے پوچھا جائے گا کہ تم

کو کیا جواب دیا گیا تھا؟ تو تمام رسول کہیں گے کہ ہم کو معلوم نہیں ہے۔)

یہ حضرات انبیاء کا جواب قیامت کے دن ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کو بعض باتیں بعد انتقال اور روز محشر بھی معلوم نہ ہوں گی۔ اور اس آیت میں جس طرح دیگر انبیاء داخل ہیں، ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ بھی داخل ہیں۔

یہ واقعہ بھی قیامت کے دن کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض امتیوں کی حالت آپ کو اس دن بھی نہ معلوم ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر آپ کو بتایا جائے گا۔ اس تفصیل کے بعد یہ بھی عرض کر دوں کہ نہ صرف ان دنیوی معاملات اور لوگوں کے حالات و کوائف؛ بل کہ بعض حمد و ثناء کے مبارک کلمات بھی ایسے ہیں جن کا علم آپ کو صرف قیامت کے دن ہوگا۔ چنانچہ حدیث شفاعت میں ہے:

حضرات انبیاء لوگوں سے کہیں گے کہ تم محمد کے پاس جاؤ! لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میں اللہ سے اجازت طلب کروں گا اور مجھے اجازت دی جائے گی۔ اس کے بعد فرمایا:

”وَيُلْهُمْنِي مُحَمَّدٌ أَحْمَدُهُ بِهَذَا تَحْضُرُنِي الْآنَ“

”مجھے حمد کے کلمات الہام والقاء کیے جائیں گے جن کو اب میں

اپنے یاس نہیں پاتا۔“ (۲)

غور کیجئے کہ جب کچھ حمد و ثناء کے کلمات بھی ایسے ہیں جو وہاں ہی القاء و الہام

(۱) مشکوٰۃ: ۴۸۷

(۲) مشکوٰۃ: ۴۸۸

ہوں گے، تو یہ دعویٰ کہ آپ کو قبلِ وصال سب چیزوں کا علم دے دیا گیا، حقیقت سے کس قدر دور ہے؟

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا؟

اب آئیے دوسرے نقطہ اختلاف کی طرف! ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ دیوبندی حضرات کی طرح بریلویت کے علمبردار بھی یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جو کچھ علم حاصل ہے، وہ اللہ کے عطا فرمانے کا نتیجہ ہے اور یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ علم غیب وہی ہے جو ذاتی طور پر حاصل ہو۔

اس سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ حقیقی معنی کے لحاظ سے نبی کریم ﷺ نہ ہی دیوبندیوں کے پاس عالم الغیب ہیں، نہ بریلویوں کے نزدیک، کیوں کہ حقیقی معنی کے لحاظ سے عالم الغیب وہی ہے جو بلا کسی واسطہ کے ذاتی طور پر علم رکھتا ہو اور ایسا علم آپ کو حاصل نہ ہونے پر دونوں طبقے متفق ہیں، جیسا کہ اوپر حوالے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اب اختلاف صرف اس قدر ہے کہ اللہ کی عطا سے آپ کو جو بعض غیب کی باتوں کا علم حاصل ہوا ہے۔ اس کی بنا پر آپ کو عالم الغیب کہنا درست ہے یا نہیں؟ بریلوی لوگ اس کو درست قرار دیتے ہیں اور آپ کے لیے عالم الغیب کا اطلاق ضروری سمجھتے ہیں اور دیوبندی علما اس کو بھی درست نہیں قرار دیتے۔ دیوبندی حضرات کی دلیل یہ ہے کہ شریعت نے بعض الفاظ سے؛ اس لیے منع کر دیا ہے کہ اس سے شرک کا وہم ہوتا ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

”اپنے غلام و باندی کو ”عبدی اور امتی“ (میرے بندے، میری

(بندی) نہ کہو تم سب کے سب اللہ کے بندے اور تمہاری عورتیں اللہ کی

بندیاں ہیں۔“ (۱)

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:
 ”تم میں سے کوئی میرا بندہ، میری بندی ہرگز نہ کہے اور غلام بھی
 (اپنے آقا کو) میرا رب نہ کہے۔ تم سب اللہ کے مملوک و غلام ہو اور
 رب تو اللہ ہی ہے۔“ (۲)

ان حدیثوں میں اپنے غلام و باندی کو بندہ، بندی کہنے سے اور آقا کو رب کہنے
 سے صاف طور پر منع کیا ہے، اس کی وجہ علما نے یہی بتائی ہے کہ غلام کو بندہ کہنے سے
 آقا کے معبود ہونے کا وہم ہوتا ہے، اسی طرح کسی کو رب کہنے سے اللہ کی صفت ربوبیت
 میں اس کے شریک ہونے کا وہم گزرتا ہے، شریعت اس کو بھی ناپسند کرتی ہے۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا
 کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض و برا آدمی وہ ہوگا جو اپنا
 نام ”مَلِکُ الامَلَاک“ رکھے۔ سوائے اللہ کے کوئی مالک نہیں۔ (۳)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ یہ نام رکھنا حرام ہے۔ اسی
 طرح اللہ کے مخصوص ناموں سے نام رکھنا حرام ہے۔ جیسا رحمان، قدوس، مہیمن،
 خالق الخلق وغیرہ۔ (۴)

جب یہ واضح ہو گیا کہ شریعت بعض ناموں سے منع کرتی ہے جن میں شرک کا
 وہم ہوتا ہو، تو اب یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو عالم الغیب کہنے سے

(۱) الادب المفرد: ۴۸

(۲) الادب المفرد: ۴۸

(۳) مسلم شریف: ۲۰۸/۲

(۴) شرح مسلم: ۲۰۸/۲

مخالفین کے دلائل پر نظر

ان لوگوں کی دلیل ایک تو یہ آیت ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾ (النِّسَاءُ : ١١٣)

(اے نبی! اللہ نے آپ کو وہ سب کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔)

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ نے خود بتایا ہے کہ آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے وہ سب کچھ آپ کو بتا دیا، تو اس میں تمام چیزیں داخل ہو گئیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کا یہی مطلب ہوتا ہے تو قرآن میں اللہ نے ایسا ہی تمام مسلمانوں سے فرمایا ہے:

﴿كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرة: ٢٣٩)

(یعنی جیسے سکھایا تم کو وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔)

تو کیا یہاں بھی ”ما“ (جو کچھ) کا یہی معنی لیں گے کہ جو کچھ نہیں جانتے تھے وہ سب سکھایا تو کیا تمام مسلمان بھی ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں، تو

جیسے یہاں ”ما“ کا لفظ عام نہیں۔ ایسے ہی پہلے جملہ میں بھی عام نہیں؛ بل کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اے نبی! منصب نبوت کے متعلق جو کچھ ضروری ہے وہ ہم نے آپ کو سکھا دیا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”میں نے اللہ کو بہترین صورت میں دیکھا، اللہ نے پوچھا کہ فرشتے کس بات میں جھگڑا کر رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں، اللہ نے کندھے پر ہاتھ رکھا، پس تمام چیزیں میرے لیے ظاہر ہو گئیں، جو آسمان وزمین میں ہیں۔“ (۱)

مواہب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کو میرے پاس اٹھالایا گیا۔ پس میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور ان تمام چیزوں کی طرف بھی دیکھ رہا ہوں جو قیامت تک ہونے والی ہیں۔ (۲)

مگر ان روایات سے بھی استدلال کرنا کہ آپ ہر ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں۔ صحیح نہیں۔ اولاً تو ان روایات کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (۳)

دوسرے ان روایات میں بھی ”ما“ سے عموم مراد لینا صحیح نہیں؛ جب کہ بے شمار روایات سے ثابت ہے کہ آپ کو بہت سے امور دنیویہ کا علم نہ تھا۔ لہذا یہاں بھی ”ما“

(۱) مشکوٰۃ: ۷۰

(۲) مواهب لدنيه

(۳) دیکھو: احکام القرآن مفتی محمد شفیع صاحب: ۲/۳

سے مراد زمین و آسمان کے اہم واقعات ہیں، تیسرے حدیث کے الفاظ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت زمین و آسمان کو آپ کے لیے منکشف کر دیا گیا تھا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ حالت برقرار رہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ کو بہت سارے ان امور میں دقت پیش نہ آتی جن کی طرف آپ نے توجہ بھی فرمائی۔

غرض یہ کہ ان روایات سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ آپ کو ذرہ ذرہ کا علم تھا۔
یاد رکھو! عقیدہ کا ثبوت قطعی دلیل سے ہوتا ہے نہ کہ ضعیف خبر واحد سے جیسا کہ
اہل علم جانتے ہیں۔

مشکل کشا و حاجات روا اور مختار کل

اللہ تبارک و تعالیٰ بندوں کی حاجت روائی و مشکل کشائی فرماتے ہیں اور ساری مخلوق اللہ تبارک و تعالیٰ کی محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ مختار کل ہیں۔ مگر کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی مشکل کشا و حاجت روا و مختار کل ہے؟

اس سوال کے جواب میں دیوبندی حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا و مشکل کشا نہیں اور نہ کوئی مختار کل ہے۔ اور بریلوی لوگ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور حضرات اولیاء اللہ بھی مشکل کشا ہیں اور حاجت روائی کرنے کی طاقت و قوت رکھتے ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو اور آپ کے واسطے سے اولیاء اللہ کو کائنات میں تصرف کا پورا اختیار دے دیا ہے۔

بریلوی مسلک کی توضیح

آگے بڑھنے سے پہلے بریلوی مسلک کی وضاحت کر دینا ضروری ہے تاکہ آگے بحث کے موقع پر وقت نہ پیش آئے۔ بریلوی مسلک کی مشہور و معروف و مستند کتاب ”بہار شریعت“ میں نبی کریم ﷺ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے:

”حضور اقدس صَلَّی اللہ علیہ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اللہ عزوجل کے نائب مطلق ہیں، تمام جہاں حضور صَلَّی اللہ علیہ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے تحت تصرف کر دیا گیا، جو چاہیں کریں، جیسے چاہیں دیں، جس سے جو چاہیں واپس لیں، تمام جہاں میں ان کے حکم کا پھیرنے والا کوئی نہیں..... آگے لکھتے ہیں:

”ملکوت السموات والارض“ حضور کے زیر فرمان جنت و نار کی کنجیاں دست اقدس میں دے دی گئی ہیں، رزق و خیر اور ہر قسم کی عطائیں حضور ہی کے دربار سے تقسیم ہوتی ہیں، دنیا اور آخرت حضور کی عطا کا ایک حصہ ہے۔ احکام تشریعہ حضور کے قبضہ میں کر دیے گئے کہ جس پر جو چاہیں حرام فرمادیں اور جس کے لیے جو چاہیں حلال کر دیں اور جو فرض چاہیں معاف فرمادیں۔“ (۱)

اور اسی کتاب میں حضرات اولیاء اللہ کے متعلق لکھا گیا ہے:

”اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی طاقت دی ہے، ان میں جو اصحاب خدمت ہیں، ان کو تصرف کا اختیار دیا جاتا ہے، سیاہ و سفید کے مختار بنا دیے جاتے ہیں، یہ حضرات نبی صَلَّی اللہ علیہ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے چپنا ب ہیں، ان کو اختیارات و تصرفات حضور کی نیابت میں ملتے ہیں۔“ (۲)

ان عبارات سے بریلوی مکتب فکر کا اولیاء اللہ و آنحضرت صَلَّی اللہ علیہ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے بارے میں عقیدہ وضاحت و صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ حضرات سیاہ و سفید کے مالک اور کائنات میں ہر طرح

(۱) بہار شریعت: ۱/۱۶

(۲) بہار شریعت: ۱/۵۵

کے تصرف کے مجاز و مختار ہیں تو حاجت روائی و مشکل کشائی بھی ان کی صفت ہے۔

مسلكِ دیوبند کی ترجمانی

اس کے بعد علمائے دیوبند کا مسلک بھی واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی غلط
وہم نہ ہو جائے۔ علمائے دیوبند حضرات انبیاء، حضرات اولیائے اللہ کو بڑی عظمت
و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی عظمت و محبت کو ایمان کا جز و لازم خیال کرتے
ہیں؛ مگر ان کو مختار کل اور مشکل کشا نہیں مانتے۔ یعنی اللہ کی صفات بندوں کو بانٹنے
کے وہ قائل نہیں۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب خلیفہ حضرت تھانوی
رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اولیائے اکرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ مسلک علمائے دیوبند کی رو سے اُمت کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جن سے ان کی امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے؛ اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی تعظیم ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن ان کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف یا نذر یا منت و قربانی کا محل بنا لیں، وہ ان کی منور قبروں سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے کے قائل ہیں؛ لیکن انہیں مشکل کشا اور دافع البلاء والوباء نہیں سمجھتے، کہ وہ صرف شان کبریائی ہے۔“ (۱)

اس سے واضح ہوا کہ علماء دیوبند انبیاء و اولیاء کی تعظیم و محبت کرتے ہیں، مگر ان

(۱) علماء د یو بند کا دخی رُخ: ۱۲۹ تا ۱۳۰

کو خدا جیسا نہیں سمجھتے، صفات خداوندی سے ان کو متصف کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ لہذا وہ ان کو مشکل کشا و مختار کل نہیں مانتے۔

اب ہمیں قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں میں سے کس کا مسلک صحیح ہے اور اسلام کی تعلیم کے مطابق ہے۔

قرآن کا فیصلہ

(۱) پہلے قرآن کو لیجئے! اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں سے علی الاعلان یہ کہہ دیں:

﴿لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ

لَكُمْ إِنِّي مَلِكٌ إِنِ اتَّبَعُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ﴾ (الأنعام: ۵)

(ترجمہ: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں

اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ

میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو مجھ پر اترتی ہے۔)

اس آیت کی تشریح و تفسیر میں مولانا نعیم الدین صاحب رضوی مرآۃ دہادی لکھتے

ہیں:

”کفار کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سید عالم ﷺ سے طرح

طرح کے سوالات کیا کرتے تھے، کبھی کہتے کہ آپ رسول ہیں تو ہمیں

بہت سی دولت اور مال دیجئے کہ ہم کبھی محتاج نہ ہوں، ہمارے لیے

پہاڑوں کو سونا بنا دیجئے..... کچھ اور کفار کے مطالبات کا ذکر کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:..... ان تمام باتوں کا اس آیت میں جواب دیا گیا

ہے..... کہ آپ فرما دیجئے کہ میرا دعویٰ یہ تو نہیں کہ میرے پاس اللہ کے

خزانے ہیں جو تم مجھ سے مال و دولت کا سوال کرو۔“ (۱)

آیت پاک اور اس کی مذکورہ بالا تفسیر سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ نے اپنے خزانوں پر اختیار تصرف نہیں دے دیا ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے وضاحت و صراحت سے خود نبی کریم ﷺ کی زبانی اس کی نفی کر دی ہے اور آخر میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپ تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں جو وحی کے ذریعہ آپ کو بتایا جاتا ہے، آپ کو کلی اختیارات اور ہر طرح کی قدرت نہیں دے دی گئی ہے۔ اور اسی طرح کی بات قرآن میں حضرت سیدنا نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی بصراحت بتائی ہے۔ (۲)

جب حضرت نوح علیہ السلام اور خود جناب رسالت مآب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن نے یہ بتایا ہے تو اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام کے بارے میں کون گمان کر سکتا ہے کہ وہ مختار کل ہو سکتے ہیں، اور سیاہ و سفید ان کے تحت تصرف کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی کو بھی قرآن یہ حق نہیں دیتا ہے تو غیر نبی کو کس طرح حق مل سکتا ہے؟

(۲) ایک جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ کفار نبی کریم ﷺ سے کہتے ہیں کہ قیامت کا یا عذاب کا جو وعدہ آپ کرتے ہیں، وہ کب آئے گا؟ آپ جلد اس عذاب کو لائیے! یہ ذکر کر کے اللہ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ اس کا جواب یوں دیجئے۔

﴿لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾

(يُونُسُ: ۴۹)

(۱) خزائن العرفان: ۱۹۴

(۲) سورۃ ہود: ۳۱

(میں اپنی ذات کے لیے نقصان یا نفع کا مالک نہیں؛ مگر جتنا کہ اللہ چاہے۔)

یہی بات بعینہ سورہ اعراف (آیت: ۱۸۸) میں بھی موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں تصرف کا اختیار نبی کریم ﷺ کو نہیں دیا گیا اور نہ آپ نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کفار کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ آپ عذاب لائیے! قیامت قائم کیجئے! تو اگر آپ کو کائنات میں تصرف کا اختیار خدا کی عطا سے ہی سہی حاصل ہوتا تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل کرنے سے ان کا جواب کیسے ہو جاتا؟ جواب تو اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کا اختیار نہ ذاتی طور پر حاصل ہوا اور نہ اللہ کی عطا سے حاصل ہو۔

الغرض معلوم ہوا کہ اللہ نے آپ کو نفع و نقصان کا مالک، کائنات میں تصرف کا مجاز، اور تمام خزانوں کا حامل نہیں بنادیا ہے۔ قرآن اس کی نفی کرتا ہے۔

(۳) قرآن مجید میں رزق کے بارے میں بے شمار آیات ہیں، جن میں رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور بتایا ہے کہ رزق بے حساب دینا، کسی کو کم کسی کو زیادہ دینا، یہ سب اللہ کا کام ہے۔ یہاں ان آیات سے چند کے صرف حوالہ پیش کرتا ہوں۔

رعد: ۶۲، نحل: ۷۱، بنی اسرائیل: ۳۰، قصص: ۸۲، عنکبوت: ۶۲، روم: ۳۷، سبا: ۳۶-۳۹، زمر: ۵۲، شوری: ۱۲، بقرہ: ۲۱۲، نور: ۳۸ وغیرہ ان حوالوں کو قرآن میں دیکھ لیں۔ صاف طور پر معلوم ہوگا کہ رزق کے دینے، کم کرنے، زیادہ کرنے کو اللہ نے صرف اور صرف اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ نیز دیگر آیات میں مخلوق سے نفی کی ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ﴾

(سَبَّحًا : ۲۴)

(آپ (ان سے پوچھئے) کون تمہیں رزق دیتا ہے، آسمانوں اور

زمین سے آپ خود بتا دیجئے کہ اللہ۔)

اور سورہ فاطر میں ہے کہ اللہ نے سوال کیا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے؟

جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ (فاطر: ۳)

یعنی کوئی ایسا نہیں۔ اس کے بعد کہاں گنجائش ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دربار سے رزق تقسیم ہوتا ہے۔

(۴) قرآن میں ایک جگہ نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي

مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ﴾ (التَّحْرِيمُ : ۱۰)

(اے نبی!) آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں،

جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے، اپنی بیویوں کی مرضی کی خاطر۔)

یہ آیت ایک خاص موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چیز کو اپنے اوپر

حرام کر لینے یعنی نہ کھانے کی قسم کھا لینے پر نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہ تھا کہ شرعی احکامات میں اپنی طرف سے تبدیلی

فرمادیں۔ یہاں حالاں کہ آپ نے دین میں تبدیلی نہیں کی تھی کہ اللہ کی حلال کردہ

چیز کو حرام قرار دے دیا ہو؛ بل کہ آپ نے اپنی ذات کے لیے اس کو حرام کر لیا تھا۔ جو

در اصل حلال کو حرام کرنا نہیں بل کہ حلال سے پرہیز کرنا ہے، اس پر بھی جب آپ پر

عتاب ہوا تو غور فرمائیے کہ شریعت کو تبدیل کرنے کا آپ کو اختیار ہو سکتا ہے؟

یہ چند آیات ہیں، جو بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ دیوبندی علماء جو کہتے ہیں کہ مختار کل اور کائنات میں متصرف صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے، اسی طرح نفع و نقصان کی مالک ذات صرف اللہ ہی کی ہے، لہذا مشکلات کو حل کرنا اور حاجت روائی کرنا بھی صرف اسی کے قبضہ قدرت و اختیار میں ہے۔ یہ صحیح ہے۔

حدیث نبوی کا فیصلہ

احادیث میں نبی کریم ﷺ نے امت کو اسی کی تعلیم دی کہ جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو! کسی حدیث میں بھی یہ نہیں ملتا کہ آپ نے کسی صحابی کو بھی یہ تعلیم فرمایا ہو کہ اللہ کے بجائے میرے سے مانگو، میں مختار کل ہوں، نفع و نقصان کا مالک ہوں، اور کائنات میں تصرف کا اختیار رکھتا ہوں۔ نہیں، کبھی نہیں۔ بل کہ ہمیشہ یہی سکھایا ہے کہ اللہ سے مانگو۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم

ﷺ نے فرمایا: ”اِسْتَعِنُ بِاللّٰهِ۔“

(کہ اللہ سے مدد چاہو۔) (۱)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے نصیحت

فرمائی، اس میں یہ بھی فرمایا کہ جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو، پھر فرمایا کہ اگر پوری اُمت تجھ کو نفع دینا چاہے تو نہیں دے سکتی، مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر وہ سب تجھ کو نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے حق میں لکھ دیا ہے۔ (۲)

(۱) مشکوٰۃ: ۴۳۵/۴۵۲

(۲) مشکوٰۃ: ۴۳۵

ان احادیث میں نبی کریم ﷺ نے اُمت کو یہی تعلیم دی ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ سے سوال کرو، اسی سے مدد چاہو۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ پوری امت یعنی تمام لوگ مل کر بھی نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان، اور پوری اُمت سے مراد صرف عام لوگ ہی نہیں؛ بلکہ ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مراد تمام مخلوق خاص و عام انبیاء و اولیا اور ساری اُمت ہے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ حدیث نفع و نقصان کی مالک صرف اللہ کو قرار دیتی ہے اور اسی سے اپنی مرادیں و حاجتیں مانگنے کی تعلیم دیتی ہے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا:

”تم میں سے ہر ایک اپنی سب حاجتیں اپنے رب سے مانگے حتیٰ کہ جو توں کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ ہی سے مانگے اور حضرت ثابت بنانی رحمہ اللہ سے مرسل مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نمک کی ضرورت ہو تو بھی اللہ سے مانگے۔“ (۲)

غور فرمائیے کہ اللہ کے نبی ﷺ تمام مسلمانوں کو تعلیم دے رہے ہیں کہ جب بھی تمہیں کوئی ضرورت پڑے تو اللہ ہی سے مانگو، حتیٰ کہ نمک اور تسمہ جیسی چیزیں بھی اسی سے مانگو۔

نیز آپ نے اپنے ارشادات میں بتایا ہے کہ ہر چیز کا اختیار کلی صرف اللہ کو ہے مجھے کوئی اختیار نہیں۔ مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے اپنے رشتہ داروں کا نام لے لے کر فرمایا: ”اے فلاں، اے فلاں“ لا اُغنی عنکم من اللہ شیئاً“

(۱) مرفقات: ۱۹/۵

(۲) مشکوٰۃ: ۱۹۶

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا نہیں؛ بل کہ صرف وہ جو اللہ چاہے۔ (۲)
اس حدیث نے بتا دیا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، نہ کہ وہ جو حضور
چاہیں اور اللہ کے ساتھ مشیت میں آپ کو شریک کرنا شرک ہے۔
غور کیجئے کہ اگر حضور ﷺ کو اختیارات اللہ نے دے دیئے
ہوتے تو آپ ﷺ ایسا کیوں فرماتے؟

﴿وَمَا نُنَزِّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ﴾ (مَرْيَمَ: ۶۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور کے مطالبے کا جواب تھی۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی خواہش تھی کہ حبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس زیادہ آئیں؛ مگر آپ کو اس خواہش کے پورا کر لینے کا

(۱) بخاری کتاب التفسیر : ۷۰۲/۲

(٢) الادب المفرد: ٢٤٢

(۳) بخاری، کتاب التوحید: ۶۹۱/۲

اختیار نہیں تھا۔ آپ کو جواب دے دیا گیا کہ فرشتے بغیر اللہ کے حکم کے آپ کے پاس نہیں آسکتے۔

غور کیجئے اگر آپ کو پوری کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا گیا تھا تو جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام کو آپ نے حکم کر کے کیوں نہیں بلا لیا؟ پھر درخواست کی کیا ضرورت تھی اور درخواست پر بھی آپ کو یہ جواب دیا گیا کہ اللہ کے حکم کے بغیر فرشتے آپ کے پاس نہیں آسکتے۔

جب آپ کا معاملہ یہ ہے تو اولیاء اللہ کا معاملہ کیا ہوگا؟ کیا کوئی گمان کر سکتا ہے کہ اولیاء اللہ صاحب اختیار و تصرف ہوتے ہیں۔ مشکل کشا ہوتے ہیں؟ اور ملاحظہ کیجئے کہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کر لی، تو قریش نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کی سزا معاف کرانے کے لیے سفارش کرنے بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ کیا اللہ کے مقرر کردہ حدود میں سفارش کرتے ہو؟ پھر فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرے گی تو میں اس کے ہاتھ کاٹوں گا۔^(۱)

محبوب سبحانی کا زرین ارشاد

آخر میں حضرت شیخ محبوب سبحانی عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں، آپ فرماتے ہیں:

”حق تعالیٰ کے موحد بنو، اس کے دروازے سے مت ٹلو، اسی سے مانگو اور کسی سے مت مانگو، اسی سے مدد چاہو اور غیر سے مدد نہ چاہو، اسی پر بھروسہ کرو اور کسی پر بھروسہ مت کرو۔“^(۲)

ایک اور مقام پر مخلوق کا عاجز ہونا، بڑے بلوغ انداز میں بیان فرماتے ہیں:

(۱) مشکوٰۃ: ۲۱۴

(۲) خطبات غوثیہ مجلس ص: ۴۷-۳۶۸

”ان کو (اولیاء اللہ کو) معلوم و محقق ہو چکا کہ مخلوق عاجز و معدوم ہے، نہ ان کے ہاتھ میں ہلاکت ہے، نہ سلطنت، نہ ان کے قبضہ میں تو نگری ہے، نہ افلاس، اور نہ نقصان ہے، نہ نفع، ان (اولیا) کے نزدیک بجز خدائے برتر و بزرگ کے نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قدرت والا اور نہ جلانے اور مارنے والا، اس کے سوا نہ کوئی دینے والا ہے، نہ کوئی روکنے والا، نہ فائدہ یا نقصان پہنچانے والا۔“ (۱)

خطبات غوثیہ جو آپ کے مواعظ و مجالس کا مجموعہ ہے، اس میں بے شمار موقعوں پر حضرت رحمۃ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ مخلوق محتاج ہے۔ صرف اور صرف اللہ مختار کل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس مسئلہ زیر بحث میں قرآن و حدیث کا اور علما کا جو نقطہ نظر تھا، وہ تو آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اب اس مسئلہ میں جن لوگوں نے اس کے خلاف یہ عقیدہ قائم کیا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے طفیل میں حضرات اولیاء اللہ ہر چیز کی طاقت و قدرت رکھتے ہیں، وہ حاجت روا و مشکل کشا ہوتے ہیں اور کائنات میں تصرف کا حق تعالیٰ نے ان کو دے دیا ہے، ان کی اس غلطی کی وجہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

ان لوگوں کو جو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے وہ حضرات انبیاء کے معجزات اور حضرات اولیاء اللہ کی کرامات کی وجہ سے ہے، اس میں شک نہیں کہ معجزات انبیاء و کرامات اولیاء حق ہیں، مگر یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اختیار میں دے دیا ہے۔ بلکہ معجزات

اور کرامات دراصل اللہ ہی کے کام ہیں، جو نبی یا ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں، نبی یا ولی کو اختیار نہیں کہ جو معجزہ و کرامت چاہے خود دکھا دے۔ قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا:

﴿وَمَا رَمَيْتْ إِذْ رَمَيْتْ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ (الأنفak : ۱۷)

(جب کافروں پر آپ نے مٹی پھینکی تھی (جس سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ تمام کفار کی آنکھوں میں اس کے ریزے پڑ گئے اور وہ شکست کھا گئے) تو یہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔)

اس آیت کا مطلب علما نے یہ بتایا ہے کہ پھینکنے کا یہ کام کسباً تو آپ نے کیا؛ مگر حقیقت میں اس فعل کا خالق اللہ ہی ہے۔ (۱)

نیز قرآن میں ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾
(الرعد : ۳۸)

(کسی رسول کے اختیار میں نہیں کہ کوئی نشان (معجزہ) لے آئے؛ مگر خدا کے حکم سے۔)

معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم کے بغیر نبی اپنی مرضی و اختیار سے معجزہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کرامت کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ صحابہ سے بدر کے موقعہ پر جو عجیب قوت ظاہر ہوئی اور چند بے سروسامان صحابہ نے ہزار سے زائد ہتھیاروں سے لیس کفار کا مقابلہ کر کے ان کو قتل کر دیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ﴾ (الأنفak : ۱۷)

(۱) دیکھو: شرح فقہ اکبر ملا علی قاری: ۶۰، روح المعانی: ۱۸۵/۹، قرطبی: ۳۸۵/۱۷

(ترجمہ: تو تم نے انہیں قتل نہ کیا؛ بل کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا ہے۔)

مطلب یہ کہ یہ کرامت اللہ کا فعل ہے، جو تمہارے ہاتھوں ظاہر ہوا ہے۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”جب مسلمان جنگ بدر سے واپس ہوئے تو ان میں سے ایک کہتا تھا کہ میں نے فلاں کو قتل کیا، دوسرا کہتا تھا، میں نے فلاں کو قتل کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ اس قتل کو تم اپنے زور و قوت کی طرف نسبت نہ کرو کہ یہ درحقیقت اللہ کی مدد اور اس کی تقویت و تائید ہے۔“ (۱)

الغرض حضرات انبیا و اولیا سے جو معجزہ و کرامت ظاہر ہوتے ہیں، وہ حق ہیں، مگر ان کا تعلق اللہ کے فعل سے ہے، اور وہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

جب خدا چاہتا ہے تو ہوتا ہے، ورنہ نہیں ہوتا۔ لہذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انبیا و اولیا کو اللہ نے پورا اختیار دے دیا ہے، وہ جو چاہیں اب اپنی مرضی و اختیار سے کر سکتے ہیں۔

(۱) خزائن العرفان ص: ۲۵۹، تفسیر انفال آیہ: ۱۷

وسیلہ

حضرات انبیا و اولیا، صلحا و شہدا کا وسیلہ لینا شریعت میں کیا درجہ و مقام رکھتا ہے؟ یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے۔ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وسیلہ کی مختلف صورتیں ہیں اور ان میں سے ہر صورت کا حکم الگ ہے؛ نیز یہ بھی صاف ہو جانا ضروری ہے کہ وسیلہ کی کون سی صورت میں اختلاف ہے۔

وسیلہ کی پہلی صورت

وسیلہ کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات پیش کرتے ہوئے دعاء میں بزرگان دین و مقبولان الہی کا واسطہ دیا جائے اور یوں کہے کہ اے اللہ! ان مقبول بندوں کے طفیل و صدقہ میری یہ حاجت و مراد پوری فرما دے۔

یہ صورت دیوبندی حضرات و بریلوی حضرات دونوں کے نزدیک جائز ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ترمذی، حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک نابینا شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں بینائی جاتے رہنے سے پریشان ہوں اور میرے پاس کوئی رہبر نہیں ہے، آپ نے اس کو دعا سکھائی، جس میں یوں ہے، اے اللہ! میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سوال کرتا ہوں تیرے نبی محمد ﷺ کے واسطے سے جو نبی رحمت ہے۔ (۱)

(۱) شفاء السقام علامہ سبکی: ۱۶۶

حق سرورِ عالم: حق برترِ عالم محمدؐ، نیز حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
 ”تقویۃ الایمان“ میں فرماتے ہیں:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب خلیفہ حضرت تھانوی رحمہما اللہ ”تفسیر معارف القرآن“ میں فرماتے ہیں:

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ تمام علمائے دیوبند کا مسلک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) تقوية الايمان : ۸۵

(۲) معارف القرآن: ۱/۱۰۰

(۳) بحوالہ امداد الفتاوی: ۳۲۷/۶

(نبی اور ان کے بعد اولیائے اللہ سے وسیلہ پکڑنا جائز ہے، اس طرح کہ سوال تو اللہ تعالیٰ سے ہو اور نبی اور ولی کا وسیلہ لیا جائے۔) الغرض یہ صورت باتفاق جائز ہے، البتہ اہل حدیث جمہور سے ہٹ کر اس کو بھی ناجائز کہتے ہیں؛ مگر ان کا یہ کہنا بے دلیل ہے۔

وسیلہ کی دوسری صورت

دوسری صورت وسیلہ کی یہ ہے کہ خود بزرگان دین و مقبولانِ بارگاہِ الہی سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہماری مرادیں و حاجتیں پوری کرنے کے لیے دعاء کریں، بہ شریک وہ زندہ ہوں۔ اس صورت میں بھی اختلاف نہیں ہے، سب کے نزدیک یہ صورت جائز ہے اور زمانہ رسالت سے آج تک برابر لوگ حضراتِ علما صلحا بزرگان دین سے اسی طرح دعا کی درخواست کرتے آئے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ جو توسل کے مسئلہ میں نہایت متشدد و سخت گیر ہوئے ہیں، وہ بھی اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس کے جواز کے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے فتاویٰ میں اس پر تفصیل سے لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

”توسل کے لفظ سے تین معنی مراد لیے جاتے ہیں، ان میں سے دو معنی ایسے ہیں جن پر مسلمانوں کے درمیان اتفاق ہے، ایک جو کہ ایمان و اسلام کی اصل ہے، یہ کہ حضور پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے ذریعہ وسیلہ لے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی دعاء اور شفاعت سے وسیلہ لے۔ جو شخص وسیلہ کے ان دو معنوں میں سے کسی ایک کا انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے۔“ (۱)

بہ ہر حال یہ صورت بھی باتفاق مسلمین جائز ہے اور یہ صورت جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیلہ لینے کے لیے درست ہے، اسی طرح ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے نزدیک اولیاء صالحین سے وسیلہ لینے کے لیے بھی درست ہے۔^(۱)

وسیلہ کی تیسری صورت

وسیلہ کی تیسری صورت یہ ہے کہ بعد وصالِ بزرگانِ دین و اولیائے کرام سے، ان کی قبروں پر جا کر دعا کی جائے وہ ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مرادیں پوری کر دے۔ اس صورت کو علمائے دیوبند ناپسند کرتے ہیں۔ اور ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اولیائے اللہ کے وصال کے بعد قبروں میں ان کا سننا اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض علمائے سلف و صحابہ سماع موتی کے قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں اکابرینِ دیوبند کا مسلک وہ ہے، جو مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے عربی رسالہ ”تکمیل الحبور بسماع اهل القبور“ میں رقم کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

”ہر فرد اور ہر وقت میں سماع موتی کا اطلاق بے دلیل بات ہے،

اس طرح یکسر اس کا انکار، نصوص (مذکورہ بالا) کی مزاحمت ہے، اسی

لیے ہم نے فی الجملہ سماع موتی کے ثبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ فی الجملہ کا

مطلب یہ ہے کہ کسی وقت میں ہوگا، کسی وقت میں نہیں، کسی کے لیے

ہوگا، کسی کے لیے نہیں، بعض باتوں میں ہوگا، بعض میں نہیں۔“ (۲)

اور یہی بات احناف میں سے حضرت علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ نے

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱/۱۳۳

(۲) احکام القرآن عربی: ۱۶۸/۳

اپنی تفسیر روح المعانی میں بیان کر کے فرمایا ہے:

”وہذا الوجه هو الذي يترجح عندي“.

(یعنی یہ توجیہ میرے نزدیک رائج ہے۔) (۱)

نیز سلف صالحین سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بعد وصال بزرگوں سے ان کی مزاروں پر جا کر دعا کے لیے کہتے تھے۔ اس لیے دیوبند کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے اس صورت کو جائز قرار دے کر فرمایا ہے کہ ”پھر بھی احتیاط اجتناب میں ہے۔“ (۲)

ایک وضاحت

مگر یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وسیلہ کی تیسری صورت کے بارے میں جو لکھا گیا ہے۔ یہ بزرگوں اور اولیائے اللہ کے متعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار پر آپ سے دعاء کی درخواست علماء دیوبند کے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ آپ کا قبر اطہر میں زندہ ہونا اور زائر قبر کی بات کا سننا ثابت ہو چکا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے آیت:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾

(النساء: ۶۴)

(اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر، آپ کی

خدمت میں آتے پھر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اللہ کے

(۱) احکام القرآن: ۵۸

(۲) امداد المفتین: ۱۹۵

اس (آیت) کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعائے مغفرت کر دیں، اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حاجت کے زمانہ میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔ (۱)

اور علمائے دیوبند کا معمول رہا ہے کہ وہ روضہ اقدس پر حاضری کے موقعہ پر آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حاضری کے موقعہ پر آپ کے دربار میں جو منظوم نظم پیش کیا تھا۔ اس میں یہ اشعار بھی ہیں:

فانظر الى ظفر قد جاء معذراً★والطف بصب كئيب هائم شفق

واستغفر الله لي حتى تجاوز عن ☆ زناات هوت بالجهل في الزلق

(ظفر کی طرف نظر کرم کیجئے کہ وہ عذر خواہ ہو کر آیا ہے اور اس عاشق

پر جو غمگین پیاسا اور خوف زدہ ہے، لطف و کرم کیجئے اور میرے لیے اللہ

سے استغفار کیجئے تاکہ وہ میرے نفس کی خطاؤں اور گناہوں کو معاف

کرے جو جہالت سے صادر ہوئے ہیں۔)

الغرض علماء دیوبند کا نقطہ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی

آپ کی مزار پر حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرنے کا جواز ہے۔ البتہ آپ کے علاوہ

دوسرے بزرگوں کے حق میں اس صورت وسیلہ کو احتیاط کے خلاف کہتے ہیں، کیوں کہ صحابہ و سلف سے اس کا معمول منقول نہیں ہے۔

چوتھی صورتِ وسیلہ

وسیلہ کی چوتھی صورت وہ ہے جو آج عوام الناس میں معروف و مروج ہے اور بریلوی حضرات بھی اس کی تائید و توثیق فرماتے ہیں اور عوام کو اس صورت پر کار بند ہونے اور رہنے کی تاکید بھی فرماتے ہیں، وہ یہ ہے کہ خود اولیائے اللہ و بزرگانِ دین سے اس خیال سے اپنی مرادیں مانگے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دربار تک بلا واسطہ رسائی نہیں پاسکتے، جیسے دنیوی بادشاہوں تک بغیر واسطہ و وسیلہ رسائی نہیں ہو سکتی؛ لہذا خدا کے بجائے انہی اولیائے کرام سے مانگا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ نے اپنی قدرت کا ایک حصہ ان کو دے دیا ہے؛ لہذا وہ اس قدرت سے ہماری مرادیں پوری کر دیں گے۔ اس صورتِ وسیلہ کو علمائے دیوبند صحیح نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ اس میں دو غلطیاں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان لوگوں نے اللہ کے دربار کو دنیوی بادشاہوں کے درباروں کی طرح سمجھ لیا ہے کہ جس طرح دنیوی بادشاہوں کے دربار میں رسائی کے لیے مختلف درمیانی لوگوں کا واسطہ چاہئے۔ اسی طرح اللہ کے دربار سے حاجت براری کے لیے بھی اولیائے اللہ کا وسیلہ چاہئے۔ یہ دو وجہ سے غلط ہے، اولاً اس لیے کہ اسلام نے اپنی حاجات کے لیے بلا واسطہ اللہ ہی کو پکارنے اور اسی سے مدد چاہنے کی تعلیم دی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے مضمون ”مشکل کشا“ کے تحت ہم نے ثابت کر دیا ہے۔

نیز قرآن میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ

الذَّاعِ إِذَا دَعَانِ. الخ ﴿ (البَقَرَةُ: ۱۸۶)

(اے نبی جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں (کہ میں دور ہوں یا نزدیک) تو فرما دیجئے کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔)

اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ انسان کے قریب ہے اور ہر پکارنے والے کی آواز سنتا ہے۔ لہذا اسی سے ہر بندہ مانگے، سوال کرے اور اسی کو پکارے۔

دوسرے اس لیے کہ دنیوی بادشاہوں کے پاس واسطے کی ضرورت اس لیے ہے کہ بادشاہ ہر کسی کی بات خود سن نہیں سکتا۔ نیز سارے لوگ اس کے پاس جمع ہو جائیں تو خود بادشاہ کو بھی بشریت کے تقاضے سے پریشانی ہو جائے۔ تو یہ بادشاہ اپنی کمزوری کی بناء پر واسطے رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ کی ذات تو ہر کمزوری سے پاک ہے۔ وہ ہر ایک کی ہر جگہ سے سنتا ہے اور ساری دنیا بھی مل کر اللہ کو بیک وقت پکارے تو اسے ہر ایک آواز کو ممتاز طریقے سے سننے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی۔ تو ایسے خدا کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرنا کونسی عقلمندی ہے؟

(۲) دوسری غلطی اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس طرح دنیوی حکومتوں میں بعض اختیارات ماتحت افسروں اور گورنروں کو بادشاہ کی طرف سے مل جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ افسر و گورنر اپنے اس اختیار کو استعمال میں لا کر زیر اختیار معاملات میں خود ہی فیصلہ کرتے ہیں اسی طرح اللہ نے اپنے نبیوں و ولیوں کو کچھ اختیارات دے دیے ہیں اور وہ اس کی بنا پر کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دو وجہ سے غلط ہے۔

ایک تو اس لیے کہ ہم نے اوپر ”مشکل کشا“ عنوان کے تحت دلائل سے واضح

کر دیا ہے کہ اللہ نے ایسا اختیار نہ نبی کو دیا ہے، نہ ولی کو۔ لہذا یہ بات من گھڑت ہے۔ جب خدا خود ہی بتائے کہ کسی کو اختیار و قدرت نہیں۔ سارا اختیار مجھ ہی کو ہے تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اللہ کے اختیارات مخلوق کو تقسیم کر کے اپنی فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ کریں؟

دوسرے اس لیے کہ دنیا کے بادشاہوں میں یہاں یہ تقسیم مناصب و تفویض اختیار کا طریقہ اس لیے ہے کہ یہ بادشاہ دوسروں کے محتاج ہیں خود کچھ نہیں کر سکتے، لہذا اپنا عجز چھپانے کے لیے ایسا کرتے ہیں؛ مگر اللہ کی ذات تو کسی کی محتاج نہیں۔ اس کو ان بادشاہوں پر قیاس کرنا نری جہالت ہے۔

غرض یہ صورت وسیلہ اصول اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے علماء دیوبند اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

آیت وسیلہ کی تفسیر

بعض لوگ جو وسیلہ کی اس غلط صورت کے حامی ہیں، وہ آیت وسیلہ سے اپنے مطلب پر دلیل لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ آیت یہ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾

(المائدة : ۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو قرآن میں وسیلہ تلاش کرنے کا حکم ہے اور عوام بے چارے صرف لفظ وسیلہ سن کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے مراد یہی صورت ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن میں صرف یہی تو فرمایا کہ وسیلہ تلاش کرو۔ جب وسیلہ کی کئی صورتیں ہیں تو ان میں سے یہاں کون سی صورت مراد ہے؟ اس کو کیوں

نہیں پوچھا جاتا، جب اور بھی صورتیں وسیلہ کی ہیں اور ان کے جائز ہونے پر اتفاق بھی ہے، تو یہاں اسی کو مراد لینا چاہیے۔ دوسرے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس آیت میں علماء تفسیر نے نیکیاں مراد لی ہیں، یعنی بندہ اپنی عبادات و نیکیوں کے ذریعہ اللہ سے تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جمہور علماء اس کا یہی مطلب لیتے ہیں جیسا کہ روح المعانی، قرطبی وغیرہ میں ہے۔

حاصل یہ کہ بندہ اللہ سے ڈرے اور اللہ سے قرب حاصل کرنے کے لیے نیکیوں میں لگے۔ یہی اس کے لیے وسیلہ ہے۔ کہاں یہ وسیلہ اور کہاں وہ جس میں خلاف شریعت امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

عوام میں وسیلہ کی بنیاد پر جہالت

آج عوام میں وسیلہ کی بنیاد پر جو خرافات و جہالت کی باتیں پائی جاتی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، مزاروں پرندروں، نیاز، عرس و فاتحہ، بزرگوں کو پکارنا، ان کو سجدے کرنا وغیرہ وہ سب اس وسیلہ کی غلط صورت کو دل میں جمانے کا نتیجہ ہے۔

شفاعت

نبی کریم ﷺ، اولیائے اللہ، صالحین و شہدائے کرام کا شفاعت کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر زمانے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق رہا ہے۔ صرف ایک گمراہ فرقہ معتزلہ گزرا ہے، جس نے شفاعت سے انکار کیا ہے، مگر وہ بھی رفع درجات کے لیے شفاعت کے قائل ہیں۔

دیوبندی علما اور بریلوی علما دونوں اپنی اپنی کتابوں میں بڑے اہتمام سے اہل سنت کا یہ عقیدہ پیش کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء، صلحا و شہداء، علما و حفاظ کرام، اپنے اپنے درجہ و مرتبہ کے لحاظ سے گنہ گاروں اور عام مسلمانوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

مسئلہ شفاعت ایک اتفاقی مسئلہ

چنانچہ یہاں دیوبندی علما میں سے ایک کا اور بریلوی علما میں سے ایک کا حوالہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دیوبندی علما میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کے مشہور و معروف خلیفہ مرشدی حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”تعلیمات اسلام“ میں لکھتے ہیں:

”آپ (نبی کریم ﷺ) قیامت کے روز خدا تعالیٰ کی اجازت سے گنہ گاروں کی بخشش کی سفارش کریں گے۔ اسی لیے آپ کو شفیع المذنبین کہا جاتا ہے۔ آپ کی سفارش قبول کی جائے گی اور

کافر و مشرک کے سوا سب کی سفارش ہوگی۔ آپ کے علاوہ دیگر انبیاء و اولیاء و شہداء صلیحاً بھی سفارش کریں گے؛ مگر بلا اجازت کوئی سفارش نہ کرے گا۔“ (۱)

بریلوی عالم مولانا امجد علی رضوی صاحب ”بہار شریعت“ میں فرماتے ہیں:

”قیامت کے دن مرتبہ شفاعت کبریٰ حضور کے خصائص سے ہے۔“ (۲)

بہر حال یہ طے شدہ ہے کہ شفاعتِ انبیاء و اولیاء صلحا و شہدا حق ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

نقطہ اختلاف کی وضاحت

البتہ اختلاف جو کچھ ہے وہ شفاعت کی صورت میں ہے، ایک شفاعت و جاہت ہوتی ہے کہ کوئی نبی یا ولی محض اپنی وجاہت و مرتبہ سے اللہ کی مرضی کے بغیر کسی کی شفاعت کرے، جیسے دنیوی بادشاہوں کے دربار میں وزیر و مشیر لوگ اپنے مرتبہ کی وجہ سے کسی کے حق میں سفارش کرتے ہیں اور بادشاہ کو اس خیال سے ان کی سفارش قبول کرنی پڑتی ہے کہ کہیں یہ لوگ باغی نہ ہو جائیں۔

دوسری شفاعت محبت کہ محبوب کسی کی سفارش کرے اور محبت کو محض محبت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے اس کی سفارش قبول کرنا پڑتا ہے۔

تیسری شفاعت بالاذن یعنی اجازت پا کر سفارش کرنا۔

(۱) تعلیمات اسلام حصہ اول ص: ۶۲

(۲) بہار شریعت: ۱۴۷

لہذا انبیاء اولیاء جو شفاعت کریں گے وہ نہ شفاعت و جاہت ہوگی اور نہ شفاعتِ محبت؛ بل کہ وہ تیسری شفاعت ہوگی جو اللہ کی اجازت و مرضی سے ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کسی کی وجاہت و محبت سے مجبور نہیں ہوتا

﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ﴾

”تمہارا یہ بیٹا غیر صالح اعمال کی وجہ سے تمہارا بیٹا کہلانے کا مستحق

نہیں، آپ کو جس بات کا علم نہیں اس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کیجئے۔“

غور کیجئے کیا حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَام کو اللہ کے نزدیک وجاہت و مقام محبوبیت حاصل نہ تھا؟ کہ اللہ نے ان کی شفاعت کو رد کر دیا۔ بے شک وجاہت بھی حاصل تھی محبوبیت بھی حاصل تھی؛ مگر یہ وجاہت و محبوبیت اللہ کو مجبور نہیں کر سکتی؛ بل کہ یہ وجاہت و محبوبیت جو ان کو یا ان کے علاوہ اور انبیا کو حاصل ہے، وہ محض اللہ کی عنایت و رحمت ہے۔ اس کو دنیا کی وجاہت و محبوبیت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

اور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت ابراہیم عَلَيْهِ السَّلَام اللہ کے کتنے محبوب اور اللہ کے نزدیک کس قدر مرتبہ والے تھے؛ مگر جب انہوں نے اپنے باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی سفارش کی تو اللہ نے قبول نہ فرمائی اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا:

”حضرت ابراہیم عَلَيْهِ السَّلَام نے جو اپنے باپ کے حق میں مغفرت کی سفارش کی تھی۔ یہ اس وجہ سے تھی کہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو وہ اس سے بری ہو گئے۔“ (۱)

نیز شفیع اعظم حضرت محمد صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے حضرت ابراہیم عَلَيْهِ السَّلَام کی اقتدا میں اپنے چچا ابوطالب کے لیے استغفار کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

”نبی یا مسلمانوں کو لائق نہیں کہ مشرکین کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں اگرچہ وہ ان کے رشتہ دار ہی ہوں۔ جب کہ انہیں کھل گیا کہ وہ دوزخی ہیں۔“ (۲)

(۱) توبہ: ۱۱۴

(۲) توبہ: ۱۱۳

مولانا نعیم الدین مراد آبادی اس کا شان نزول یہی بتاتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا کہ میں تمہارے لیے استغفار کروں گا جب تک کہ مجھے ممانعت نہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ممانعت فرمادی۔ (۱)

یہ معلوم و مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ کوئی اللہ کو محبوب ہے نہ اللہ کے نزدیک ذی وجاہت؛ مگر آپ کے چچا کے حق میں اللہ نے آپ کی سفارش قبول نہ کی؛ بل کہ خود سفارش کرنے سے بھی روک دیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شفاعت و سفارش، وجاہت و محبوبیت کی وجہ سے قابل قبول نہ ہوگی؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کی وجہ سے مقبول ہوگی۔

شفاعت، اجازت پر موقوف ہے

اوپر یہ ثابت ہو گیا کہ محض وجاہت و محبوبیت سے سفارش نہ ہوگی اور ہوگی تو مقبول نہ ہوگی؛ بل کہ اللہ کی اجازت و مرضی سے ہوگی۔ اس مضمون پر قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں یہاں صرف دو آیات نقل کرتا ہوں۔ ایک جگہ فرمایا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ (البقرة: ۲۵۵)

(کون ہے جو اللہ کے اس سفارش کرے بغیر اس کی اجازت کے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ﴾ (يونس: ۳)

(کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس (اللہ) کی اجازت کے بعد۔)

ان سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہوگی، کوئی سفارش

نہ کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن سارے انبیا بھی سفارش کرنے سے گھبرائیں گے اور حضرت شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوگوں کو بھیجیں گے۔ اور آپ بھی سجدہ میں پڑ کر اجازت طلب کریں گے۔ جب اجازت مل جائے گی تو سفارش کریں گے۔ (بخاری وغیرہ) اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔

شفاعت کس کے لیے ہوگی؟

پھر یہ سفارش و شفاعت بھی صرف اس کے لیے ہو سکے گی۔ جس کے لیے اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک مجرم بادشاہ کے دربار میں لایا گیا اور بادشاہ اس مجرم کو خود معاف کر دینا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ ہمیشہ حکومت کا خیر خواہ رہا ہے یا بادشاہ کا مطیع فرمانبردار رہا ہے۔ اب بادشاہ اپنے وزرا و مشیرین کی طرف دیکھ کر کہتا ہے کہ بتاؤ! اس مجرم کو معاف کر دیا جائے؟ وزرا و مشیرین بادشاہ کا اشارہ سمجھ جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ حضور! اس کو معاف کر دیا جائے، یہ سفارش بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ اسی طرح جس کے حق میں اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت، معافی کی ہوگی اللہ کا اشارہ پا کر شفاعت کی جائے گی۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ﴾ (سَبَّحَا: ۲۳)

(اس دن اللہ کے پاس شفاعت کام نہ آئے گی مگر اس کو جس کے

لیے وہ اجازت دے۔) (۱)

یہ مضمون اور آیات میں بھی آیا ہے۔ مثلاً: انبیاء: ۲۸، طہ: ۱۰۹، زخرف: ۸۶، نجم: ۲۶۔ غرض یہ کہ شفاعت کے لیے ایک تو یہ ضروری ہے کہ اللہ کی اجازت ہو، دوسرے یہ کہ شفاعت اسی کے لیے نفع دے گی جس کے لیے اللہ کی مرضی ہو اور اللہ کی مرضی

اختتام

الحمد للہ کہ دیوبندیت و بریلویت کے جن اہم اختلافی مسئلہ پر کلام کرنے کا ارادہ تھا، وہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، دلائل کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

میں تمام ناظرین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ تنگ نظری و تعصب سے دور ہو کر، نہایت وسیع القلمی سے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کریں، اسی لیے ہم نے دلائل کو اسی سادہ طرز پر پیش کیا ہے، جو قرآن و حدیث میں اختیار کیا گیا ہے۔ علمی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے پوری طرح پرہیز کیا ہے۔ کہ ان سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ و رسول نے قرآن و حدیث میں سادگی کے ساتھ ”عقائد“ کی تعلیم و تفہیم کی ہے تاکہ موٹی سے موٹی عقل والا بھی ان کو باسانی سمجھ لے۔ اسی طرز کو اختیار کر کے ہمیں بھی صحیح راستہ مل سکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو راہ حق کا رہبر بنائے اور قرآن و حدیث کا سچا پیرو بنائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریظ

حضرت مولانا مہربان علی صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ
استاذ مدرسہ عربیہ امداد العلوم ہر سولی مظفرنگر

نحمدہ ونصلی علی الرسول الاکرم:

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور صاف ستھرے ماحول پر منکرات و محدثات کا گرد
وغبار بھی آکر کبھی کبھی گرتا رہتا ہے، اگر اس کو اہل علم اپنی خداداد صلاحیت اور دینی علم
کی حرارت سے دور نہ کرتے رہیں تو وہ رفتہ رفتہ تہ بہ تہ جم کر غلاف کی حیثیت لے
لیتا ہے اور دین حنیف کی اصلی صورت پوشیدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ماہ مبارک رمضان شریف میں بھی کچھ خود ایجاد باتیں تقریباً ہر جگہ پیدا ہو گئی
ہیں، جن سے اصلی دین کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، واعظین، خطباء اور اصحابِ قلم کا
فریضہ ہے کہ بلا خوف لومۃ لائم امت کو صراطِ مستقیم سے آگاہ کرتے رہیں اور ”بھیڑ
کی صورت میں بھیڑیے“ کو پنپنے کا موقع نہ دیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں مولف سلمہ کو کہ انھوں نے جس طرح دیگر
بدعات و خرافات پر قلم اٹھایا اور کامیابی سے ہم کنار ہو گئے، رمضان المبارک کے
منکرات پر بھی خاصا اور اہم مواد جمع کر دیا۔

میں نے اس کا مسودہ اول سے آخر تک دیکھا ہے، سب مدلل اور محمول ہے۔ حق تعالیٰ اس رسالہ سے امت مسلمہ کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر استفادہ کی توفیق نوازیں اور مولانا کے زور قلم میں ترقی عطا فرمائیں۔

فقط

۱۰/ رجب ۱۴۱۲ھ

احقر مہربان علی بڑو توئی

(مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہر سولی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ مؤلف

اسلام دشمن عناصر یا جاہل و بے دین لوگوں نے دین و شریعت میں جو رخنہ اندازیاں کی ہیں، ان میں سب سے کامیاب وہ ہیں جو دین کے نام پر بدعات و خرافات کی شکل میں ہوئی ہیں۔ ان بدعات نے دین کا اصلی و حقیقی حلیہ ہی نہایت بے دردی کے ساتھ بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام بدعات و خرافات کے پلندے کے ساتھ کسی غیر مسلم کے سامنے دین کو پیش کیا جائے تو بلاشبہ وہ قطعاً اس سے متاثر نہ ہوگا، جبکہ اصلی و حقیقی دین وہ عجیب تاثیر و کیمیا اثر شئی ہے جو سب ہی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی قبول کرتا ہے، کوئی عناد و تعصب سے قبول نہیں کرتا ہے۔

اور یہ بدعات و خرافات جن کو دین کا لیبل لگا کر پیش کیا جاتا ہے، ان سے کون سا شعبہ دین خالی ہے؟ ہر شعبہ و ہر باب میں ان کو داخل کرنے والوں نے داخل کر کے دین اسلام کے اصلی چہرے کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، انہی میں سے وہ بدعات بھی ہیں جو رمضان اور عید کے موقع پر اپنائے جاتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ میں احقر نے ان بدعات و رسومات پر شرعی دلائل سے مفصل کلام کیا ہے جو رمضان اور عید سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس رسالہ کی ترتیب و تالیف کا داعیہ حضرت نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے پیدا ہوا جس میں فرمایا گیا ہے:

”جب میری امت میں بدعتیں پیدا ہو جائیں اور میرے صحابہ کو برا

کہا جانے لگے تو عالم کو چاہئے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے جو ایسا نہ کرے گا

اس پر خدا اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔“ (۱)

خیال ہوا کہ اپنی مقدور بھر کوشش سے رمضان و عید سے متعلق غیر شرعی امور

و رسوم کی تردید کروں کہ رمضان جیسے مبارک مہینہ میں اور عید جیسی نعمت کے موقعہ پر

ان سے اجتناب کیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقبول و مفید بنائے، ناظرین سے گزارش ہے کہ اپنی نیک

دعاؤں میں فراہم فرمائیں اور سہو غلطی دیکھیں تو مطلع فرما کر ماجرہ ہوں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

خادم مدرسہ مسیح العلوم

۳۰/ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تراویح پر اجرت کا مسئلہ

آج کل تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینے دینے کا رواج عام ہو گیا ہے اور اب یہ رسم اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس معاملے کو برا تو کیا مستحسن و محبوب سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ ناجائز اور فبیح رسم ہے؛ کیونکہ عبادت پر اجرت لینے دینے کو شریعت اسلامیہ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں مثلاً:

(۱) حضرت ابوذر داء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

« مَنْ أَخَذَ قَوْسًا عَلَى تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ قَلَدَهُ اللَّهُ قَوْسًا مِّنْ نَّارٍ »

”جو شخص قرآن کی تعلیم پر (بطور اجرت) کمان لے تو اللہ تعالیٰ اس

کے گلے میں آگ کی کمان ڈالیگا۔“ (۱)

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں سوائے عبد الرحمن بن یحییٰ رحمۃ اللہ کے۔

بیہقی رحمۃ اللہ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، مگر ابو حاتم، ابن حبان رحمہما اللہ جیسے ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے۔ (۲)

(۱) اعلاء السنن: ۱۶/۱۶۶

(۲) دیکھو: تہذیب التہذیب: ۶/۲۹۲

لہذا یہ روایت حسن ہوگی۔

(۲) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

« مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ يَتَأَكَّلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وَوَجْهُهُ عَظِيمٌ لَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ. »

(جو شخص اس لیے قرآن پڑھتا ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں
سے لیکر کھائے تو قیامت میں اس کو اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کا
چہرہ صرف ہڈی ہی ہڈی ہوگا، اس پر گوشت نہ ہوگا۔) (۱)

(۳) امام احمد اسحاق ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ نے حضرت عبدالرحمن بن شبلی
رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھو اور
اس کے ذریعہ مت کھاؤ۔ (۲)

ان روایات اور اس معنی کی دیگر روایات کے پیش نظر فقہائے احناف نے
عبادات پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:
”والاصل عندنا ان كل طاعة يختص بها المسلم لا
يجوز الاستيجار عليه.“ (۳)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ ہر وہ عبادت جو مسلمان کے ساتھ
خاص ہے، اس پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے۔)
فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”شرح وقایہ“ میں ہے:

(۱) شعب الایمان: ۵۳۲/۲

(۲) الدراية مع الهداية: ۲۸۷/۳

(۳) ہدایہ: ۲۸۷/۳

”والاصل عندنا انه لا يجوز الاجارة على الطاعات ولا

على المعاصي.“ (۱)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ عبادات اور معاصی پر اجارہ جائز نہیں۔)

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ اصل و ظاہر مذہب میں عبادات و طاعات پر اجرت لینا دینا جائز نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تراویح اور اس میں تلاوت کلام اللہ دونوں عبادات ہیں، لہذا اس پر بھی اجرت لینا دینا جائز نہ ہوگا۔ چنانچہ اکابر علماء و فقہانے اس کو صاف و صریح الفاظ میں ناجائز قرار دیا ہے۔

ہم یہاں چند اکابر کے فتاویٰ نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا دلائل کی بنا پر حضراتِ علمائے تراویح اور ختم قرآن پر اجرت کونا جائز قرار دیا ہے:

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”رمضان شریف میں جو قرآن پاک تراویح و نوافل میں سنایا جاتا

ہے، اس کی اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں۔ اور آمدنی مساجد سے یہ

خرچ اور بھی زیادہ برا ہے، بلکہ متولی پر اس کا ضمان آئے گا۔“ (۲)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے ایک طویل فتویٰ کے

آخر میں فرمایا ہے:

”حاصل جواب یہ ہوا کہ رواج مذکور فی السؤال (یعنی حافظ کو دینے

کا رواج) محض باطل اور مخالف شرع ہے۔ اور ایسا ختم ہرگز موجب

ثواب نہیں؛ بل کہ موجب معصیت ہے۔“ (۳)

(۱) شرح وقایہ: ۲۹۹

(۲) فتاویٰ رشیدیہ:

(۳) امداد الفتاویٰ: ۴۸۱/۱

مولانا مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اجرت دینا اور لینا قرآن کریم کے سننے اور پڑھنے کے لیے جائز نہیں اور اس میں کسی کو ثواب نہیں ملتا، نہ پڑھنے والے کو، نہ سننے والے کو اور سنتِ ختم قرآن اس طرح پر ادا نہیں ہوتی۔“ (۱)

مولانا شفیع صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”تراویح میں ختم قرآن پر اجرت مقرر کر لینا خواہ صراحۃً ہو، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں یا بطور عرف و عادت ہو جیسا کہ عموماً آج کل رائج ہے، دونوں صورتوں میں جائز نہیں۔“ (۲)

حضرت مولانا محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اجرت مقرر کر کے امام کو تراویح کے لیے بلانا مکروہ ہے۔“ (۳)

ان تمام عبارات سے ثابت ہوا کہ تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا اور دینا ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک صریح روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آئی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے ”اعلاء السنن“ میں بحوالہ ”محلی“ یہ روایت نقل کی ہے:

”أَنَّ عَمَّارَ ابْنَ يَاسِرٍ أَعْطِيَ قَوْمًا قَرَأُوا الْقُرْآنَ فِي رَمَضَانَ فَبَلَغَ ذَلِكَ عُمَرَ فَكَرِهَهُ فَقَالَ عُمَرُ أَوْ يُعْطَى عَلَى كِتَابِ اللَّهِ ثَمَنًا؟“

(۱) عزیز الفتاوی: ۶۶۳

(۲) امداد المفتین: ۳۶۳

(۳) فتاوی محمودیہ: ۳۵۱/۲

(حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو جنہوں نے رمضان میں قرآن پڑھا تھا کچھ دیا، یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو آپ نے اس کو برا سمجھا اور ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ پر بھی کچھ قیمت دی جاتی ہے؟“ (۱)

اس روایت سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان میں ختم قرآن پر کچھ دینے کو مکروہ و برا سمجھا، حالاں کہ یہاں دینے اور لینے والے کا مقصد اجرت نہیں تھا اور نہ ہی اس کا وہاں کوئی عرف و رواج تھا۔ خیال فرمائیے کہ جہاں بطور اجرت دینا اور لینا ہوتا ہو اور اس کا رواج ہو، وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا فیصلہ ہوگا؟ الغرض تراویح میں ختم قرآن پر اجرت سراسر ناجائز ہے اور اسی وجہ سے حضرات علما نے بلا اجرت تراویح پڑھانے والے حفاظ نہ ملنے کی صورت میں غیر حافظ کے پیچھے ”الم تر کیف“ سے تراویح پڑھ لینے کا فتویٰ دیا ہے۔

چنانچہ مرشدی مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم اپنی تصنیف ”تعلیمات اسلام“ میں فرماتے ہیں:

”اگر حافظ صاحب کچھ لیکر قرآن شریف سنائیں تو ہرگز نہ سنیے! بلکہ ”الم تر کیف“ سے کوئی ناظرہ خواں تراویح پڑھا دے، یہ بہتر ہے کچھ لے کر قرآن شریف سننے سنانے سے، یہ قرآن شریف کو بیچنا ہے اور یہ حرام ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ (۲)

(۱) اعلیٰ السنن: ۱۶/۱۶۹

(۲) تعلیمات اسلام: ۱۰۰/۲

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ پھر علما و فقہا نے پنجوقتہ نمازوں کی امامت، تعلیم قرآن و حدیث و فقہ، اذان و وعظ وغیرہ عبادات پر اجرت کو کیوں اور کیسے جائز قرار دیا ہے؟ اور ان پر اجرت اگر جائز ہے تو تراویح پر کیوں ناجائز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات فقہا نے ان عبادات پر اجرت کو ضرورت شرعی کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ ان چیزوں پر اجرت نہ دی جائے تو یہ اہم فرائض و شعائر اسلام ضائع ہو جائیں گے۔ کیوں کہ یہ روزانہ کی ضرورت کی چیزیں ہیں اور ان میں لگنے والے کو مستقل اور اچھا خاصا وقت قربان کرنا پڑے گا اور اپنے آپ کو ان کی خاطر محبوس کرنا ہوگا۔ پس اگر ان حضرات کا وسیلہ معاش کچھ نہ ہوگا تو بھلا وہ ان چیزوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس لئے بضرورت شرعی اس کو جائز قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف تراویح فرض و واجب نہیں اور نہ ہی تراویح میں ختم قرآن فرض و واجب ہے؛ بلکہ مستحب اور زیادہ سے زیادہ سنت ہے، پھر یہ سال میں ایک ماہ کا عمل ہے اور اس ماہ میں بھی صرف تھوڑا سا وقت اس کے لئے لگتا ہے، مستقل وقت دیکر محبوس ہو جانے کی اس میں نوبت نہیں آتی، لہذا یہ شرعی ضرورت کے دائرہ سے خارج ہے۔ اس لئے اس کو اصل حکم کے مطابق حرمت کے حکم میں رکھا گیا ہے۔ اس تفصیل سے دونوں قسم کی عبادات میں فرق واضح ہو گیا۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل علماء کی عبارات کے ساتھ میرے رسالے ”رمضان اور جدید مسائل“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (۱)

اس کے بعد اس سلسلے کے کچھ شبہات کا جواب دے دینا ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ختم قرآن پردی جانے والی رقم اجرت نہیں ہدیہ ہے۔ مگر یہ سراسر غلط

ہیں کیوں کہ ہدیہ وہ ہوتا ہے جو بلا عوض محض طیب خاطر سے دیا جائے اور اس میں جبر و اکراہ نہ ہو اور تراویح کی اجرت کے مسئلہ میں جبر و اکراہ بھی ہوتا ہے اور عوض کا شبہ بھی موجود ہے۔ لہذا اس کو ہدیہ قرار دینا غلط ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اجرت مقرر کرنے اور شرط کرنے سے یہ ناجائز ہوتا ہے، اگر شرط نہ لگائے تو جائز ہے۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ ”المعروف کالمشروط“ (۱) کہ جو عرف میں رائج ہو وہ مشروط کی طرح ہے۔ لہذا جب تراویح پر لینے دینے کا رواج ہو گیا تو اب بلا شرط لینا بھی ناجائز ہوگا، جیسے شرط کر کے لینا ناجائز ہے۔

بعض نے یہ حیلہ بھی بیان کیا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں میں سے ایک دو وقت کی امامت بھی تراویح کے ساتھ کر لے تو اجرت لینا جائز ہے؛ مگر یہ بھی لغو ہے، کیوں کہ کسی بھی چیز کا صحیح و غلط ہونا اس کے مقصد کے لحاظ سے ہوتا ہے اور یہاں چوں کہ مقصد تراویح ہے نہ کہ امامت، اس لیے یہاں امامت کا اعتبار نہ ہوگا؛ بلکہ تراویح کا ہوگا اور تراویح پر اجرت لینا ناجائز ہے۔ لہذا یہ تاویل بھی غلط ہوگئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ہم اس عبادت کی اجرت نہیں لیتے ہیں؛ بلکہ اتنے وقت تک مجبوس ہو جانے کا نفقہ لیتے ہیں۔ مگر اس کا جواب بقول حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہے کہ:

”یہ توجیہ (تاویل) جس کی مخصوص ہے صورت ضرورت کے ساتھ

اور جہاں ضرورت مذکورہ نہ ہو، وہاں یہ تاویل مقبول نہ ہوگی۔ ورنہ طاعت کی ایک فرد بھی باقی نہ رہے گی جس پر حرمت استیجار کا حکم کیا جائے۔“ (۲)

(۱) قواعد الفقہ: ۱۲۵

(۲) امداد الفتاوی: ۴۷۹/۱

حاصل یہ ہے کہ جس کی وجہ سے نفقہ ملنا اور اس کا جائز ہونا اس وقت ہے، جب کہ وہ کام ضروری ہو، اور تراویح اور اس میں قرآن کا ختم ضروری نہیں، لہذا یہ تاویل مقبول نہیں۔ غرض یہ کہ تراویح پر اجرت ناجائز ہے، اور اس کے جواز کی کوئی تاویل و توجیہ ممکن نہیں، لہذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

تہجد میں جماعت کا اہتمام

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض جگہ نماز تہجد کو باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس عمل کو مستحسن و پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دین و شریعت میں ایک جدید عمل اور بدعت ہے؛ کیوں کہ دور رسالت و صحابہ میں تہجد کو جماعت سے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ فضیلت اور ثواب حاصل کرنے میں رسول کریم ﷺ اور حضرات صحابہ سب سے آگے ہوتے تھے، اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز گھر میں گزارنا افضل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو نماز گھر میں گزاری جاتی ہے، اس میں اصل اخفا و افراد ہے یعنی تنہا گزارنا ہے، لہذا نوافل کو جماعت سے پڑھنا ان احادیث کے خلاف ہوگا۔ مثلاً:

(۱) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا:

« صَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّ أَفْضَلَ الصَّلَاةِ

صَلَاةُ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ. »

(اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو؛ کیوں کہ سب سے افضل

نماز آدمی کی وہ ہے جو گھر میں ہو، سوائے فرض کے۔) (۱)

(۱) رواہ النسائی بسند جيد وابن خزيمة اعلاء السنن: ۷/۷۷

(۲) حضرت عبد اللہ ابن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر میں نماز پڑھنے اور مسجد میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا:

« قَدْ تَرَى مَا أَقْرَبُ مِنْ بَيْتِي مِنَ الْمَسْجِدِ فَلَا أَنْ أُصَلِّيَ فِي بَيْتِي أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُصَلِّيَ فِي الْمَسْجِدِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَلَوةً الْمَكْتُوبَةِ. »

(تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد سے کس قدر قریب ہے، پھر بھی میں گھر میں نماز پڑھنے کو مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، مگر یہ کہ فرض نماز ہو۔) (۱)

ان احادیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز مسجد کے بجائے گھر میں گزارنا افضل ہے، وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت فرض نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور نفل میں اصل اخفاء اور انفراد ہے؛ کیوں کہ جو نماز اجتماع کے ساتھ ادا کرنا مشروع ہے، اس کا مسجد میں گزارنا افضل ہے، معلوم ہوا کہ جس کو گھر میں پڑھنا افضل ہے، اس میں جماعت نہیں ہے، لہذا غیر مشروع طریقہ پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ البتہ کبھی کبھی صرف دو یا زیادہ سے زیادہ تین آدمی بلا اعلان و تداعی کے جماعت سے نفل نماز ادا کر لیں تو فقہانے جائز لکھا ہے۔ باقی جماعت کثیر کے ساتھ اعلان و تداعی کے ساتھ باہتمام و انتظام پڑھنا بلاشبہ بدعت ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”ظاہر یہی ہے کہ نفل نماز میں جماعت غیر مستحب ہے۔ پھر اگر کبھی

کبھی اتفاقاً کر لی جائے تو مباح ہوگا (مستحب نہیں) اور اگر اس کو پابندی سے کیا تو یہ بدعت مکروہہ ہے؛ کیوں کہ یہ متواتر طریقہ کے خلاف ہے۔“ (۱)

حضرات علمائے دیوبند نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور تبلیغی جماعت کے اکابر علماء کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ رئیس التبلیغ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ اپنی مایہ ناز تصنیف ”امانی الاحبار شرح معانی الآثار“ میں فرماتے ہیں:

”در مختار میں ہے کہ رمضان کی وتر میں (جماعت) مستحب ہے۔ اور رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کی وتر میں اور نفل نماز میں تداعی کے ساتھ (جماعت) مکروہہ ہے۔“ (۲)

اس عبارت میں رمضان کے علاوہ کے الفاظ کا تعلق صرف وتر سے ہے، نفل سے نہیں جیسا کہ اس کی عربی عبارت سے ظاہر ہے۔ اہل علم کے لیے حضرت جی رحمۃ اللہ کی عربی عبارت بھی درج کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے:

” قال فی الدر وفی وتر رمضان مستحبة، وفی وتر

غیرہ وتطوع علی سبیل اللہ التداعی مکروہة۔“

اس میں ظاہر ہے کہ ”غیرہ“ رمضان کے علاوہ کا تعلق صرف وتر سے کیا گیا ہے، تطوع (نفل) سے نہیں؛ بل کہ نفل کو الگ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ ”لامع الدراری“ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

(۱) ردالمحتار مع در مختار: ۲۸/۲

(۲) امانی الاحبار: ۲۷۷/۲، در مختار کا حوالہ لکھونہ کہ امانی کا، یاسین

”میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ (جماعتِ نفل) پر علامہ ابن عابد بن شامی رحمۃ اللہ نے تفصیل سے کلام کیا ہے اور خلاصۃ الفتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ یہ (نفل کی جماعت) اگر کبھی اتفاقاً ہو تو جائز ہے، مکروہ نہیں اور اگر اس پر پابندی کریں تو بدعت مکروہہ ہے؛ کیوں کہ یہ متواتر طریقہ کے خلاف ہے۔“ (۱)

ہم نے یہاں اکابر و علما اور تبلیغی جماعت کے سرپرست علما میں سے دو جلیل القدر ہستیوں کو پیش کیا ہے، جنہوں نے نفل کی جماعت کا اہتمام اور اس پر پابندی کو مکروہ و بدعت قرار دیا ہے۔

اسی طرح بریلوی مسلک کے مشہور و مستند عالم مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ”بہار شریعت“ میں لکھا ہے:

”نوافل میں اور علاوہ رمضان کے وتر میں اگر تداویٰ کے طور پر ہو تو (جماعت) مکروہ ہے اور تداویٰ کے یہ معنی ہیں کہ تین سے زیادہ مقتدی ہوں۔“ (۲)

اگر کسی کو مزید علما و ائمہ کے فتاویٰ دیکھنے کا شوق ہو تو وہ ہمارا رسالہ ”جماعت تہجد کا شرعی حکم“ ملاحظہ کرے۔ اس میں ہم نے جماعت تہجد کا مکروہ و بدعت ہونا احادیث اور فقہ و فتاویٰ کی روشنی میں ثابت کیا ہے اور قدیم و جدید فقہاء کی عبارات کو مع حوالہ اس میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں اسی سے صرف ایک فتویٰ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کا نقل کرتا ہوں، آپ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں:

(۱) حاشیۃ لامع الدراری: ۹۵/۱

(۲) بہار شریعت: ۹۷/۳

”افسوس ہزار افسوس کہ بعض وہ بدعتیں جو دوسرے سلسلوں میں قطعاً نہیں ہیں، ہمارے طریقہ علیہ (نقشبندیہ) میں پیدا ہو گئیں ہیں، نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں، اطراف و اکناف سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑی جمعیتِ خاطر کے ساتھ نماز تہجد ادا کرتے ہیں، حالاں کہ یہ عمل مکروہ تحریمی ہے۔ بعض فقہانے جن کے نزدیک کراہت کی شرط تداعی (ایک دوسرے کو بلانا) ہے اور نفل کی جماعت کو مسجد کے ایک کونے میں جائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی تین آدمیوں سے زیادہ کی جماعت کو باتفاق مکروہ کہتے ہیں۔“ (۱)

اس مکتوب میں امام ربانی رحمۃ اللہ نے تہجد کی جماعت کو بدعت اور مکروہ تحریمی صریح الفاظ میں لکھ کر اس رسم پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ جن فقہانے نے اس کو بلا اعلان جائز کہا ہے، وہ بھی صرف تین آدمیوں تک کی جماعت کو جائز کہتے ہیں، اس سے زائد باتفاق مکروہ ہے۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد امام احمد رحمۃ اللہ کے اتباع میں سے علامہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے کئی فتاویٰ نظر سے گزرے، تو ان میں سے بھی ایک فتویٰ نقل کرنا مناسب معلوم ہوا، ایک تو اس لیے کہ اس سے امام احمد رحمۃ اللہ کا مسلک معلوم ہو جائے گا، دوسرے اس وجہ سے کہ بہت لوگ کعبۃ اللہ میں جماعت تہجد ہونے کا ذکر کرتے ہیں (جس کی احقر کو تحقیق نہیں) اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کو اہل عرب (سعودی والے) سب سے زیادہ مانتے ہیں اور ان کے فتاویٰ کی (۳۵) جلدیں خادم الحرمین شاہ فہد رحمۃ اللہ نے اپنے اہتمام سے طبع کرائی ہیں، تو

(۱) مکتوبات امام ربانی، مکتوب نمبر ۱۳۱ دفتر اول

اس کو پیش کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اہل عرب بھی جماعت کا اہتمام کرتے ہیں تو یہ خود ان کے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے فتویٰ کی وجہ سے غلط ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”با جماعت نفل نماز کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ اس کے لیے جماعت سنت ہے جیسے نماز کسوف، نماز استسقاء اور تراویح میں، پس یہ قسم وہ ہے جو ہمیشہ جماعت سے ادا کی جائے گی جیسا کہ سنت میں آیا ہے۔ دوسری قسم وہ نفل جس کے لیے جماعت مسنون نہیں، جیسے رات کی نماز (تہجد) اور سنت مؤکدہ نمازیں اور چاشت کی نماز، اور تحیۃ المسجد وغیرہ، پس ان کو اگر کبھی کبھی جماعت سے ادا کر لیا جائے تو جائز ہے؛ لیکن ان میں مستقل جماعت کرنا، غیر مشروع؛ بل کہ بدعت مکروہہ ہے، کیوں کہ نبی کریمؐ اور صحابہ و تابعین ان نمازوں کے لیے اجتماع و جماعت کی عادت نہیں رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی کبھی (اتفاق) قلیل جماعت کے ساتھ نماز نفل پڑھی ہے۔“ (۱)

بعض حضرات ان تمام فتاویٰ وفقہ کی عبارات کو پس پشت ڈال کر، جماعت تہجد پر دلیل کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کے عمل کو پیش کرتے ہیں کہ آپ رمضان میں تہجد جماعت سے ادا کرتے تھے؛ مگر غور کیجیے کہ خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے کبھی کسی کو اس کے لیے بلایا نہیں اور جب لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کے فعل کو لوگ حجت بنالیں گے تو فرمایا کہ میں ہی تو کرتا ہوں، کسی کو کہتا تو نہیں ہوں۔ (۲)

(۱) مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴۳/۴۱۳، ۴۳/۴۱۴

(۲) انوار الباری: ۹۱/۲

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کسی کو اس کے لیے کہتے نہیں تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے متعلق حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک وہی تھا جو جمہور علما امت کا ہے۔ اگر آپ کو ان علما سے اختلاف ہوتا تو سوال کرنے پر یہ فرماتے کہ مجھے ان علما سے اختلاف ہے اور میرے نزدیک جماعت تہجد جائز ہے؛ لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا، لہذا ہم یا تو ان کو معذور کہیں گے یا ان کے فعل کی تاویل کریں گے کہ آپ نے خانقاہ میں رہنے والوں کی عادت کے لیے بطور اصلاح ایسا کیا ہوگا۔ مگر ان کو لے کر مستقل مسلک بنالینا اور عوام کو اس پر جمع کرنا سراسر غلط ہے۔ حضرات علمائے دیوبند بزرگوں کے تفرد کو کس نظر سے دیکھتے اور اس سے کیا برتاؤ کرتے ہیں، اس کو حضرت حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سن لیجئے، فرماتے ہیں:

”ان (علمائے دیوبند) کے یہاں اصل اصول اتباع سنت ہے؛ لیکن معمولات مشائخ بھی جس حد تک غلبہ حال یا سکر کے دائرہ کے نہ ہوں، راہ تربیت میں بے اعتنائی و بے توجہی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ شریعت نہیں ہوتے کہ شرائع کی طرح ان کی تبلیغ و ترویج کو اسٹیج کا موضوع بنالیا جائے جس سے سنت نبوی جو اصل مقصد ہے غیر اہم ہو کر رہ جائے ان کے نزدیک طرق اولیاء کی تربیتی باتیں معاملات نفس ہیں، قانون عام نہیں کہ تبلیغی انداز سے ان کا عمومی پرچار کیا جائے۔“ (۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل غلبہ حال یا کسی معالجہ نفس کے لیے تھا تو وہ اپنی جگہ صحیح ہے؛ مگر اس کو سنت و شریعت سمجھنا اور عوام میں اس کا مظاہرہ و پرچار کرنا راہ اعتدال سے برگشتگی کی علامت ہے۔

مگر بائے افسوس کہ آج ہمارے علاقہ میں یہ رسم و بدعت اچھے اچھے دین داروں میں بھی پھیل رہی ہے۔ ان کو علما کے فتوے اور فقہاء کی عبارتیں اور احادیث کے مضامین دکھائے جائیں تو ان پیش کرنے والوں کو شیطان کہنے اور ان کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنے اور مارنے کی دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں اور بدعت مروجہ کے خلاف آواز اٹھانے کو فتنہ قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان کا شیطان کہنا، اور بدعت کے خلاف اقدام کو فتنہ قرار دینا، کیا حضرات فقہاء و علماء تک نہیں پہنچتا؟ ضرور پہنچتا ہے، کیونکہ پیش کرنے والا تو انھیں کے فتاویٰ اور عبارات پیش کر رہا ہے۔ اگر پیش کرنے والا مجرم ہے تو ان بدعت نوازوں کے پاس اس سے بڑے مجرم فقہاء و علماء ہوئے۔ اب یہ لوگ فیصلہ کریں کہ کس کے خلاف لب کشائی کر رہے۔ ان علما و فقہاء میں علامہ شامی، علامہ ابن نجیم، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی اعزاز الرحمن دیوبندی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ، فقہاء و علما ہیں۔ ان سب حضرات اور دوسرے حضرات کے فتاویٰ ہمارے رسالے ”جماعت تہجد کا شرعی حکم“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

شبینہ نماز کا حکم

بعض مساجد اور بعض گھروں میں شبینہ نماز کو بڑی اہمیت و حیثیت حاصل ہے اور اس کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فی نفسہ ایک دو یا چند راتوں میں قرآن شریف کو نماز میں ختم کرنا جائز ہے، مگر مروجہ شبینہ میں کچھ چیزیں ایسی شامل ہو گئی ہیں جن کی بنا پر مروجہ شبینہ کو حضراتِ علما نے مکروہ قرار دیا ہے۔

(۱) منجملہ ان چیزوں کے ایک یہ ہے کہ ختم کرنے کی فکر میں قاری صاحبان قرآن مجید کو عجلت کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سے قرآن مجید کی تلاوت صحیح نہیں ہوتی؛ بل کہ حروف کٹ جانے اور بے قاعدہ ادا کرنے کے سبب نہایت غلط ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کو ایسی عجلت سے پڑھنا کہ حروف کی تصحیح و تجوید کا خیال نہ رہے، نہایت غلط اور بے ہودہ بات ہے۔

(۲) حفاظ و قراء کا اس سلسلے میں فخر و نمود کا قصد بھی اس عمل کو کراہت کے درجہ میں لے آتا ہے۔

(۳) لمبی قرأت کی وجہ سے لوگ اس کو ایک بوجھ سمجھ کر، بے دلی و تنگدلی سے سنتے ہیں اور بعض جگہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ شبینہ نماز میں شروع سے شرکت نہیں کرتے، بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے یا آرام کرتے بیٹھے رہتے ہیں اور جب امام رکوع میں جاتا ہے تو فوراً دوڑ کر شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن مجید اور نماز دونوں سے لاپرواہی و غفلت بلکہ ایک طرح اعراض ہے۔

یہ سب عام مفاسد ہیں جو شبینہ نماز کے موقع پر مشاہدے میں آتے ہیں۔ پھر یہ نماز اکثر جگہ نوافل میں ہوتی ہے اور اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ نوافل میں جماعت مکروہ ہے، ان تمام عوارض کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس نماز کو کراہت سے خالی کسی طرح نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ علما نے انہی عوارض کی وجہ سے شبینہ متعارفہ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”جو ختم شبینہ ہمارے زمانے میں مروج ہے، سامعین پر گراں اور

بار ہوتا ہے، بعض سامعین صاحب خانہ کی طلب پر آتے ہیں، بعض

دوستوں سے ملنے آتے ہیں اور کوئی ایسا نہیں جو خوش دلی سے قرآن مجید ایک رات میں سننے والا ہو، الا ماشاء اللہ اور یہ بات کراہت کا سبب ہے۔ فقہانے جگہ جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے، علاوہ ازیں حفاظ اس قدر جلدی سے پڑھتے ہیں کہ حرکات و حروف میں خلل واقع ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ ختم شبینہ فی نفسہ امر مستحسن ہے؛ لیکن چوں کہ ہمارے زمانے میں مقتدیوں کی کراہت اور قرأت میں قاریوں کی عجلت کا سبب ہے، اس لیے کراہت سے خالی نہیں۔ (۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”بعض حفاظ لیاالی قدر میں یا کسی اور شب میں سب جمع ہو کر ایک یا کئی شخص مل کر قرآن ختم کرتے ہیں اور عرف میں اس کو شبینہ کہتے ہیں۔ اول تو بعض علما نے ایک شب میں قرآن مجید ختم کرنے کو مکروہ کہا ہے، مگر چونکہ سلف صالحین سے ایک روز میں ختم کرنا منقول ہے، اس لیے اس میں گنجائش ہے۔ مگر اس میں اور بہت سے مفاسد شامل ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے عمل شبینہ کا بطریق مروج ہونا بلا شک مکروہ ہے۔“

اس کے بعد حضرت نے بالتفصیل اس کے مفاسد گنائے ہیں جن کا خلاصہ یہاں درج ہے۔

- (۱) تجوید و ترتیل کا خیال نہ ہونا (۲) پڑھنے والوں میں ریا و تفاخر ہونا (۳) بعض جگہ نفل میں شبینہ کا ہونا جو کہ مکروہ ہے (۴) اکثر سامعین کا اس کو گراں و بار محسوس کرنا اور آداب سماعت میں لاپرواہی کرنا؛ بل کہ اعراض کی سی شکل بنانا وغیرہ۔ (۲)

(۱) مجموعۃ الفتاوی ج: ۱/ ۱۷

(۲) اصلاح الرسوم: ۱۶۶-۱۶۸

حضراتِ علما کی ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ فی نفسہ شبینہ کے مستحسن ہونے کے باوجود اس میں شامل مفاسد اس کو مکروہ ٹھہراتے ہیں؛ لہذا یا تو ان مفاسد کو دور کرنا چاہئے یا اس عمل ہی کو ترک کر دینا چاہئے۔ اور اس کے مفاسد کا دور کرنا یہ ہے کہ شبینہ نماز نفل میں نہ ہو؛ بل کہ تراویح میں ہو اور حفاظ کرام قرآن کو تراویل سے پڑھیں، ریا و فخر مقصود نہ ہو اور نہ ہی مال مقصود ہو۔ نیز سامعین کرام توجہ سے قرآن سنیں اور بے دلی و تنگدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔

رمضان کی بعض راتوں میں بے وجہ روشنی

رمضان مبارک کی بعض راتوں مثلاً پندرہویں رات، ستائیسویں رات وغیرہ میں بعض مساجد میں بے وجہ زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مسجد کے اندر اور باہر اور مین روں پر زائد از ضرورت لائٹوں کا انتظام کیا جاتا ہے، اس میں کئی خرابیاں ہیں۔ (۱) اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ غیر قوموں کی رسم ہے کہ وہ اپنی عیدوں اور تقریبوں میں بے وجہ روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شریعت اسلامیہ ہر اس رسم کی بیخ کنی کرتی ہے جس میں کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ سے مشابہت لازم آتی ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ. »

(جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔) (۱)

اسی طرح مختلف حدیثوں میں یہود و نصاریٰ اور کفار کی مختلف چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ الغرض زائد از ضرورت روشنی کرنا کفار کا طریقہ ہے، لہذا اسلامی عید و تقریب کے موقع پر اس کو اپنانا سراسر

ناجائز ہے۔

(۲) دوسری خرابی یہ ہے کہ اس رسم کو لوگ ایک نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں اور جو کام شریعت میں نہ ہو اس کو دین و شریعت میں سے قرار دینا اور اس کو طاعت و عبادت خیال کرنا بدعت و احداث فی الدین ہے۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. »

(جو کوئی ہمارے دین میں نیا کام نکالے جو اس میں نہ ہو تو وہ رد ہے۔) (۱)

(۳) تیسری برائی یہ ہے کہ اس میں اسراف اور فضول خرچی ہے، اور اسلام اسراف و فضول خرچی کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَا تُبْذِرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ﴾

(اور اسراف نہ کرو؛ کیونکہ اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴾ (الانحراف: ۳۱)

(اور اسراف نہ کرو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

ان تین وجہوں میں سے ایک بھی اگر کسی جگہ پائی جائے تو اس کے ناجائز ہونے کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ ان میں سے ایک نہیں؛ بلکہ کسی جگہ سب کی سب جمع ہوں، جیسے زیر بحث صورت میں تو کیا یہ ممنوع و ناجائز نہ قرار دیا جائیگا؟

اس کے باوجود بعض لوگوں نے اس عمل کو جائز بلکہ مستحسن قرار دینے کے لیے عجیب اور بے ہودہ تاویلات سے کام لیا ہے، مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح روشنی کرنے سے اسلام کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال لغو و فضول

ہے؛ کیونکہ اسلام کی شان و شوکت اسلامی احکام کی خلاف ورزی اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی میں نہیں ہے؛ بل کہ اس کی پیروی اور تابعداری میں ہے، اسی طرح اسلام کی شوکت مادی و فانی چیزوں سے نہیں؛ بل کہ روحانی چیزوں سے ہے اور وہ سوائے اطاعت و عبادت کے کچھ اور نہیں، حضرات صحابہ کے دور میں مساجد کی ظاہری زیب و زینت موجودہ دور کی مساجد کے لحاظ سے ایک فیصد بھی شاید نہ تھی؛ مگر اس کے باوجود ان کا وہ رعب و جلال اور وہ شان و شوکت تھی کہ قیصر و کسری کے عظیم محلات پوری آن بان اور ظاہری زیب و زینت کے باوجود اس سے محروم تھے، لہذا ایک مسلمان کی خواہش و جستجو خدا و رسول کے احکام کی اطاعت اور پیروی کے لیے ہونا چاہئے، نہ کہ مادی آرائش و زیبائش کے لیے۔ یہی ایک سچے مسلمان کا طغرائے امتیاز ہے۔

ختم قرآن پر مٹھائی کی رسم

ایک بہت پرانی رسم ختم قرآن پر شیرینی تقسیم کرنے کی ہے، جس کا آج بھی بہت سی مسجدوں میں رواج و اہتمام ہے۔

جہاں تک اس رسم کی ابتداء کا تعلق ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض نیک دل لوگوں نے قرآن مجید کے ختم پر فرحت و مسرت کے اظہار کے لیے اس کو جاری کیا ہوگا اور اس حد تک یہ بات بلاشبہ جائز ہے؛ بل کہ باعث ثواب بھی، مگر موجودہ دور میں اس میں چند عملی و اعتقادی خرابیاں شامل ہو جانے کی بنا پر اس رسم کو علما نے قابل ترک قرار دیا ہے۔

مثلاً لوگوں کا اس کو ضروری سمجھ لینا حتیٰ کہ کبھی مٹھائی تقسیم نہ ہو تو لعن طعن اور ملامت کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس رسم کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ

بات ایک معمولی پڑھا لکھا بھی جان سکتا ہے کہ جس کام کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اس کو ضروری سمجھنا عقیدے کی خرابی ہے۔

عام لوگوں کے اس کو ضروری سمجھنے کی بنا پر مساجد کے ذمہ دار گنجائش ہو یا نہ ہو، اس کو پورا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعض جگہ تو یہ غضب ہوتا ہے کہ مسجد کے مال سے یہ رسم ادا ہوتی ہے جو کہ سراسر ناجائز ہے؛ کیوں کہ مسجد کا مال صرف مسجد کے مصارف و اخراجات پر لگ سکتا ہے، کسی اور کام میں اس کو لگانا ناجائز ہے۔ نیز بعض جگہ اس رسم کے لیے الگ چندہ کیا جاتا ہے، جس میں بہت سے لوگ شرم کے مارے چندہ دے دیتے ہیں، دلی رضا مندی و خوشی سے نہیں دیتے۔ نیز بعض لوگوں سے جبراً وصول کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شرم سے دیا جانے والا اور جبر سے وصول ہونے والا مال جائز نہیں ہوتا، پھر اس سے جو مٹھائی لائی گئی وہ کیسے جائز ہوگی؟ پھر تقسیم کے موقع پر مساجد میں جو شور و غل اور ہنگامہ آرائی ہوتی ہے، وہ مزید برائی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنا پر ظاہر ہے کہ یہ تقسیم شیرینی کی رسم ناجائز قرار پاتی ہے۔ اس لیے اس سے بھی احتراز لازم و ضروری ہے۔

لیلة القدر میں مساجد میں اجتماع

لیلة القدر جس کو ایک ہزار مہینوں سے زیادہ افضل و خیر کی رات قرار دیا گیا ہے، اس میں عبادت کرنا اور زیادہ سے زیادہ ثواب کے حاصل کرنے کی تدبیر کرنا بہت اہمیت کا کام ہے اور اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری طور پر ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ عبادت کو اسی طور طریقہ پر انجام دیا جائے جیسے شریعت نے بتایا ہے؛ کیوں کہ شریعت اس سلسلے میں بڑی حساس ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کوئی کام خصوصاً عبادت کا کام انجام دیا جائے۔ اگر عبادت کی

مقدار متعین ہے تو اس مقدار سے گھٹانا یا بڑھانا اور اسی طرح عبادت کی کیفیت میں تغیر و تبدل شریعت میں ناقابلِ برداشت جرم ہے۔ مثلاً ظہر کی مقررہ چار فرض رکعتوں میں سے ایک دو کا کم کر دینا یا اس میں اضافہ کر دینا، ہر اس رنا جائز اور تحریف دین کے مترادف ہے، اسی طرح عبادت کی کیفیت مثلاً تنہا پڑھی جانے والی نماز کو باجماعت پڑھنا یا اس کے برعکس فرض کو بلا وجہ تنہا پڑھنا شریعت کی نگاہ میں بہت بری بات ہے۔

مگر افسوس کہ بہت سے مسلمان اس بات سے یا تو ناواقف ہیں یا اس سے لاپرواہ ہیں اور اسی وجہ سے لیلة القدر کی عبادت میں طریق سنت سے ہٹ کر خلاف شریعت و سنت طریقہ پر عبادت انجام دیتے ہیں، وہ یہ کہ لیلة القدر میں مساجد میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں، جس کو علما نے مکروہ قرار دیا ہے، چنانچہ حنفی مسلک کے زبردست محقق ابو حنیفہ رحمۃ اللہ ثانی علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی

راتوں، عیدیں کی راتوں اور ذی الحجہ کی دس راتوں، شعبان کی

پندرھویں رات شب بیداری کرے۔ مراد شب بیداری سے اس میں

عبادت کرنا ہے اور ان راتوں میں سے کسی رات کو جاگنے کے لئے

مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔“ (۱)

علامہ حسن بن عمارۃ الشرنبلالی رحمۃ اللہ گیارھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف حنفی فقیہ ہیں، وہ اپنی کتاب ”نور الایضاح“ اور اس کی شرح ”مراقی الافلاح“ میں فرماتے ہیں:

”مستحب ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی راتوں کو شب

بیداری کرے، لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے ایسا نہیں کیا؛ لہذا اکثر علما نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”شب برأت اور شب قدر وغیرہ میں مساجد کے اندر اجتماع کا اہتمام اور التزام یا خود ایک مستقل بدعت ہے، جس کی نظیر قرون مشہود لھا بالخیر میں موجود نہیں، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اجتماع کوئی محمود چیز ہے، بلکہ مسنون اور مستحب صرف وہی ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ علاحدہ علاحدہ اس مبارک رات میں بیدار رہ کر اپنی اپنی نوافل اور تلاوت میں مشغول رہیں۔“ (۲)

علما کی ان تصریحات سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ لیلة القدر وغیرہ میں مساجد میں اجتماع کا اہتمام مکروہ و بدعت ہے؛ اس لیے کہ دور رسالت و صحابہ و تابعین میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہاں البتہ بلا اہتمام کچھ آدمی مساجد میں عبادت کرنے آگئے تو الگ بات ہے۔

لہذا طریق سنت کے مطابق ان راتوں میں مساجد کے بجائے اپنے گھروں کو عبادت سے رونق بخشیں؛ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« صَلُّوْا فِی بُیُوتِکُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا. »

(۱) نور الایضاح ص: ۹۵ و مراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی ۲۱۹:

(۲) امداد المفتیین: ۲۰۹

(اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور ان کو قبرستان نہ بناؤ۔) (۱)

لہذا گھروں کو عبادات کے نور سے منور و بارونق بنانا اور برکات و رحمتوں کا اس کو مہبط بنانا چاہئے، ایک طرف تو دیندار لوگوں کا یہ حال کہ وہ لیلة القدر میں عبادت کے شوق میں خلاف سنت طریقہ کو اختیار کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگوں کا یہ وطیرہ کہ وہ لیلة القدر کی مبارک ساعتوں کو بازاروں کی سیر و تفریح کے لیے خاص کرتے ہیں اور مرد بھی، عورتیں بھی، بچے بھی، بجائے عبادت کے سیر و تفریح، خرید و فروخت کے لیے جاتے ہیں۔

بعض علاقوں میں اس منکر کا رواج ہو چلا ہے اور خاص طور پر بنگلور میں اس لعنتی منکر کو فروغ ہو گیا ہے۔

اس میں سب سے پہلے تو لیلة القدر کی بے قدری ہے اور اس بے قدری سے بڑھ کر بھلا اور کیا محرومی ہو سکتی ہے؟ دوسرے مردوں اور عورتوں کا اختلاط و اجتماع اور میہ کی سی شکل، جس میں مڈ بھڑ بھی ہوتی ہے، کس قدر لعنت کا کام ہے۔ کیا لیلة القدر اسی لعنت کے وصول کرنے کے لیے آتی ہے؟

افسوس کہ بعض دین کے نام پر خرافات کو جنم دینے اور پھیلانے والے اس منکر کی حمایت و تائید؛ بلکہ تحسین کرتے ہیں اور اس پر نکیر کرنے والوں کو پریشان کرتے اور گالیاں دیتے ہیں۔

اللہ جزائے خیر دے انجمن خدام المسلمین (بنگلور کے کچھ ہمدردونیک دل لوگوں کی ایک انجمن جو وفا ہی کاموں میں سرگرم عمل رہتی ہے) کے کارکنوں کو جنہوں نے بنگلور میں اس منکر کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کا بیڑا اٹھایا اور اللہ کا کرم ہے کہ دو سالوں سے انجمن کی تحریک اور سعی و کوشش سے یہ منکر قریب ختم ہو گیا ہے۔

ستائیسویں میں ختم قرآن کا اہتمام

ہمارے علاقوں میں اکثر مساجد میں ستائیسویں رمضان کو تراویح میں ختم قرآن کا اہتمام کچھ مبالغہ آمیز ہو گیا ہے کہ بعض؛ بلکہ اکثر لوگ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور حافظ کو ہر صورت پر اسی تاریخ میں قرآن ختم کرنا ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ بیمار ہو یا کسی عذر سے کچھ پارے رہ گئے ہوں۔ بہر حال اس کے لئے یہ تاریخ مقرر ہے، حالاں کہ شرعیہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض فقہانے ستائیسویں تاریخ کو قرآن مجید ختم کرنا افضل و پسندیدہ بتایا ہے، مثلاً ”بحر الرائق“ اور ”رد المحتار“ میں لکھا ہے کہ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا مستحب ہے۔^(۱)

مگر یہ بعض حضرات کا قول ہے، ورنہ صحیح قول یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کرے۔ چنانچہ ”بحر الرائق“ ہی میں مذکورہ قول کے بعد لکھا ہے:

”مختارات النوازل کتاب میں ہے کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھے۔ اور یہی صحیح بات ہے؛ کیوں کہ تراویح میں ختم کرنا سنت ہے؛ کیونکہ پورے مہینے کی رکعات کا عدد چھ سو ہے اور قرآن کی آیات چھ ہزار ہیں۔“

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

امام حسن بن زیاد رحمۃ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر رکعت میں دس یا کچھ کم و بیش آیات پڑھے اور یہی صحیح بات ہے؛ کیوں کہ سنت یہ ہے کہ تراویح میں ایک دفعہ ختم کیا جائے اور یہ بات اسی سے حاصل

(۱) رد المحتار مع الدر المختار: ۴۶/۲

ہوتی ہے اور اس میں سہولت بھی ہے کہ تراویح کی رکعات کا عدد پورے ماہ میں چھ سو ہے اور آیات قرآنی چھ ہزار کچھ اوپر ہیں۔ (۱)

ان دو فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کیا جائے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا مسلک ہے اور دیگر ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے چنانچہ علامہ عبدالرحمن الجزیری رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”الفقه علی مذاہب الاربعہ“ میں فرماتے ہیں:

”نماز تراویح میں پورے قرآن شریف کا پڑھنا سنت ہے، بایں

طور کہ اس کو ماہ رمضان کی آخری شب میں ختم کیا جائے۔“ (۲)

علامہ جزیری رحمۃ اللہ نے اس جگہ کسی امام کا اختلاف نہیں بتایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تمام ائمہ متفق ہیں۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ آخری شب میں قرآن کا ختم کرنا مستحب ہے اور یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے، اس کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری امر کو ضروری سمجھنا بلاشبہ غلط بات ہے، پھر اگر ستائیس تاریخ میں ختم کرنا مستحب بھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ایسی پابندی اور اہتمام کہ اس کے خلاف کبھی نہ ہونے دیا جائے اور کسی عذر و مجبوری پر بھی اس کے خلاف کرنے کو برا خیال کیا جائے، یہ سراسر احداث فی الدین ہے۔

میرے علم میں ایسے بعض واقعات ہیں کہ ایک حافظ بیمار ہو گئے اور ستائیسویں تک ختم کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تو ان صاحب کو ہٹا دیا گیا اور ایک دوسرا حافظ بلایا گیا تا کہ وہ ستائیسویں میں ختم کر دے۔ اس طرح کے جزوی واقعات سے پتہ

(۱) شامی: ۲/۴۶

(۲) الفقه علی المذاہب الاربعہ: ۱/۵۴۵

چلتا ہے لوگ اس تاریخ کو ختم کرنا کس قدر ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ تو اس سلسلہ میں اعتقادی خرابی ہے۔

ایک خرابی عملی بھی ہے، وہ یہ کہ جب ستائیس تاریخ کو قرآن مجید ختم ہو جاتا ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب قصہ ختم ہو گیا، اب تراویح تو الگ رہی بقیہ رمضان میں پنج وقتہ نمازیں بھی ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس لیے لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہئے کہ رمضان صرف ستائیس تک ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس کے لیے ایک صورت یہ ہے کہ ستائیسویں کو ختم کرنے کے بجائے آخری شب میں ختم کیا جائے، اور غالباً مراد آخری شب سے انتیسویں (۲۹) شب ہے؛ کیونکہ تیسویں شب کا ملنا لازمی نہیں، کبھی انتیسویں تاریخ کو چاند نظر آ گیا تو تیسویں شب میسر نہیں آتی، لہذا انتیسویں شب میں ختم کرے۔

اجتماعی ذکر کی مجالس

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض لوگ مساجد میں یا کسی اور جگہ اجتماعی طریقہ پر ذکر کی مجلسیں قائم کرتے ہیں، اس میں ایک صاحب صوفیائے کرام کے طریقہ پر ضرب کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں، پھر پوری مجلس مل کر اسی طرح ذکر کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا ذکر عظیم الشان چیز ہے ”ولذکر اللہ اکبر“ اور اس کے فضائل بے شمار اور اس کے ثمرات بہت بڑے ہیں۔ مگر اس میں بھی شبہ نہ ہونا چاہئے کہ طریقہ نبوی سے ہٹ کر عبادت انجام دینا بے سود ہے اور یہ ذکر کی مجالس طریقہ نبوی سے ہٹ کر ہیں؛ کیونکہ (۱) اجتماعی طریقہ پر ذکر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں، حالاں کہ وہ حضرات نیکیوں کی تحصیل میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اگر اس طرح اجتماعی ذکر

ثواب اور نیکی کا کام ہوتا تو وہ حضرات ضرور یہ کام کرتے اور ہم تک یہ بات پہنچتی، حالاں کہ اس طرح کی کوئی بات احادیث سے ثابت نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ ایسا کرنا سنت کے خلاف ہے۔ (یہ حدیث آگے آرہی ہے۔)

(۲) مساجد میں آواز کو بلند کر کے ذکر کرنا، علما و فقہانے ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ ”مرقات شرح مشکوٰۃ“ میں فرماتے ہیں:

”ہمارے بعض علما نے بہ صراحت بیان کیا ہے کہ مسجد میں آواز کا

بلند کرنا اگرچہ ذکر ہی میں ہو، حرام ہے۔“ (۱)

علامہ حلبی حنفی رحمۃ اللہ ”غنیۃ المستملی“ میں ایک بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

”امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا

بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے ﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ

تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ کہ اللہ کو عاجزی و آہستگی سے پکارو۔“ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور علمائے احناف ذکر میں جہر کو بدعت و ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ لوگ آج اس بدعت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔

اجتماعی ذکر کے اس طریقہ پر خلاف شرع ہونے کا حکم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اب سے بہت پہلے لگا دیا ہے۔ چنانچہ امام دارمی رحمۃ اللہ نے اپنی ”سنن“ میں درج کیا ہے:

(۱) مرقات: ۲/۴۷۰

(۲) غنیۃ المستملی: ۵۶۶

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک جماعت پر گذر ہوا جو مسجد میں ذکر کر رہے تھے، ایک شخص کہتا کہ سو (۱۰۰) دفعہ اللہ اکبر پڑھو، تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ اللہ اکبر کہتے۔ پھر وہ کہتا سو (۱۰۰) دفعہ لا الہ الا اللہ پڑھو، تو وہ ایسا ہی کرتے۔ اسی طرح تسبیح کے لیے کہتا، وہ تسبیح پڑھتے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو؟ بتایا گیا کہ ذکر کرتے ہیں، اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو، تعجب ہے تم پر کہ ابھی تم میں صحابہ موجود ہیں اور ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے برتن نہیں ٹوٹے، تم اتنی جلدی ہلاکت میں پڑ گئے، پھر فرمایا: تم اندر میں حالات بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولنے والے ہو۔“ (۱)

اس روایت کو علمائے صحیح قرار دیا ہے۔ غور فرمائیے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو جو مسجد میں اجتماعی ذکر کر رہے تھے، بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولنے والے قرار دے رہے ہیں اور اس طریقہ کو خلاف شرع بتا رہے ہیں۔

اس سے ان حضرات کو عبرت و سبق حاصل کرنا چاہئے جو اس طرح کی مجالس کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو ثواب خیال کرتے ہیں، جب کہ یہ طریقہ سنت و شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت میں داخل ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینے کی ہے، وہ یہ کہ ان مجالس میں ذکر کرانے والے صاحب حضرات صوفیائے کرام کے طریقہ پر ضرب و شغل بھی کرتے اور لوگوں کو

کراتے ہیں، اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہئے کہ صوفیائے کرام نے ذکر کا وہ طریقہ جو ضرب و شغل پر مشتمل ہے، ایک علاج و دوا کے طور پر تلقین کیا ہے اور بذات خود یہ طریقہ ذکر جس میں ضرب وغیرہ ہوتا ہے، مقصود اور ثواب کی چیز نہیں ہے۔ ثواب کی چیز ذکر ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ جو اپنے زمانے کے سر تاج صوفیاء بھی تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

”طریق خاص ضرب نہ مقصود ہے، نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح

بے تکلف بن جائے کافی ہے۔“ (۱)

اس میں بتایا ہے کہ ضرب (جھٹکا وغیرہ) مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”شریعت و تصوف“ میں رقمطراز ہیں:

”یہ سب طریق مقصود بالذات نہیں؛ بل کہ صرف وسیلہ یکسوئی

ہیں، جو ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے..... آگے چل کر فرماتے ہیں

..... بس یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر مقدمہ

عبادت نہ بنائی جائیں تو پھر ان کا کچھ اجر (ثواب) نہیں اور مقاصد

میں سے تو کسی حال میں ہی نہیں۔“ (۲)

ان دونوں بزرگوں اور فن تصوف کے جلیل القدر اماموں کے بیانات سے معلوم ہوا کہ یہ ضرب وغیرہ کیفیات و طرق مقصود نہیں ہیں۔ ہاں البتہ یکسوئی کے حصول کے لیے معین و مددگار ہونے کی وجہ سے جب کہ ان کو عبادت کا مقدمہ بنا دیا جائے، یہ

(۱) انفاس عیسیٰ: ۶۳

(۲) شریعت و تصوف: ۲۲/۲-۲۳

ایک درجہ میں مطلوب ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کو ثواب و عبادت سمجھنا تو کسی حال میں روا نہیں ہے، چنانچہ سر تاج صوفیا حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ ”قصد السبیل“ میں بہ صراحت فرماتے ہیں:

”ان (تسبیحات) کو تھوڑی آواز اور ہلکی ضرب سے کریں؛ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا خود کوئی ثواب کی بات نہیں ہے۔ ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے۔“ (۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو حضرات عوام الناس کو لے کر صوفیا کے طریق پر ذکر کرتے ہیں اور ضرب و شغل کراتے ہیں، یہ کوئی مستقل و مستمر عمل نہیں کہ اس طریقہ کا نفع وفائدہ ظاہر ہو؛ بل کہ محض رمضان کی طاق راتوں اور وہ بھی عشرہ اخیرہ کی راتوں تک محدود ہے، تو بھلا دو چار راتوں میں اس کا کیا اثر ظاہر ہوگا؟ پھر اس کے باوجود اس طریق پر ذکر کرانے کو محض لغویا اعتقاد کی خرابی نہ کہیں تو اور کیا کہا جائے؟ جو مستقل طور پر اس طریق کو اختیار کر کے اس کو یکسوئی کا ذریعہ بنائے، اس کے لیے تو یہ درست ہے جیسا کہ اپنے حضرت کا ارشاد نقل کر چکا ہوں۔ مگر جو ایسا نہ ہو تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو کہا جائے گا کہ لغو و فضول یہ ضرب و شغل اختیار کیا جا رہا ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ لوگ اس کو ثواب سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ ثواب کا کام نہیں، ثواب تو ذکر میں ہے، نہ کہ اس طریق میں۔

حاصل یہ کہ ذکر کی مجالس مروجہ شرعاً بدعت کے زمرہ میں داخل ہیں؛ لہذا ان کو ترک کرنا چاہئے اور انفرادی طور پر ذکر کی تلقین کرنا چاہیے۔

نابالغ بچوں کو روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم

شریعتِ مطہرہ سرِ اِپا اعتدال ہے اور افراط و تفریط سے بالکل پاک، چنانچہ اس نے نابالغ بچوں کے سلسلہ میں ہدایت کی ہے کہ اگرچہ وہ غیر مکلف ہیں، مگر عادت ڈالنے کے لیے انہیں بچپن ہی سے عبادات کی طرف راغب کیا جائے۔ مگر بچپن سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں حدیثِ رسول سے پتہ چلتا ہے کہ سات برس سے بچہ کو عبادات میں لگا دینا چاہیے اور دس برس سے سختی کے ساتھ لگانا چاہیے، چنانچہ نماز کے سلسلے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے:

”اپنی اولاد کو نماز کا حکم کر و جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور

اس پر اس کو مار و جب کہ وہ دس سال کے ہو جائیں۔“ (۱)

علمائے لکھا ہے کہ نماز کے مسئلہ ہی کی طرح روزہ اور دیگر احکام کا حکم ہے کہ سات سال میں بچوں کو اس میں لگا دینا چاہیے اور دس سال ہو جائیں تو مار کر لگانا چاہیے۔ (۲)

مگر اتنے چھوٹے بچوں کو جو ان چیزوں کی کوئی تمیز نہیں رکھتے اور انہیں ان کی سہار نہیں ہے، ان مربیوں کو کسی درجہ میں بھی شریعت نے مکلف و مامور نہیں کیا ہے، اور اگر کوئی بچہ خود خوشی سے انجام دے لے، تو الگ بات ہے؛ مگر بڑوں کی طرف سے اس کو اس پر مجبور کرنا سراسر خلافِ شریعت ہے۔ مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ نہایت کم سن اور معصوم بچوں کو روزہ رکھوانے کی رسم کرتے ہیں اور اس میں روزہ رکھوانے سے زیادہ روزہ کشائی کی رسم مقصود ہوتی ہے اور اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) جمع الفوائد: ۲۵/۱

(۲) شامی: ۳۵۲/۲

(۱) ایک یہ کہ اس سے خواہ مخواہ ایک غیر مکلف پر جبر ہوتا ہے، جس سے بسا اوقات نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ ایک جگہ اسی رسم کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجھ کو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح کے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی امارت اچھا لنے کے لیے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا، گرمی کے بڑے اور کڑے دن تھے، عصر کے وقت تک اس نے جوں توں کر کے اس نے کھینچا، آخر طاقت طاق ہو گئی اور صبر و تواں نے جواب دے دیا، ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے، ان پر تر کپڑا پڑا تھا، برف گھولنے کا سامان ہو رہا تھا، اس سارے سامان نے آگ بھڑکا دی، ایک ایک سے پانی کے لیے خوشامد کرتا تھا؛ لیکن اگر پانی دے دیتے تو روزہ کشائے کا سامان اکارت جاتا ہے، اپنا سامان بچا نے کے لیے پانی کو جواب دے دیا، آخر سخت بیتاب ہو کر، دوڑ کر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا، اس کی نعش زبان حال سے سرایاں تھی کہ: ”لو بھئی! تم کو تمہارا سامان مبارک رہے، ہم اپنی جان تمہارے سامان پر فدا کرتے ہیں۔“ (۱)

غور کیجئے کہ یہ حسرتناک انجام سوائے اس کے کہ شریعت سے اعراض کر کے محض رسم کی پابندی کی گئی اور کس وجہ سے ہے؟

(۲) روزہ کشائی کی رسم انجام دینا اور اس کے لیے بڑا لمبا چوڑا اہتمام اور اس کے خاطر لوگوں کو جمع کرنا، سراسر خلاف شریعت ہے؛ کیوں کہ اس طرح کی رسم شریعت

میں ثابت نہیں، حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک ختنہ کی دعوت میں بلایا گیا تو آپ نے انکار کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی:

”ہم لوگ زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ختنوں میں

نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ہم کو اس کے لیے دعوت دی جاتی تھی۔“ (۱)
صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ختنہ کی دعوت یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ ہمیں اس طرح کی دعوت نہیں دی جاتی تھی۔ غور کرنا ہے کہ روزہ کشائی کی دعوت بھی جب وہاں نہیں تھی، تو اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

(۳) پھر اس میں جو اسراف اور فضولیات ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ مستقل ایک گناہ ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

(۴) اس موقع پر بعض؛ بل کہ بہت سے لوگ اس روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم کا اخبارات میں اعلان بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی بچے کی تصویر بھی شائع کرتے ہیں۔ اسلام میں تصویر لینا، رکھنا، دوسروں کو بتانا، سب حرام و ناجائز ہے۔ پھر اشتہار سے اس کی تشہیر خود ریاکاری پر مشتمل ہونے کی بنا پر ناجائز فعل ہے۔

اب غور فرمالیا جائے کہ اس رسم میں کس قدر ناجائز امور شامل ہیں، اس کے باوجود کیا یہ رسم جائز ہو سکتی ہے؟

ایک طرف تو بعض لوگوں کا یہ حال کہ غیر مکلف بچوں کو بھی محض رسم کو پورا کرنے کے لیے اس پر مجبور کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگ روزہ کشائی کی غیر شرعی رسم کو ادا کرنے کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو روزہ ہی نہیں رکھواتے اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اس رسم کو ادا کرنے کے لیے اتنے ہزار روپے جمع و فراہم ہو جائیں تو

رکھوائیں گے، اس طرح بعض بچے جوان بھی ہو گئے اور روزہ رکھنے کی نوبت نہیں آئی، غور کیجیے کہ محض ایک من گھڑت رسم کی خاطر بچوں کو روزہ نہ رکھوانا اور ان پر روزہ فرض ہونے کے بعد بھی اس سے غفلت برتنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

پندرہویں روزے کی تعظیم

کسی چیز کے مرتبہ کی بڑائی اور اس کی تعظیم، ایسی چیز ہے جو محض عقل کی بنیاد پر تراشی نہیں جاسکتی، بل کہ قرآن و حدیث کی دلیل ہی اس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کا جو درجہ و مقام ہے اور ان میں تفاضل ہے، وہ صرف دلیل شرعی کی بنیاد پر قائم ہوگا، محض اپنی عقل سے نہیں۔ اسی طرح روزوں کا مسئلہ بھی ہے کہ بلا شرعی دلیل کے کسی روزے کو کسی روزے سے بڑا اور زیادہ عظیم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر افسوس کہ بعض لوگ روزوں میں بھی کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے عوام میں یہ مشہور ہے کہ منجھلا روزہ یعنی پندرہواں روزہ بڑا روزہ ہے، حالاں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ محض ایک من گھڑت عقیدہ اور بدعت ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”رمضان کی بدعت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منجھلے روزے کو افضل

سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں جو سب بدعات

ہیں۔“ (۱)

لہذا اپنی جانب سے کسی روزے کو بڑا اور کسی کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہئے، ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔

(۱) اغا ط العوام مولانا تھانوی مرتبہ مولانا مہربان علی صاحب: ۱۲۷

تراویح میں نابالغ کی امامت

تراویح میں نابالغ بچوں کو امام بنانے کا رواج بھی بہت سے مقامات پر زوروں پر ہے، بعض جگہ تو یہ تک ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ بالغ حفاظ کے ہوتے ہوئے بھی نابالغ حافظ کو امام بنا دیا جاتا ہے، یہ مسئلہ کہ تراویح میں نابالغ بچے کو امام بنانا درست ہے یا نہیں؟ اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے، لیکن صحیح اور جمہور علماء کا پسندیدہ قول یہی ہے کہ نابالغ کی اقتداء کسی نماز میں بھی صحیح نہیں ہے، نہ تراویح میں اور نہ کسی اور نفل یا فرض میں۔ چنانچہ صاحب ”ہدایۃ“ نے فرمایا کہ:

”وفی التراويح والسنن المطلقة جوزه مشائخ بلخ ولم
يجوزه مشايخنا والمختار انه لا يجوز في الصلوات
كلها.“

(اور تراویح اور سنت مؤکدہ میں بلخ کے مشائخ نے اس کو (یعنی
نابالغ کی اقتداء کو) جائز قرار دیا ہے اور ہمارے مشائخ نے اس کو جائز
نہیں قرار دیا ہے اور مختار قول یہی ہے کہ (نابالغ کی اقتداء) تمام
نمازوں میں ناجائز ہے۔) (۱)

علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ یہی قول مختار ہے اور جمہور علماء کا
ہے اور یہی ظاہر روایت ہے۔ (۲)

اور وجہ یہ ہے کہ علامہ حنفی رحمۃ اللہ نے ”در مختار“ میں اس کو اصح قرار دیا ہے۔ (۳)

(۱) ہدایہ: ۱۰۳/۱

(۲) بحر الرائق: ۵۹/۱

(۳) در مختار مع شامی: ۵۷۸/۱

اور وجہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے مطابق بچہ کی نماز حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے، بلکہ نماز کی نقل ہے۔ لہذا اس کے پیچھے ایک ایسا آدمی جس پر نماز فرض یا سنت ہے، کس طرح نماز پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”نہایہ میں ہے کہ یہ اختلاف اس طرف راجع ہے کہ بچہ کی نماز، نماز ہے یا نہیں؟ کہا گیا ہے کہ وہ نماز نہیں ہے، بلکہ صرف عادت ڈالنے کے لیے اس کو نماز کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے بالغ ہونے کے قریب پہنچی ہوئی لڑکی بغیر اوڑھنی نماز پڑھے، تو جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اور اسی لئے مراہق (قریب البلوغ لڑکا) قہقہہ لگائے تو وضو کرنے کا حکم دیا جائے گا، اس کے بعد علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بظاہر اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں ہے، اس لیے اس کی اقتداء میں کسی بھی نماز کا ناجائز ہونا مختار قول ہے۔“ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ راجح بات یہ ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں، بلکہ نقل نماز ہے، تو اس کے پیچھے بالغ شخص نماز نہیں پڑھ سکتا۔

ہمارے علمائے بھی اس پر فتویٰ دیا ہے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”فتویٰ اس پر ہے کہ نابالغ کے پیچھے تراویح بھی جائز نہیں، اگر کوئی بالغ حافظ نہ ملے تو ”الم تر کیف“ وغیرہ سے مختلف سورتیں پڑھ کر تراویح پڑھ لی جائے۔“ (۲)

(۱) البحر الرائق: ۳۵۹/۱

(۲) امداد المفتیین: ۳۶۳

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:
 ”حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ نابالغ کی اقتداء بالغین کو فرض و نفل کسی
 میں بھی درست نہیں ہے، پس تراویح بھی نابالغ کے پیچھے نہیں ہوتی،
 یہی حنفیہ کا صحیح مذہب ہے۔“ (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آج بہت سے مقامات پر جو یہ رواج ہے کہ نابالغ
 بچوں سے قرآن سننے کے شوق میں، ان کو تراویح میں امام بنا دیا جاتا ہے، یہ غلط
 ہے۔ اگر بچوں کو عادت ڈالنے یا ان کی ہمت افزائی کے لئے امام بنانا ہو تو ان کے
 پیچھے نابالغ بچوں کو نماز پڑھائیں۔ اس سے ان کو عادت بھی پڑ جائے گی اور بڑے
 لوگوں کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

نمک پر افطاری کی رسم

شریعت میں افطاری کسی بھی چیز سے کی جاسکتی ہے۔ البتہ احادیث سے معلوم
 ہوتا ہے کہ بہتر اور افضل یہ ہے کہ کھجور سے اور کھجور نہ ہو تو پانی سے افطار ہو۔ امام
 ترمذی والبوداؤد رحمہما اللہ نے حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ
 فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ فَإِنَّهُ طَهُورٌ. »

(جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو چاہئے کہ کھجور پر افطار کرے
 اور اگر نہ پائے تو پانی پر کرے؛ کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔) (۲)

(۱) عزیز الفتاویٰ: ۱۹۶

(۲) سنن ترمذی: ۱/۱۳۹

اور خود آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا بھی یہی عمل تھا، چنانچہ حدیث میں ہے:

« عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم يُفْطِرُ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَى رُطَبَاتٍ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ رُطَبَاتٍ فَتُمِيرًا فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تُمِيرًا حَسًا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ. »

(آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نمازِ (مغرب) سے قبل چند تر کھجور پر افطار کرتے اور اگر تر کھجور نہ ہوتے تو چھواروں پر کرتے اور وہ بھی نہ ہوتے تو چند چلو پانی لیتے۔)

پہلی حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ (۱)

اور امام ابو عبد اللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح علی شرط البخاری کہا ہے۔ (۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ کھجور یا پانی پر افطار کیا جائے، اس کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنی طرف سے متعین کرنا ”ایجاد بندہ“ کی فہرست میں داخل ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے ان علاقوں میں بہت سے لوگوں اور خاص طور پر بوڑھی عورتوں میں نمک پر افطاری کا ایک خود ساختہ طریقہ رائج ہے اور اس طریقہ کو مستحب سے بھی بڑھا کر درجہ و جوب تک پہنچا دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اوپر کی حدیث اور معمول نبوی کے برخلاف کسی چیز کو اپنی طرف سے ضروری یا مستحب خیال کر لینا اور اس کی عملی پابندی کرنا نہ صرف یہ کہ بدعت ہے، بلکہ ایک درجہ میں سنت کا مقابلہ بھی ہے، بلکہ صحیح بات یہ کہ ہر بدعت میں سنت کا مقابلہ ہوتا ہے، لہذا اس طریقہ کی پابندی بلاشبہ غلط ہے اور واجب الترمک ہے۔

(۱) سنن ترمذی: ۱۵۰/۱

(۲) بحوالہ بذل المجہود: ۱۴۱/۴

ہاں بلا پابندی اور بلا اعتقاد، یوں ہی کوئی نمک سے افطاری کر لے تو اس کی بھی بلا شبہ اجازت ہے۔ مگر اس کو خاص اعتقاد اور ثواب کی نیت سے اختیار کرنا محض بدعت ہے۔

مساجد میں افطاری کا رواج

ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ مساجد میں افطار کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں اور بہت ساری مساجد میں لوگ بڑے بڑے خوان بچھاتے اور ان پر متعدد ماکولات و مشروبات کا انتظام فرماتے ہیں، حالانکہ مساجد میں کھانے اور پینے سے علما نے سختی سے منع فرمایا ہے اور صرف ضرورت پر اس کی اجازت دی ہے، جیسے مسافر کو گھربار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت لاحق ہو تی ہے یا اعتکاف کرنے والے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو مسجد میں کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ ”در مختار“ میں فرماتے ہیں:

”مکروہ ہے (مسجد) میں کھانا اور سونا، مگر معتکف اور مسافر کو جائز

ہے۔“ (۱)

اسی طرح علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ نے ”الاشباہ والنظائر“ میں لکھا ہے:

”منع کیا جائے گا کھانے اور سونے سے غیر معتکف اور غیر مسافر کو۔“ (۲)

معلوم ہوا کہ مسجد میں کھانے اور پینے کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ مسجد عبادت گاہ ہے جو بلا ضرورت ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کبھی بہ ضرورت

(۱) در مختار مع شامی: ۶۶۱/۱

(۲) الاشباہ مع الحموی

کسی کو مسجد میں کھانے سونے کی بات پیش آئے تو علما نے لکھا کہ اعتکاف کی نیت کر کے پہلے کچھ دیر ذکر و اذکار میں مشغول ہو جائے، پھر کھائے پیئے۔ جیسا کہ شامی اور حموی رحمہما اللہ نے تصریح کی ہے۔ (۱)

مگر یہ غیر مسافر و غیر معتکف کو بہ ضرورت کھانے پینے کی صورت میں بہ نیت اعتکاف اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بے ضرورت کھانے پینے کا مشغلہ بنالینا اور اس کے لیے اعتکاف کی نیت کر لینا غلط ہے؛ کیوں کہ ہر کام مقصد کے تابع ہوتا ہے، لہذا کھانا پینا مقصد ہوگا تو اعتکاف کی نیت کر لینے سے اس پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں ضرورت کے مواقع اس سے ضرور مستثنیٰ ہوں گے۔

اس کے علاوہ مسجد میں افطار کے موقع پر جو شور و غل اور بچوں کا دوڑنا اور گھومنا اور افطاری کے سامان کی چھینا چھینی اور اس کے لیے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا؛ بلکہ دھکے دینا اور مسجد کے فرش کو ملوث کرنا وغیرہ، جو امور پیش آتے ہیں، ان کے پیش نظر کسی صورت میں مسجد میں افطاری کی اجازت نہیں دی جاسکتی، لہذا اہل محلہ کو چاہئے کہ یا تو گھروں میں افطار کر کے مسجد کو آئیں یا مسجد کے باہر آس پاس اس کا انتظام کریں، تاکہ مسجد کی بے حرمتی نہ ہو۔

صبح صادق کے بعد سحری

رمضان مبارک میں جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک عام بے احتیاطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ صبح صادق ہونے بعد بھی کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں، اور بعض لوگ اذان تک اور بعض اذان کے ختم ہونے تک بھی کھاتے رہتے ہیں، حالانکہ صبح صادق ہوجانے کے بعد کھانے پینے کی اجازت نہیں اور اس سے

(۱) شامی: ۶۶۱/۱، غمز عیون البصائر للحموی: ۶۰/۴

روزہ اکارت جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بہ صراحت سحری کے انتہائی وقت کو بتا دیا ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ

الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البَقَرَةُ: ۱۸۷)

(کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق) کا ممتاز ہو

جائے سیاہ خط سے) (یعنی رات سے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ سحری کا انتہائی وقت صبح صادق کا ظاہر ہونا ہے اور صبح صادق کے یقینی طور پر ظاہر ہو جانے کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی کھانا پینا روزہ کو فاسد کر دیتا ہے اور صبح کا یقین ان چارٹوں سے ہو سکتا ہے جو رمضان میں اوقات سحر و افطار ہی پر مشتمل شائع کئے جاتے ہیں۔ اس میں بتائے ہوئے وقت کے مطابق سحری کا ختم کر دینا ضروری ہے تا کہ روزہ فساد کا شکار نہ ہو جائے۔

بعض لوگ بعض حدیثوں کی بنا پر سحری کو صبح صادق کے بعد بھی جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، مگر یہ دراصل ان حضرات کو احادیث نہ سمجھنے سے دھوکہ لگا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کھانے، پینے کی اجازت نہیں ہے، اور جن حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اذان کے بعد بھی کھا سکتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ اذان اگر فجر سے پہلے ہو جائے، جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان پہلے ہوتی تھی تو کھانے کی اجازت ہے، مگر صبح صادق کے بعد اجازت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے کتب حدیث اور ان کی شروحات دیکھئے۔ (۱)

(۱) مثلاً بذل المجہود وغیرہ

تراویح کی مروجہ دعائیں

تراویح کی نماز کے ہر ترویجہ (چار رکعت) پر استراحت کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے؛ مگر اس موقع پر کیا پڑھنا یا کرنا چاہئے، اس کی کوئی تعیین نہیں کی گئی؛ بلکہ اس موقع پر ہر شخص کو آزاد رکھا گیا ہے اور اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، خواہ ذکر و اذکار میں مشغول ہو یا نفل نماز پڑھے، یا خاموش بیٹھا رہے۔ چنانچہ حضرات فقہانے اس کی تصریح فرمائی ہے:

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ ”شرح کنز“ میں لکھتے ہیں:

”فقہانے کہا ہے کہ لوگ بیٹھنے کی حالت میں مختار ہیں اگر چاہیں تو تسبیح پڑھیں، اور اگر چاہیں تو قرآن کی تلاوت کریں اور اگر چاہیں تو تنہا چار رکعت نفل پڑھیں اور چاہیں تو خاموش بیٹھے رہیں۔ اور مکہ والے (اس وقت) ایک ہفتہ طواف کرتے ہیں اور دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اور مدینہ والے چار رکعت نفل پڑھتے ہیں۔“ (۱)

اسی طرح علامہ ابو بکر الحدادی مبنی رحمۃ اللہ نے ”الجوہرۃ النیرۃ“ میں لکھا ہے:

”اس جلسہ استراحت میں اختیار ہے، چاہے تو تسبیح پڑھے، ذکر کرے یا خاموش انتظار کرتا رہے اور اس وقت نماز پڑھنے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے مستحب کہا ہے۔“ (۲)

(۱) البحر الرائق: ۶۹/۲

(۲) الجوہرۃ النیرۃ: ۱۳۰/۱

اسی طرح علامہ حنفی رحمۃ اللہ نے ”درمختار“ میں اور علامہ شامی رحمۃ اللہ نے ”ردالمحتار“ میں لکھا ہے۔ (۱)

ان تمام عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چار رکعت پر اتنی ہی دیر جتنے وقت میں چار رکعت ہوئی ہے، بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت اختیار ہے، چاہے تسبیح پڑھے یا قرآن یا اور کوئی وظیفہ یا خاموش بیٹھا رہے اور نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے اجازت دی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت کے لیے کوئی خاص ذکر یا دعا منقول نہیں ہے؛ بل کہ اپنے طور سے اگر کوئی ذکر بغیر تخصیص کے پڑھ لے تو جائز ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارے شہروں اور دیہات کی اکثر مساجد میں بعض دعائیں اور اذکار خصوصیت کے ساتھ اور واجب کی طرح التزام کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، حالاں کہ ابھی اوپر ثابت ہوا کہ اس سلسلے میں کوئی دعا و ذکر خصوصیت سے ثابت نہیں اور اس وقت ہر شخص کو اختیار ہے، لہذا یہ تخصیص و التزام بلاشبہ دین میں اضافہ اور بدعت ہے۔

مثلاً بعض جگہ: ”فضل من اللہ ونعمۃ ومغفرة ورحمة الخ“ ہر دو رکعت پر اور پھر ہر چار رکعت پر بالترتیب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود، حضرت صدیق اکبر، عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ثناء و منقبت اور ان پر دعاء رحمت کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں اور ان پر اتنا التزام اور اتنی پابندی کہ ان کے ترک پر مستقل نزاع اور جھگڑا قائم ہو جاتا ہے، اور نہ پڑھنے والوں کو ملامت کی جاتی ہے، اولاً تو ان دعاؤں کا ثبوت نہیں ہے؛ بل کہ یہ کسی شخص کی بنائی ہوئی ہیں۔

(۱) دیکھو: درمختار مع شامی: ۴۶/۲

لہذا ان دعاؤں کو نماز تراویح کے ترویحوں میں پڑھنے کا رواج اپنی طرف سے تخصیص ہے، پھر اس پر واجبات کی طرح التزام کیا جاتا ہے جو دوسری غلطی ہے، پھر ہر دو رکعت پر دعا بھی غلط ہے؛ کیوں کہ استراحت کا حکم چار رکعت پر ہے۔ اسی لیے علماء نے دو رکعت پر نماز کو بدعت و مکروہ قرار دیا ہے، چنانچہ ”درمختار“ میں اس کو مکروہ کہا ہے اور شامی رحمہ اللہ نے اس کے مکروہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ استراحت چار رکعت پر ہے نہ کہ دو رکعت پر۔ (۱)

اور شامی رحمہ اللہ نے ”منحة الخالق“ میں ربلی رحمہ اللہ سے اس کا بدعت ہونا نقل کیا ہے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جب دو رکعت پر استراحت نہ ہونے کی وجہ سے نماز درست نہیں تو دعا بھی درست نہیں؛ لہذا یہ دعا کا طریقہ تیسری غلطی ہے۔ اس لیے یہ بدعت میں داخل ہے۔

یہاں یہ بات بھی صاف ہو جانا چاہئے کہ بعض کتب فقہ میں چار رکعت پر درج ذیل دعا پڑھنے کی نشاندہی کی گئی ہے:

”سبحان ذی الملك والملکوت سبحان ذی العزة

والعظمة والهيبة والقدرة الخ.“

مگر یہ بھی ضروری و لازم نہیں اور نہ ہی یہی دعا اس وقت کے لیے مخصوص ہے۔ فقہاء کے طرز سے یہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے علامہ قہستانی رحمہ اللہ کے حوالہ سے یہ دعا نقل کی ہے؛ مگر یہ دعا انہوں نے ”درمختار“ کے اس قول

(۱) درمختار مع شامی: ۴۶/۲

(۲) منحة الخالق علی البحر الرائق: ۶۹/۲

کی شرح میں نقل کی ہے:

”اس وقت لوگوں کو اختیار ہے تسبیح، قرأت، خاموشی یا تنہاء نماز

پڑھنے میں۔“ (۱)

اس پر شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ تسبیح میں یہ پڑھا جائے (جو اوپر نقل ہوا) یہ طرز صاف بتا رہا ہے کہ یہ تسبیح ضروری نہیں اور نہ ہی مخصوص ہے۔ البتہ تسبیح میں اس کو بھی پڑھا جاسکتا ہے، لہذا اس پر بھی اس طرح التزام کہ واجب معلوم ہو اور اس کی تخصیص نہ کی جائے۔

سحری میں جگانے کے غیر مہذب طریقے

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ رمضان مبارک میں سحری کے لیے لوگوں کو بیدار کرنا ثواب کا کام ہے اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ رسالت میں بھی لوگوں کو جگانے کا انتظام تھا، مثلاً حدیث میں ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمْنَعَنَّ أَحَدًا مِنْكُمْ أَذَانَ بِلَالٍ مِّنْ سُحُورِهِ فَإِنَّهُ يَأْذُنُ لِيَرْجِعَ قَائِمُكُمْ وَيُوقِظَ نَائِمُكُمْ. »

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی کو بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری سے نہ روکے؛ کیوں کہ وہ رات میں (صبح صادق سے قبل) اس لیے اذان دیتے ہیں تاکہ تہجد میں مشغول لوگ لوٹ جائیں (اور سحری کر لیں) اور سونے والے جاگ اٹھیں۔“ (۲)

(۱) درمختار مع شامی: ۴۶/۲

(۲) بخاری: ۱، مسلم: ۳۵۰/۱

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ زمانہ رسالت میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے اذان کہا کرتے تھے؛ لہذا بیدار کرنے کے لیے تدبیر کرنا بلاشبہ دائرہ سنت کی چیز ہے اور ثواب کا کام ہے؛ مگر یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ بیدار کرنے کے لیے ناشائستہ اور غیر مہذب طریقہ اپنانا غلط بات، اسی طرح ناجائز طریقہ اپنانا ناجائز ہے۔ مثلاً بعض لوگ جو روزہ داروں کو سحری کے لیے جگانے اور ثواب کمانے کا بے حد جذبہ رکھتے ہیں، وہ زور زور سے چیخ کر یا بیہودہ آواز نکال کر یا فلمی گانوں کو گا کر یا میوزک اور باجے کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ناشائستہ ہونے کے ساتھ ناجائز بھی ہے، لہذا ان نیک جذبات کو، اچھے اور جائز طریقے سے پورا کرنا چاہئے۔

اس میں اس کا بھی خیال ہو کہ بیمار، بچے اور غیر مکلف لوگ تکلیف محسوس نہ کریں، اور کفار و مشرکین کے دلوں میں اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا نہ ہو جائے، بلکہ ایسا طرز عمل اور طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے کہ لوگوں کو بیدار کرنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور کسی کو تکلیف بھی نہ ہو اور نہ اسلام اور اس کی تعلیمات پر کوئی حرف آئے؛ کیوں کہ کفار و مشرکین ہماری بدتہذیبی کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دے لیں گے، تو ہم اسلام کے بارے میں بدگمانی کا ذریعہ و سبب بنیں گے۔ اس لیے اس طرح کی بے تکلی و ناشائستہ حرکات سے ضرور احتراز کرنا چاہیے۔

رمضان کے آخری جمعہ میں خطبہ الوداع کا التزام

رمضان مبارک کے چلے جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے، رمضان کے آخری جمعہ میں الوداع، الفراق، اسلام پر مشتمل خطبہ پڑھا جاتا ہے جس کو خطبہ الوداع بھی کہتے ہیں، اس میں دو باتیں خلاف شریعت ہیں:

(۱) ایک یہ کہ رمضان کے جانے پر افسوس و تاسف کا اظہار کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے، بلکہ فی الجملہ خوشی کا اظہار کرنا ثابت ہے؛ کیوں کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عید الفطر انعام اور مغفرت کا دن ہے، نیز اس دن خوشی کرنے اور اچھے کپڑوں اور کھانوں سے اس کا اظہار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، لہذا اس کے برخلاف افسوس و رنج کا اظہار کرنا خلاف شرع کام ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک فارسی میں لکھے گئے فتویٰ میں فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”خطبۃ الوداع کا حاصل رمضان کے پورا ہونے پر افسوس کا اظہار کرنا ہے اور اس طرح کا افسوس ظاہر کرنا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین خیر القرون میں کسی جگہ منقول نہیں ہے۔ بلکہ غور کریں تو تاسف کے بجائے ایک گونہ سرور و مسرت ختم رمضان پر مطلوب معلوم ہوتی ہے۔“ (۱)

(۲) دوسری بات یہ کہ اس رسم کو لازم و واجب کی طرح انجام دیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ آخری جمعہ رمضان میں خطبۃ الوداع و الفراق پڑھا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کو شریعت میں لازم نہیں کیا گیا اس کو لازم قرار دے لینا بدعت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ بات خلاف شرع نہ بھی ہو۔ چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے فی نفسہ خطبۃ الوداع کو مباح قرار دینے کے باوجود اس کے التزام کو بدعت قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”لیکن اہتمام کرنا خطبہ و دُاع کا جیسا کہ اس زمانہ میں مروج ہے اور اس کو حد التزام تک پہنچانا خالی ابتذاع (بدعت) سے نہیں، علماء معتمدین کو لازم ہے کہ اس طریقے کے التزام کو چھوڑیں تا کہ عوام اعتقاد استحباب و سنیت بلکہ ضروری ہونے اس طریقہ خاص سے نجات پائیں۔“ (۱)

الغرض یہ رسم بھی قابل ترک ہے تا کہ بدعت سے بچا جاسکے اور اصل دین پر محافظت ہو سکے۔

عید الفطر کی سویاں

عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عید گاہ تشریف لے جاتے تھے اور کھجور بھی طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔ (۲)

لہذا کھجور کا اہتمام کرنا بھی سنت ہے اور علما نے لکھا ہے کہ اگر اس کا انتظام نہ ہو تو کسی میٹھی چیز کا کھانا بہتر ہے۔ (۳)

مگر اس دن کے لیے اپنی طرف سے کسی خاص چیز کا التزام کرنا، من گھڑت بات ہے، جیسے بہت سے لوگ عید الفطر کے دن صبح سویاں (شیر خرما) پکاتے ہیں اور اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں اور سنت کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے، حالاں کہ خاص یہ چیز سنت نہیں ہے، بل کہ سنت تو کھجور ہے یا بعد کے درجہ میں کوئی بھی میٹھی چیز۔

(۱) مجموعۃ الفتاوی: ۲۱۸/۱

(۲) بخاری مع فتح الباری: ۴۳۶/۲

(۳) در مختار مع شامی: ۱۶۸/۲

اس عمومیت میں خصوصیت پیدا کرنا بلاشبہ من مانی ہے، جس سے بچنا چاہیے۔
کہنا یہ نہیں کہ سویاں پکانا غلط یا برا ہے، بل کہ یہ بتانا ہے کہ اس کو خاص کر لینا اور
اسی پر ہمیشہ پابندی کرنا غلط و من گھڑت ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ ”اصلاح الرسوم“ میں فرماتے ہیں:
”عید الفطر میں سویاں پکانے فی نفسہ مباح (جائز) ہے مگر لوگوں
نے اس میں خرابیاں پیدا کر لی ہیں (۱) اس کو ضروری سمجھتے ہیں حتیٰ کہ
سویاں نہ پکائی جائیں تو عید ہی نہیں ہوئی، اس کی پابندی کی بدولت
یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اگر پاس نہ ہو تو قرض لے کر گو سود ہی پر
ملے، ضرور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔“ (۱)

اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ ؓ نے عید الفطر میں سویاں بنائی
تھیں، یہ آپ پر تہمت اور الزام ہے۔ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا، لہذا یہ رسم
بھی قابل اصلاح ہے۔

خطبہ عید کی زبان

عیدین اور جمعہ کے خطبات میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو خطبے عربی زبان میں
پڑھے جائیں؛ کیوں کہ جناب رسالت مآب ﷺ اور حضرات صحابہ
و تابعین اور اس کے بعد بھی ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک پوری اسلامی دنیا میں یہی
طریقہ چلا آ رہا تھا، لہذا عربی زبان میں دو خطبات کا ہونا سنت ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ ”مصفی شرح موطا“ میں
لکھتے ہیں:

”جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ اور خلفاء راشدین کے خطبات کو ملاحظہ کیا تو اس سے چند چیزوں کی تنقیح ہوئی کہ ان خطبات میں حمد باری تعالیٰ، شہادتین، درود، تقویٰ کا حکم آیت قرآن کی تلاوت، مسلمانوں کے لیے دعا اور خطبات کا عربی میں ہونا پایا گیا..... آگے فرماتے ہیں کہ اس کا عربی میں ہونا اس لیے کہ مشرق و مغرب میں مسلمانوں کا عمل اسی پر مستمر ہے، حالاں کہ بہت سے ممالک میں ان کے مخاطب عجمی تھے۔“ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ کا عربی میں ہونا بھی خطبہ کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے ایک ہے؛ بل کہ بعض علما نے خطبہ کا عربی میں ہونا خطبہ کے صحیح ہونے کی شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ نووی شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الاذکار“ میں لکھا ہے:

”خطبہ جمعہ اور دوسرے خطبات کا عربی میں ہونا شرط ہے۔“ (۲)

حضرات علما کی ان تصریحات کے باوجود اکثر مقامات پر خطبات جمعہ و عیدین غیر عربی میں ہوتے ہیں، جو کہ سراسر بدعت اور مکروہ ہے، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اسی بدعت پر تنبیہ فرماتے ہوئے اپنے ایک عربی فتویٰ میں لکھتے ہیں:

”انہیں (مروجہ بدعات میں) سے جمعہ کے دن اور عیدین میں غیر عربی زبان میں خطبہ دینا ہے یا اس کا عجمی زبان میں ترجمہ کرنا ہے، یہ طریقہ خیر القرون کے بعد بلا علم کے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔“ (۳)

(۱) بحوالہ مجموعۃ الفتاویٰ عبدالحی لکھنوی: ۲/۲۲۸

(۲) بحوالہ مجموعۃ الفتاویٰ: ۲/۲۲۸

(۳) ایضاً: ۲/۲۲۷

اسی فتوے کے آخر میں یہ طور خلاصہ مضمون تحریر فرماتے ہیں:

”خطبہ کل یا اس کا بعض حصہ غیر عربی میں پڑھنا مکروہ اور خلاف سنت متواتر ہے؛ کیوں کہ اسلام کے صدر اول سے باوجود اس کے ضرورت کے اس کا ثبوت نہیں ملتا خصوصاً جب کہ بہت سے ممالک فتح ہو گئے اور اسلام مختلف دیار کے پھیل گیا (پھر بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔“ (۱)

الغرض جمعہ اور عیدین کا خطبہ غیر عربی زبان میں نہیں ہونا چاہئے کہ یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ عربی ہی میں دو خطبے ہونا چاہئے۔ یہاں بعض سطحیت پسند علماء سے فاش غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ لوگ کتب فقہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ آپ کے نزدیک غیر عربی میں خطبہ جائز ہے اور اس سے غیر عربی میں خطبہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے قول میں جواز کے معنی صحیح ہو جانے کے ہیں، جو فاسد کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ گناہ نہ ہونے کے معنی جو حرام و مکروہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کی کتب فقہ میں بے شمار مثالیں ملیں گی کہ حضرات فقہاء نے جائز کا لفظ صحیح کے معنی میں استعمال کیا ہے، اگرچہ وہ کام مکروہ و ناجائز کیوں نہ ہو۔ یہاں اس کی ایک دو مثالوں پر کفایت کی جاتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تکبیر تحریمہ میں اللہ اکبر کے بجائے کوئی اللہ جل یا اللہ الرحمن وغیرہ الفاظ کا استعمال کرے تو جائز ہے۔ (۲)

حالاں کہ خود فقہائے کرام نے اس کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ (۳)

(۱) ایضاً: ۲/۲۵۲

(۲) شرح وقایہ مع چلبی: ۳۸

(۳) دیکھو: در مختار مع شامی: ۱/۲۸۳

اسی طرح خطبہ جمعہ کو بغیر وضو پڑھنا فقہانے جائز قرار دیا اور مکروہ بھی بتایا ہے۔ (۱)

اور اس کو جو بغیر وضو خطبہ دے گنہگار بھی قرار دیا ہے۔ (۲)

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک کام کو فقہا جائز بھی کہتے ہیں اور مکروہ بھی اور اس جائز کام کے مرتکب کو گنہگار بھی، آخر اس کی کیا توجیہ ہے؟ یہی توجیہ ہے کہ جواز کے معنی صحیح و منعقد ہو جانے کے ہیں، اگرچہ وہ کام ناجائز و مکروہ ہو اس کی اصولی بحث کو احقر نے اپنے ایک رسالہ ”املاک مساجد“ میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔ (۳)

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں امام اعظم رحمہ اللہ نے جو فرمایا ہے کہ غیر عربی میں خطبہ جائز ہے، اس کا معنی یہی ہے کہ خطبہ ہو جائے گا، اگرچہ مکروہ و ناجائز ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اس حکم (جواز) میں اور حکم کراہت میں کچھ منافات (مخالفت) نہیں، صد ہا جگہ فقہاء ”يجوز“ و ”يصح“ (جائز و صحیح ہے) لکھتے ہیں اور غرض ان کی نفس اجزا و کفایت و جواز بالمعنی الاعم ہوتی ہے، نہ کہ اباحت مطلقہ خالیہ عن الکراہت..... اس کے بعد فقہا کی عبارات نقل کر کے آگے فرماتے ہیں: پس خوب واضح ہو گیا کہ خطبہ غیر عربیہ کی کراہت کا حکم مخالف اقوال فقہاء کے کسی طرح نہیں۔“ (۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں جمعہ و عیدین کا خطبہ مکروہ و بدعت ہے

(۱) مختصر القدوری: ۳۶

(۲) شامی علی الدرر: ۱۵۰/۲

(۳) دیکھو: املاک مساجد: ۱۰-۱۱

(۴) مجموعة الفتاوى: ۳۷۸/۲-۳۷۹

اور فقہاء نے جو جائز لکھا ہے، ان کی مراد اس سے خطبہ کا ہو جانا ہے، اگرچہ مکروہ ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے ان علماء کی غلطی واضح ہو گئی جنہوں نے فقہاء کے کلام سے غیر عربی خطبہ کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب ”جدید فقہی مسائل“ میں کیا ہے کہ فقہاء کی ان عبارات کو جواز بمعنی مباح لے لیا، پھر بعض علماء کی طرف غلط انتساب بھی کر دیا مثلاً علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ کی طرف جواز کا قول منسوب کر دیا پھر آپ کے حوالہ سے حضرت شاہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کی طرف بھی جواز کا قول منسوب کر دیا، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ اوپر ہم نے علامہ عبدالحی رحمۃ اللہ کا فتویٰ نقل کر دیا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیں تو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی بات کا صحیح نہ ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

نماز و خطبہ عید کے بعد دعا

عید کی نماز اور خطبہ کے بعد دعا کا کیا حکم ہے؟ اس پر حضرات علماء کے مابین بحث آئی ہے اور صحیح یہ ہے کہ دعا کے لیے چوں کہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور نماز و خطبہ کے بعد بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے عید کی نماز اور عید کے خطبہ کے بعد دعا کرنا فی نفسہ مباح ہے اور یہ جواز کا ثبوت عموماً حدیث سے ہوگا؛ کیوں کہ احادیث کے عموم سے نماز کے بعد اور اسی طرح کسی نیک کام کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، پس اسی عموم سے فی حد ذاتہ نماز و خطبہ عید کے بعد دعا جائز ہے، اگرچہ بہ طور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا ثبوت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ عبدالحی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے۔ (۱)

مگر یہاں دو باتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے، ایک تو یہ کہ عموماً حدیث سے بلا شک نماز و خطبہ عید کے بعد دعاء کا جواز ثابت ہوتا ہے؛ مگر اس کا وجوب یا التزام ثابت نہیں ہوتا، لہذا اس کی ایسی پابندی کرنا جیسی واجب امور کی کی جاتی ہے، بلاشبہ حد سے تجاوز اور بدعت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نماز و خطبہ دونوں کے بعد اور ان میں بھی زیادہ اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کرنے کا ثبوت ہوتا ہے، لہذا بلا تخصیص دونوں کے بعد یا اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کر لی جائے تو بلاشبہ جائز ہے؛ مگر نماز کے بعد دعاء کرنے کو برا سمجھنا اور خطبہ کے بعد دعاء کو ضروری سمجھنا یہ بلاشبہ تجاوز اور بدعت ہے، جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ان علاقوں میں دعاء کے متعلق ان دونوں اصولوں کی خلاف ورزی جاری ہے کہ اولاً تو نماز کے بعد دعاء نہیں کرتے اور اس کو غلط سمجھتے ہیں اور بعد خطبہ دعاء کو ضروری خیال کرتے ہیں، یہ اپنی طرف سے من گھڑت اور خلاف شرع بات ہے، لہذا اس رسم کو ترک کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اگرچہ دعاء ہر وقت جائز ہے مگر تخصیص بلا دلیل شرعی ہے، البتہ

بعد نماز کے آثار کثیرہ میں مشروع ہے اور دبر الصلوۃ (بعد نماز)

اوقات اجابت دعاء بھی ہے۔ بہر حال بعد نماز دعاء نہ کرنا اور بجائے

اس کے بعد خطبہ مقرر کرنا تغیر سنت ہے اور قابل احترام۔“ (۱)

حاصل یہ کہ دعاء کبھی بھی کی جاسکتی ہے، البتہ ایک وقت کو اپنی جانب سے دعاء

کیلئے خاص کرنا اور دوسرے وقت کو دعاء کیلئے نامناسب سمجھنا غلط ہے۔

عید کا مصافحہ و معانقہ

اسلامی آداب ملاقات میں سلام کے ساتھ مصافحہ منقول ہے اور احادیث میں اس کی تاکید و ترغیب آئی ہے۔ اسی طرح بوقت رخصت بھی مصافحہ کا ثبوت ملتا ہے۔^(۱) مگر ہمارے یہاں اور دوسرے بعض علاقوں میں مخصوص نمازوں اور عید کی نماز کے بعد جو مصافحہ کا طریقہ رائج ہے، یہ احادیث و آثار صحابہ و اقوال سلف سے ثابت نہیں ہے۔ مصافحہ بلاشبہ سنت و عبادت ہے؛ مگر اس کا موقعہ یا تو اول ملاقات ہے یا وقت رخصت، نمازوں کے بعد یا کسی اور تقریب کے موقعہ پر مصافحہ کرنا غیر مشروع ہے۔ لہذا عید کے موقعہ پر عید کا مصافحہ کرنا خلاف سنت ہے؛ بلکہ بدعت ہے۔ چنانچہ علماء نے مخصوص نمازوں کے بعد کے مصافحہ کو اسی وجہ سے سنت کے خلاف اور بدعت قرار دیا ہے کہ یہ اس کا موقعہ نہیں ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قد یکون جماعة يتلاقون من غیر مصافحة
ویتصاحبون بالكلام وهذا کرة العلم وغیره مدة مدیده
ثم اذا صلوا يتصافحون فاین هذا من السنة المشروعة
ولهذا صرح بعض علماء نا بانها مکروهة وحينئذ انها من
البدع المذمومة.“^(۲)

(کبھی کچھ لوگ بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے
ہیں اور باتوں اور علمی مذاکرہ وغیرہ میں ایک لمبی مدت مشغول رہتے

(۱) قاله الشيخ زکریا فی حاشيته علی الکوکب الدرّی: ۱۴۲/۲

(۲) حاشیه مشکوٰۃ: ۴۱

ہیں، پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہی، یہ سنت مشروعہ کہاں سے ہوا؟ اسی لئے ہمارے بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ مکروہ ہے اور اس وقت یہ مذموم بدعات میں سے ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ کی یہ عبارت ہمارے یہاں کے عید کے مصافحہ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کہ باپ بیٹا اور دیگر گھر کے افراد اور دوسرے احباب مل کر گھر سے نکلتے ہیں اور عید گاہ پہنچتے ہیں، آپس میں ملاقاتیں، بات چیت سب کچھ ہوتا ہے، جب عید کی نماز و خطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو یہی لوگ آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، حالاں کہ پہلے سے ملاقات ہے۔ لہذا یہ بدعت مذموم و مکروہ ہے۔

حاصل یہ کہ مصافحہ کا موقع ملاقات کا اول وقت یا رخصت ہونے کا وقت ہے، عید کا کوئی مصافحہ اسلام میں نہیں ہے۔ اسی طرح معانقہ (گلے ملنا) بھی بعض مواقع خاصہ میں جیسے سفر سے آنے کے وقت جائز بلکہ سنت ہے۔ مگر عید کے موقع پر معانقہ کرنا بے اصل بات ہے جب کہ بعض ائمہ کے نزدیک معانقہ تو ویسے بھی سنت نہیں ہے، بلکہ امام اعظم ابو حنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک (ایک قول کے مطابق) مکروہ ہے۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ نے تصریح کی ہے:

”ویکرہ أن یقبل الرجل فم الرجل أو یدہ أو شیاً منہ أو

یعانقہ۔“ (۱)

(مکروہ ہے کہ مرد مرد کا منہ یا ہاتھ یا کوئی اور عضو کا بوسہ لے یا

معانقہ کرے۔)

یہ امام محمد و ابو حنیفہ رحمہما اللہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور الجامع الصغیر (جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے) میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک بیان کرتے ہیں اور چوں کہ اس جگہ اپنایا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں اختلاف نہیں بتایا ہے، اس لئے یہ گویا سب ائمہ احناف کا متفقہ مسئلہ ہوا۔ اگرچہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اختلاف بتایا ہے، مگر بعض علماء کی تحقیق میں اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (۱)

اور یہ مکروہ ہونا بعض علماء کی تحقیق کے مطابق اس وقت ہے جبکہ شہوت کا خوف ہو اور بعض کے نزدیک ملاقات کے وقت مکروہ ہے۔ البتہ سفر سے آنے کے وقت یا غایت محبت و اشتیاق کے وقت مکروہ نہیں۔ (۲)

غرض یہ کہ معانقہ اگر جائز و سنت ہے بھی، تو اس کا موقعہ جو ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ عید کے دن نماز کے بعد ہونا چاہئے، یہ درست نہیں ہے، اس سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔

عید کے دن نئے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام

عید اہل اسلام کی خوشی و فرحت، بشارت و مسرت کا سب سے بڑا موقعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں اچھے کپڑوں، عمدہ کھانوں اور زیب و زینت کا اہتمام کر لینا بلاشبہ جائز اور ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قربانی کے دنوں بعض بچیاں یوم بعاث کے موقعہ کے اشعار خوشی و مسرت سے پڑھ رہی تھیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وہیں

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعلیٰ السنن: ۴۲۳/۱..... ۴۲۷/۱

(۲) اعلیٰ السنن: ۴۲۳/۱

چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو اور پڑھنے دو؛ کیوں کہ یہ عید کے ایام ہیں۔ (۱)

فقہائے کرام نے بھی عید کے مستحبات میں زینت اور اچھے لباس کو شمار کیا ہے۔ (۲)
اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تاریخ و سیر میں آیا ہے کہ وہ عید کے لیے اپنے سب سے اچھے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ (۳)

خلاصہ یہ کہ عید کے دن خوشی و فرحت کا اظہار کرتے ہوئے گنجائش کے مطابق اچھے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام کر لینا صحیح و درست ہے؛ مگر یہ بات گوش ہوش سے سننے اور دیدہ بصیرت سے ملاحظہ کرنے کی ہے کہ اسلام کی عید صرف کپڑوں اور کھانوں اور کھیل تماشوں کا نام نہیں ہے، کہ صرف انہی چیزوں میں اپنے دل و دماغ کے جوہر کو خرچ کر دیا جائے اور اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز انہی باتوں کو بنالیا جائے۔
بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر لوگ ان کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رمضان جیسے مبارک ماہ کی نور بار گھڑیوں کو خراب کرتے ہیں اور بعض رمضان کے شروع ہی سے اور بعض رمضان کے آخری ایام میں عبادت و طاعت کو چھوڑ کر تراویح اور دوسری نیکیوں کو خیر باد کہہ کر بازاروں میں عید کے کپڑوں، زیب و زینت کی چیزوں، جوتوں اور ٹوپوں کے خریدنے کے لئے گھومتے پھرتے ہیں اور مزید افسوس یہ کہ ہماری مائیں اور بہنیں، پوری بے حیائی اور مجرمانہ بے پردگی کے ساتھ جاتی ہیں اور گھنٹوں گھنٹوں گھومتی پھرتی ہیں، کیا عید منانے کا یہ اہتمام جس سے

(۱) متفق علیہ مشکوٰۃ: ۱۲۶

(۲) البحر الرائق: ۱۵۸/۲

(۳) فتح الباری: ۴۳۹

رمضان کا بابرکت مہینہ اکارت چلا جائے، عبادات معطل ہو جائیں اور مزید یہ کہ گناہوں میں اشتغال ہو جائے، جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

اسی طرح عید کے دن کھانوں کا ایسا اہتمام کہ عید محض ایک کھیل تماشا بن کر رہ جائے، کسی طرح گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ اس سے کون نا آشنا ہوگا۔ آپ عید کے دن عید گاہ چلے جا رہے ہیں اور پیر میں جوتے تک نہیں تھے۔ (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عید الاضحیٰ (بقر عید) کے دن ایک دفعہ مہمان کے سامنے حلیم (مختلف اناج ڈال کر ابالا ہوا کھانا) پیش کیا، تو مہمان نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! بہتر ہوتا کہ آج بطخ کھلاتے، اللہ نے تو مال کی زیادتی کر رکھی ہے۔ (۲)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کبھی ایسا اہتمام عید کے لباس و کھانے کا نہیں فرماتے تھے، جیسے آج ہم میں رائج و عام ہو گیا ہے، بل کہ بروقت جس قدر گنجائش ہوئی، اتنا اہتمام (حدود میں رہتے ہوئے) کر لیا کرتے تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ عید کے لیے علما و فقہانے نئے کپڑوں کو مستحب نہیں قرار دیا ہے؛ بل کہ مستحب صرف اس کو قرار دیا ہے کہ اپنے کپڑوں میں سے سب سے اچھے و عمدہ کپڑے پہنے جائیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نئے کپڑوں کے بغیر عید ہی نہیں ہوتی اور اس غلط رسم کی وجہ سے بعض لوگ قرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض تو سودی قرض لے کر نئے کپڑوں کا انتظار کرتے ہیں اور عید جیسی نعمت کو پا کر خدا کو ناراض کرتے ہیں۔ کس قدر افسوس ناک حالت ہے؟

(۱) منتخب کنز العمال بحوالہ حیاة الصحابة: ۶۶۲/۲

(۲) بدایہ بحوالہ حیاة الصحابة: ۳۲۶/۲

پھر عید کے ان فضول اخراجات، عمدہ کھانوں، نئے کپڑوں، بہترین جوتوں، خوشنما ٹوپوں، لڑکیوں کے لیے زیورات وغیرہ وغیرہ جن کی اقسام و انواع گنانے کی بھی ہمیں فرصت نہیں ہے، ان کی خاطر رمضان کا پورا مہینہ لوگ مال جمع کرنے اور جس طرح بھی مل جائے بٹورنے میں لگے رہتے ہیں، کیا رمضان اسی لیے آتا ہے؟

یہ سب اس لیے کہ ہم نے عید کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ کھائیں پییں، موج اڑائیں، زیب و زینت کر کے سیر و تفریح کرتے پھریں؛ مگر اچھی طرح یاد رکھو عید کا یہ مفہوم ممکن ہے کہ بندوؤں کی لغت میں ہو۔ عیسائیوں کی زبان میں ہو، یہود بے بہود کی اصطلاح میں ہو؛ مگر اسلام کی لغت و اصطلاح میں دراصل خدا کی رحمت و برکت کے اوپر خوش ہونے اور اس خوشی میں شکر الہی بجالانے کا نام ہے۔ ہم اپنی اس کتاب کو بھی اور اس مضمون کو بھی حضرت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کے ایک ملفوظ پر ختم کرتے ہیں جس میں عید کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

”عید خوشی و مسرت کا نام ہے اور اہل دنیا کے نزدیک ہر قسم کا سرور

و انبساط اور ہر طرح کی فرحت و ابہتاج عید کے مترادف ہے؛ لیکن

شریعت مقدسہ اور ملت بیضاء کی نظر میں عید اس خوشی و مسرت کو کہتے ہیں

جو نعمائے ربانی (اللہ کی نعمتوں) اور کرمہائے الہی کے شکر اور اس کے فضل

و جود پر ادائے نیاز کے لیے کی جاتی ہے، دنیا خود فانی ہے اور اس کے باغ

و بہار فانی، پھر اس پر کیا مسرت و انبساط؟ عید کی حقیقت اصل یہ اس دائمی

سرور میں مضمر ہے جس کی نسبت خود ذات احدیت سے وابستہ ہے۔“ (۱)

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو دین کی حقیقت سمجھنے اور رسومات غیر شرعیہ

و بدعات و خرافات سے بچنے کی توفیق بخشے۔ آمین

ضمیمہ مفیدہ

کتاب کی جب کتابت مکمل ہوگئی تو چند صفحے خالی رہ گئے، مناسب خیال کیا ان صفحات میں روزوں کی اغلاط کا تذکرہ جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے، یہاں ضمیمہ کی حیثیت سے نقل کر دیا جائے۔

روزے اور عید کی اغلاط

- (۱) مشہور ہے کہ ایک روزہ رکھنا اچھا نہیں، اس مشہور کی کوئی اصل نہیں۔
- (۲) ایک اعتقاد یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو، سارا ثواب اسی کو مل جاوے گا، حالاں کہ یہ غلط ہے، روزہ دار کو ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔
- (۳) یہ مشہور ہے کہ شبِ برأت کے حلوہ سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جاوے، بہت ثواب ہے، یہ بالکل غلط ہے۔
- (۴) روزہ کی نسبت تمسخر (مذاق) کے کلمات کہنا مثلاً یہ کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا کفر ہے۔
- (۵) اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید کی شب میں روزہ ہوتا ہے اور صبح کو کہتے ہیں روزہ کھول لو، یہ بالکل بے اصل ہے۔
- (۶) بعض عورتیں اپنی لڑکی کے نکاح کے دن روزہ رکھنا ضروری سمجھتی ہیں، یہ محض بے اصل ہے۔
- (۷) بعض جگہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ششِ عید کے روزے رکھ لے تو سود کا گناہ ختم ہو جاتا ہے، یہ یہودہ بات ہے، سود کا گناہ اس طرح ختم نہیں ہوتا۔

(۸) آج کل عام طور سے بچوں کو عید گاہ لیجانے کا عام رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لیے ہوتا ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں۔

(۹) بعض جگہ عیدین کی امامت موروثی طریقے پر کرائی جاتی ہے، خواہ امامت میں اہلیت ہو یا نہ ہو، بعض جگہ تو امام قرآن بھی صحیح نہیں پڑھتا، ایسی صورت میں نماز ہی سب کی باطل ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اکثر عوام خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک سن کر بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ زبان سے درود شریف نہ پڑھے، ہاں دل ہی دل میں پڑھ لینے کا مضائقہ نہیں۔

(۱۱) عید، بقرعید اور جمعہ میں لوگ رسم جان کر مصافحہ کرتے ہیں یا گلے ملتے ہیں، یہ کہیں قرآن و حدیث میں ثابت نہیں۔ اس لیے یہ رسم بدعت ہے۔

(م، ع)

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی
مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگاہ اولیں

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد:

رمضان المبارک کا مہینہ، ہر سال اپنی تمام تر برکتوں، فضیلتوں، بڑائیوں اور بزرگیوں کے ساتھ ہم پر جلوہ فگن ہوتا اور پھر رخصت ہو جاتا ہے؛ مگر ہم جن برائیوں، غفلت اندیشیوں، نالائقیوں اور اندھیروں میں گھرے ہوئے، پڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے ذرہ برابر نہیں نکلتے؛ بل کہ اور گھرتے چلے جاتے ہیں، آخر اس کی وجہ و علت؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ماہ رمضان آتا اور جاتا ہے؛ مگر ہم اس سے استفادہ کرنے اور فیض اٹھانے کی کوئی سعی و کوشش نہیں کرتے، جیسے سورج نکلے، روشنی پھیلے، دن نمودار ہو جائے اور کوئی بے وقوف آنکھ بند کیے بیٹھا رہے، تو اس بے وقوف کو ان عظیم الشان روشنی اور نور سے کوئی حصہ نہ ملے گا اور وہ جیسے رات کی اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا رہا تھا، اب بھی بھٹکتا پھرے گا، اب کون کہہ سکتا ہے کہ روشنی نمودار نہیں ہوئی؟ یا روشنی نے فائدہ نہ دیا؟ نہیں؛ بل کہ روشنی پھیلی، اس نے اپنی جلوہ نمائی سے سارے عالم کو منور کر دیا، ہر ایک نے اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق اس سے فیض بھی پایا، ہاں! جس نے نور دیکھنا ہی نہ چاہا، فیض پانا ہی گوارا نہ کیا، آنکھ کھولنے کی زحمت ہی نہ اٹھائی، وہ بلاشبہ محروم رہا اور رہے گا۔

یہی حال ہمارا ہے کہ رمضان کی مبارک ساعتیں ہم پر اپنا سایہ پھیلا دیتی ہیں، اس کے نور کی بدلیاں سارے عالم پر نور افشانی کرتی ہیں اور ذرہ ذرہ معمور اور اس

کے نشہ سے مخمور ہو جاتا ہے؛ مگر ہم اس نور کا مشاہدہ کرنے کے لیے آنکھ نہیں کھولتے، اس کے برکات و فضائل سے اخذ فیض کے لیے کبھی راغب نہیں ہوتے، کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ رمضان جیسے عظیم البرکات مہینہ کا ہم استقبال کریں، اس کا احترام کریں، اس سے اپنے تعلق کا اظہار کریں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں تھے وہیں اور جیسے تھے ویسے ہی رہ جاتے ہیں، اور رمضان اپنا سایہ ہم پر سے اٹھا لیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے، یہ صورت حال کس قدر سنگین اور دردناک اور خطرناک ہے، یہ بالکل ظاہر ہے۔ الغرض ہماری غفلت حد کو پہنچ چکی ہے اور ہم نہایت نلکے ہو چکے ہیں، اس لیے اب ضرورت ہے اس کی کہ ہم ان غفلت کے پردوں کو جو ہم پر پڑے ہوئے ہیں، چاک کر ڈالیں اور بے عملی و بد عملی کی سیاہیوں کو دھو ڈالیں اور بیدار، متیقظ ہوشیار اور پاک و صاف ہو جائیں، گناہوں کی جہنم سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں، نیکیوں اور اعمال صالحہ کے خزانوں کو جمع کر لیں اور ہر طرح کی محرومیوں سے نکل کر خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے لٹائی جانے والی رحمتوں و برکتوں سے خوب خوب فیض پائیں۔

زیر نظر رسالہ جس کا نام ”**نفحات رمضان**“ ہے، اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ رمضان میں ہم کو کیا کرنا ہوگا؟ رمضان کی برکتوں سے ہم کس طرح مستفیض ہو سکیں گے؟ اسی طرح اس میں ہم نے رمضان کے مخصوص اعمال سے بحث کی ہے اور ان کے احکام کو بہ قدر ضرورت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ قارئین و مستفیدین اس ناکارہ کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔ فقط

۲۹ / رجب ۱۴۰۸ھ محمد شعیب اللہ خان
(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رمضان کی فضیلت

رمضان مبارک کی فضیلت پر ہم نہایت اختصار سے کلام کریں گے؛ کیوں کہ اس کے فضائل کے سلسلہ میں بہت سے رسائل شائع و عام ہو چکے ہیں، خصوصاً حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کا رسالہ ”فضائل اعمال“ نہایت مفید و موثر اور بہت مشہور ہے، اس کو دیکھ لیا جائے؛ کیوں کہ ہمارا مقصود رمضان کے مخصوص اعمال اور ان کے احکام بیان کرنا ہے۔

رمضان کی فضیلت بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتی ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ فَتُفْتَحُ ابْوَابُ السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ

ابْوَابُ جَهَنَّمَ وَتُسَلِّسُ الشَّيَاطِينُ. » (۱)

(جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے

ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔)

(۲) ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت رسول اللہ نے فرمایا:

« اِذَا جَاءَ رَمَضَانَ فَتُفْتَحُ ابْوَابُ الْجَنَّةِ. » (۲)

(جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔)

(۱) البخاری: ۱۷۶۶

(۲) البخاری: ۱۷۶۵/مسلم: ۱۷۹۳

(۳) حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ رمضان آچکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکت والا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں (اپنی رحمت سے) ڈھانپ لیتے ہیں، تم پر رحمت نازل فرماتے ہیں۔ خطاؤں کو معاف کرتے اور دعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور تمہارے تنافس (ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھنے) کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ پر فخر فرماتے ہیں، پس تم اللہ تعالیٰ کو نیکی دکھاؤ، بد نصیب وہ ہے جو اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے۔“ (۱)

(۴) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر دن و رات میں (جہنم کے) قیدی آزاد کیے جاتے ہیں، یعنی رمضان میں اور ہر مسلمان کے حق میں ہر دن و رات میں ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے۔“ (۲)

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

» اتاكم شهر رمضان، شهر مبارك فرض الله عليكم صيامه تفتح فيه ابواب السماء وتغلق فيه ابواب الجحيم، وتغل فيه مردة الشياطين، لله فيه ليلة خير من الف شهر،

(۱) مسند الشاميين للطبراني: ۳/۲۷۱، الترغيب: ۹۹/۲

(۲) الترغيب: ۱۰۳/۲

من حرم خیرھا فقد حرم .» (۱)

(تمہارے پاس ماہ رمضان آچکا ہے، وہ ماہ مبارک جس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کیے ہیں، اس ماہ میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شریر شیاطین کو بیڑی ڈال دی جاتی ہے، اس ماہ میں ایک ایسی رات ہے جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس کے خیر سے محروم کر دیا گیا وہ واقعی محروم ہو گیا۔)

ان چند احادیث سے رمضان مبارک کی فضیلتوں و بزرگیوں کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پہلی اور دوسری حدیث میں رمضان مبارک کے احترام میں جنت و آسمان کے دروازوں کا کھول دیا جانا اور جہنم کے دروازوں کا بند کر دیا جانا مذکور ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس مہینہ میں اللہ کی رحمتوں کا بڑے وسیع پیمانے پر نزول ہوتا ہے، اور اللہ کا غضب نازل نہیں ہوتا، نیز پہلی حدیث میں مذکور ہے کہ اس ماہ میں شیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے، اس سے وہ شیاطین مراد ہیں جو لوگوں کو گم راہ کرتے اور بہکاتے ہیں۔

تیسری حدیث میں بھی رمضان کا بابرکت ہونا اور اس میں اللہ کی رحمتوں کا نازل ہونا اور دعاؤں کا قبول کیا جانا مذکور ہے، اور ساتھ ہی نیکیوں میں تنافس کا پسندیدہ ہونا اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فرشتوں میں فخر فرمانا بھی بیان ہوا ہے۔

تنافس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں، اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا

کہ رمضان کی برکتوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو نیکیوں میں دل چسپی لیتا ہے، ورنہ وہ محروم ہی رہے گا، اسی لیے آخر میں فرمایا کہ وہ بڑا بد نصیب ہے جو اس ماہ میں بھی رحمت سے محروم ہو جائے۔

اور چوتھی حدیث میں دو باتوں کا ذکر ہے، ایک تو یہ کہ رمضان میں ہر دن و رات میں بہت سے لوگوں کو جہنم سے آزاد کیا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ مسلمان کی ایک نہ ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے، یہ بھی رمضان کی برکت کا نتیجہ ہے۔

اور پانچویں حدیث میں ماہ رمضان کا مبارک ہونا اور اس میں روزوں کی فرضیت اور آسمانوں کے دروازوں کا کھول دیا جانا اور جہنم کے دروازوں کا بند کر دیا جانا اور شیاطین کا بیڑیوں میں جکڑ دینا جاندار ہے، نیز لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس کا مقام بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، پھر آخر میں فرمایا کہ جو اس کے خیر سے محروم رہ گیا وہ واقعی محروم رہ گیا۔

ماہ رمضان کی خصوصیات

ماہ رمضان مبارک بے شمار خصوصیتوں کا حامل ہے، اور یہ خصوصیات کسی اور ماہ کو حاصل نہیں ہیں، اسی لیے اس ماہ کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ما مری بالمسلمین شہر خیر منه.» (۱)

(مسلمانوں پر کوئی مہینہ اس (رمضان) سے زیادہ بہتر نہیں گذرا۔)
الغرض ماہ رمضان بڑی خصوصیات کا مہینہ ہے، یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اجرو ثواب میں زیادتی

رمضان میں اعمال کا ثواب، عام دنوں کے اعتبار سے بہت زیادہ عطا کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی لمبی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص اس مہینہ میں نفل عبادت کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہے، وہ اس شخص کے مانند جو اور دنوں میں فرض ادا کرے، اور جو اس مہینہ میں ایک فرض ادا کرے وہ اس آدمی کے مثل ہوگا جو دوسرے دنوں میں ستر (۷۰) فرض ادا کرے“۔ (۲)

(۱) صحیح ابن خزيمة: ۱۸۸/۳

(۲) صحیح ابن خزيمة: ۱۹۱/۳، شعب الایمان: ۳۰۵/۳، مسند الحارث: ۴۱۲/۱

جنت کے دروازوں کا کھل جانا اور دوزخ کے دروازوں کا بند ہو جانا جیسا کہ اوپر احادیث گذر چکی ہیں کہ رمضان آتا ہے تو دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

شیاطین کا بند ہو جانا

حدیث میں ہے کہ رمضان میں شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے جیسا کہ اوپر گذرا۔ اور اس سے مراد وہ شیاطین و جن ہیں جو لوگوں کو گم راہ کرتے اور بہکاتے ہیں، کیوں کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۵۷ میں ہے، اس ماہ میں ان شریر جنات و شیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے کہ وہ اب اس قابل نہیں رہتے کہ کہ لوگوں کو گم راہ کر سکیں۔

اب رہا یہ سوال کہ بہت سے لوگ رمضان میں بھی گم راہ ہوتے یا کم راہ رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یا تو نفس کے بہکانے کی وجہ سے ہے یا شیاطین کے ان اثرات کا نتیجہ ہے جو سال بھر لوگوں کے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں پیوست ہو گئے تھے اور اب اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآن کا اسی ماہ میں نازل ہونا

رمضان مبارک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی مہینہ کو اللہ نے قرآن پاک کے نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔

چنانچہ خود قرآن میں اس کا ذکر ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

(رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔)

لیلۃ القدر کا آنا

ایک خصوصیت رمضان کی یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر جو ہزاروں مہینوں سے افضل ہے وہ اسی مہینہ میں آتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اس مہینہ میں ایک رات آتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے“۔ (۱)

(۱) نسائی: ۲۱۰۶، مسند احمد: ۷۱۲۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رمضان

اب ہم رمضان مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمولات اور جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں؛ تاکہ ان حضرات کے اسوہ پر چلنے کی رغبت پیدا ہو۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ شَدَّ

مِنْزَرَهُ ثُمَّ لَمْ يَأْتِ فِرَاشَهُ حَتَّى يُنْسَلِخَ. » (۱)

(جب رمضان داخل ہو جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازار کو

سخت باندھتے، پھر جب تک رمضان گزر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔)

فائدہ: ازار کو سخت باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورے اطمینان سے

عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے، یہ عبادات میں جدوجہد کرنے سے کنایہ ہے

اور بعض علما نے فرمایا کہ یہ عورتوں (ازواج مطہرات) سے علیحدہ رہنے سے کنایہ

ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ بہ یک وقت اس سے دونوں باتیں مراد ہوں۔ (۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کا پورا مہینہ

عبادت میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہتے تھے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں:

(۱) صحیح ابن خزمہ: ۳/۳۴۲، شعب الایمان: ۳/۳۱۰، واسنادہ حسن کما فی

اعلاء السنن: ۲/۲۱

(۲) شرح مسلم للنوی: ۱/۳۷۲، فتح الباری: ۴/۲۶۹، نیل الاوطار: ۴/۳۶۲

«إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَكَثُرَتْ صَلَوَتُهُ وَابْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ وَأَشْفَقَ مِنْهُ.» (۱)

(جب رمضان آتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہو جاتی اور آپ دعا میں گڑ گڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں آپ کثرت کے ساتھ نماز پڑھتے اور دعائیں کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ نماز سے یہاں نفل نماز ہی مراد ہے؛ کیوں کہ فرائض و واجبات تو مقرر ہیں، ان میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی اور رنگ بدل جانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ کثرت عبادات کی وجہ سے اور پے درپے روزوں کی وجہ سے آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا، جیسا کہ عام طور پر مجاہدہ و ریاضت کرنے سے ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ حالت بدل جانے سے کنایہ ہے، مطلب یہ ہے کہ عام دنوں کی حالت سے رمضان میں آپ کی حالت دوسری ہوتی کہ عام دنوں میں اتنی کثرت سے نمازیں اور دعائیں نہ ہوتیں، جیسے رمضان میں ہوتیں، ہمارے محاورے میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں کا رنگ ہی بدل دیا گیا، یعنی حالت بدل گئی اور حرص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں نیکیوں کی حرص کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِزْرَةً وَأَحْيَا لَيْلَهُ وَأَيَّقَظَ أَهْلَهُ.» (۲)

(۱) شعب الایمان: ۳/۳۱۰

(۲) البخاری: ۱۸۸۴، واللفظ له، مسلم: ۲۰۰۸، نسائی: ۱۶۲۱، ابو داؤد: ۱۱۶۸، ابن ماجہ: ۵۸، مسند احمد: ۲۳۰۰۱، صحیح ابن حبان: ۲/۲۵

جب (رمضان کا آخری) عشرہ آجاتا تو آپ ﷺ اپنی ازار سخت باندھتے اور راتوں کو جاگتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگادیتے۔

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَّلِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهَا. » (۱)

(آپ ﷺ آخری عشرہ میں اتنی جدوجہد (عبادت میں) کرتے تھے کہ دوسرے دنوں میں اتنی نہیں کرتے تھے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ خاص طور پر آخری عشرہ میں بڑا مجاہدہ فرمایا کرتے تھے؛ حتیٰ کہ اپنے اہل خانہ کو بھی عبادات کے لیے جگادیا کرتے تھے۔

(۵) حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَقِيَ مِنْ رَمَضَانَ عَشْرَةٌ أَيَّامٍ يَدْعُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِهِ يُطِيقُ الْقِيَامَ إِلَّا أَقَامَهُ. » (۲)

(جب رمضان کے دس دن باقی رہ جاتے تھے تو آپ اپنے گھر والوں میں سے کسی ایسے شخص کو اٹھائے بغیر نہ چھوڑتے جو اٹھنے کی طاقت رکھتا۔)

(۱) مسلم: ۲۰۰۹، ترمذی: ۷۲۶، ابن ماجہ: ۱۷۵۷، احمد: ۲۳۷۶۶، ابن خزیمہ: ۳۴۲/۳

(۲) ذکرہ الحافظ عن الترمذی فی الفتح: ۲۶۹/۴، وکذا ذکرہ الشوکانی فی النیل و المبارکبوری فی تحفة الاحوذی، ولکنی لم أجده فیہ ولا فیما عندی من کتب الحدیث۔

(۶) حضرت عائشہ، ابن عمر و ابوسعید خدری، انس رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری تھا۔ (۱)

(۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَصُومُ رَمَضَانَ» (۲)

(رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اپنے گھر والوں کو جگادیا کرتے تھے۔)

(۸) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام اوقات سے زیادہ رمضان میں سخی ہو جاتے تھے، جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے، اور جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملتے تھے، یہاں تک کہ رمضان گزر جاتا، نبی کریم ﷺ انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔ غرض جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے تو آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ نیکی میں سخی ہو جاتے تھے۔ (۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ رمضان میں سخاوت و خیرات بہت زیادہ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ آپ رمضان میں قرآن پاک کے سنانے میں اہتمام فرماتے تھے،

(۱) البخاری: ۱۸۸۵-۱۸۸۷، مسلم: ۲۹۹۲، ترمذی: ۷۲۰، ابن خزیمہ: ۳/۳۳۶، ابن حبان: ۲۲۲/۸

(۲) ترمذی: ۷۲۵، مسند بزار: ۳۰۰/۲، مسند احمد: ۷۲۲

(۳) بخاری: ۱۷۶۹، مسلم: ۲۲۶۸، نسائی: ۲۰۶۸، احمد: ۳۲۵۰، ابن خزیمہ: ۱۹۳/۳، ابن حبان: ۲۲۵/۸

بعض روایات میں ہے کہ آپ ہر سال رمضان میں حضرت جبریل عَلَیْہِ السَّلَام کو قرآن کا وہ حصہ جو نازل ہو چکا ہو تاسنایا کرتے تھے اور آخری سال آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ (۱)

(۹) ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رمضان کی رات میں رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تو آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ مسجد کے ایک کونے میں نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ ایک نے عرض کیا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس قرآن نہیں ہے، یعنی حفظ یاد نہیں ہے اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ پڑھتے ہیں اور یہ لوگ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا کیا، ٹھیک کیا۔ (۲)

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم رات کے دریانی حصہ میں باہر نکلے اور مسجد میں نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ چند لوگوں نے بھی نماز پڑھی، صبح لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا اور دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے، آپ نے نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر صبح اس کا چرچا ہوا، تو تیسری رات بہت لوگ جمع ہو گئے، آپ صَلَّی اللہ علیہ وسلم نے اس رات بھی نماز پڑھائی اور لوگوں نے نماز پڑھی اور چوتھی رات اس قدر جمع ہو گیا کہ مسجد میں گنجائش نہ رہی؛ مگر آپ صَلَّی اللہ علیہ وسلم اس رات نہیں آئے اور فجر کی نماز کے لیے تشریف لائے اور نماز کے بعد فرمایا کہ میں تم لوگوں کے یہاں موجود

(۱) مسند عبد بن حمید: ۱/۲۱۷، شعب الایمان: ۲/۴۱۴

(۲) ابو داؤد: ۱۱۶۹، ابن خزیمہ: ۳/۳۳۹، ابن حبان: ۲۸۲، سنن بیہقی: ۲/۴۹۵

ہونے سے بے خبر نہیں تھا؛ مگر مجھے خوف و اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے اور تم اس کو ادا نہ کر سکو۔ (۱)

(۱۱) حضرت ربیع بنت معوذہؓ فرماتی ہیں کہ ہم خود روزہ رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو روزہ رکھاتے تھے اور روئی کے کھلونے بنا کر رکھتے، کہ جب وہ روتے تو وہی کھلونے ان کو دے دیتے تھے۔ (۲)

فائدہ: حضرت ربیعؓ کی یہ بات اگرچہ عاشوراء کے روزے کے بارے میں آئی ہے اور یہ عاشوراء کا روزہ، رمضان کے روزوں کی فرضیت سے قبل فرض تھا، جب عاشوراء کے فرض روزے کا اس قدر اہتمام ان حضرات میں تھا کہ وہ بچوں کو تک روزہ رکھواتے تھے تو اندازہ کرنا چاہئے کہ رمضان کے روزوں کا کیا حال ہوتا ہوگا اور اس کا کس قدر اہتمام کرتے ہوں گے؟

(۱۲) ایک شخص کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ اس نے رمضان میں شراب پی لیا ہے، آپؓ نے فرمایا کہ تیری خرابی ہو، ہمارے بچے تک روزہ دار ہیں اور اس پر حد (سزا) جاری کیا اور اسی کوڑے لگوائے۔ (۳)

یہ چند روایتیں ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا معمول رمضان میں معلوم ہوتا ہے۔

(۱) البخاری: ۱۸۷۳، مسلم: ۲۱۷۱، نسائی: ۱۵۸۶، ابو داؤد: ۱۱۶۶، احمد: ۲۳۱۹۴

(۲) البخاری: ۱۸۲۴، مسلم: ۱۹۱۹

(۳) بخاری تعلیقاً: وسعید بن منصور و البغوي موصولاً، کذا فی فتح الباری: ۲۰۱/۴

عشرۃ اخیرہ کی فضیلت

ایک طویل حدیث میں جس کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا، اور اس میں ایک بات یہ بھی فرمائی:

« وَهُوَ شَهْرُ أَوَّلِهِ رَحْمَةً وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةً وَآخِرُهُ عِتْقٌ

مِّنَ النَّارِ. » (۱)

(ماہ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ

مغفرت، اور آخری حصہ آگ سے آزادی وہ خلاصی ہے۔)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے تین حصے قرار دیے گئے ہیں: اول، اوسط اور آخر اور یہ دس دس ایام پر مشتمل ہوں گے، یا پہلا اور اوسط حصہ دس دس ایام کا اور آخری حصہ نو ایام کا ہوگا، پھر پہلے عشرے کو رحمت کا دوسرے کو مغفرت کا اور تیسرے کو یعنی آخری حصہ کو دوزخ سے خلاصی کا قرار دیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

”آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن پر گناہوں کا بوجھ

نہیں، ان کے لیے شروع ہی سے رحمت و انعام کی بارش ہو جاتی ہے،

(۱) أخرجه ابن خزيمة في صحيحه: ۳/۱۹۱، والبيهقي في شعب الإيمان: ۳/۲۰۵،

عن سلمان الفارسي في حديث طويل

دوسرے وہ لوگ جو معمولی گناہ گار ہیں، ان کے لیے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد ان کے روزوں کی برکت اور بدلے میں گناہوں کی معافی ہوتی ہے، تیسرے وہ جو زیادہ گناہ گار ہیں ان کے لیے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خلاصی ہوتی ہے۔ (۱)

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی مایہ ناز کتاب ”معارف الحدیث“ میں اسی شرح کو اختیار فرمایا ہے۔ (دیکھو معارف الحدیث: ۵/۱۰۳)

اس تشریح کے مطابق ثابت ہوا کہ رمضان کا آخری عشرہ بڑے سے بڑے گناہ گاروں کے لئے بھی مغفرت کا پیغام لے کر آتا ہے، اس میں رمضان کے آخری عشرہ کی کتنی بڑی فضیلت نکلتی ہے؟ جو لوگ اپنی سال بھر کی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق ہو چکے ہوتے ہیں اگر وہ رمضان میں روزوں اور تراویح اور دیگر عبادات کے ذریعہ جہنم سے آزاد ہونا چاہیں، تو ان کو یہ بات ضرور حاصل ہوگی۔

بہر حال اس حدیث سے آخری عشرہ کی ایک اہم ترین فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ بد بخت سے بد بخت آدمی بھی اگر اس ماہ میں ان نیکیوں میں لگا رہے، تو اس کی بھی نجات ہو جاتی ہے۔

عشرۃ آخرہ کا ذکر قرآن میں

اور اس عشرۃ اخیرہ کی فضیلت کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ (الفجر: ۱-۲)
(قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی)

اس میں دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اس میں علما کے متعدد اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد رمضان المبارک کے آخری دس دن ہیں۔

چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد رمضان کے آخری دس دن ہیں اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے؛ بل کہ علامہ تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر اتفاق کا دعویٰ کیا ہے کہ اس سے یہی دس (رمضان کے دس دن) مراد ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (۱)

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ضحاک سے اپنی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے۔ (۲)

اس قول پر رمضان کے عشرہ اخیرہ کی فضیلت یوں ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان دس دنوں کی قسم کھائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کی قسم کھانا ان ایام کی فضیلت کی دلیل ہے۔

(۱) روح المعانی: ۳۰/۱۳۷

(۲) تفسیر قرطبی: ۲۰/۳۹

رمضان کے مخصوص اعمال

رمضان میں اگرچہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی عبادات کا اہتمام ہونا چاہئے اور ان اعمال و عبادات میں سے جن اعمال و عبادات کو رمضان مبارک کے ساتھ خصوصیت کا تعلق ہے ان کا اہتمام و التزام بھی خصوصی طریقے پر ہونا چاہئے اور وہ چار اعمال ہیں:

(۱) صوم یعنی روزہ

(۲) نماز تراویح

(۳) آخری عشرہ کا اعتکاف

(۴) تلاوت

لہذا تمام عبادات و اعمال صالحہ میں اضافہ اور ان کا اہتمام و التزام کرنا اور بالخصوص ان چار عبادات کا اہتمام کرنا رمضان کو صحیح طریقے پر گزارنے کے لیے ضروری ہے، اب ہم ان چار عبادات کا الگ سے ذکر کرتے ہیں۔

روزے کا بیان

روزے کی فرضیت واہمیت

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرة: ۱۸۳)

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔)

اس آیت سے روزے کی فرضیت واہمیت صاف ظاہر ہے، فرضیت تو اللہ کے یہ فرمانے سے معلوم ہوئی کہ تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں اور اہمیت کا پتہ اس طرح چلا کہ روزے کی فرضیت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ تقویٰ ہی کی بنیاد پر انسان اللہ کے نزدیک مکرم و مقدس بنتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳)

(اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے

زیادہ متقی ہو۔)

اور جو چیز کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرنے والی ہو، وہ اس لحاظ سے کہ تقویٰ کا سبب و باعث ہے کس قدر اہم ہے۔

نیز اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اکثر حضرات کے نزدیک

صوم، اسلام کے ارکان میں سے زکاۃ کے بعد سب سے اہم عبادت ہے اور بعض علما کے نزدیک نماز کے بعد سب سے زیادہ اہم روزہ ہے اس کے بعد زکاۃ کا درجہ ہے اور امام محمد رحمہ اللہ نے اسی کے پیش نظر اپنی کتاب ”الجامع الصغیر“ اور ”الجامع الکبیر“ میں نماز کے بعد صوم کا بیان لکھا ہے۔ (۱)

روزے کی فضیلت

اس اہمیت کی وجہ سے روزے کی بڑی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من

ذنبه. ومن قام ليلة القدر ایمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من

ذنبه. » (۲)

(جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر رمضان کے روزے رکھتا

ہے، اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ اور جو لیلۃ القدر میں

ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر عبادت کرتا ہے، اس کے بھی تمام گزشتہ

گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

« قال الله تعالى: كل عمل ابن آدم له الا الصيام، فانه

(۱) دیکھو فتح القدیر: ۱/۳۰۰، حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی ۱/۴۱۹، البحر

الرائق: ۲/۲۸۶

(۲) البخاری: ۱۷۶۸، مسلم: ۱۲۶۸، نسائی: ۲۱۸۳، ابوداؤد: ۱۱۶۵، احمد: ۱۹۰۰

لي وأنا أجزي به. والصيام جنة، وإذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث ولا يصخب، فإن سابه أحد أو قاتله فليقل أنى أمراً صائم، والذي نفس محمد بيده لخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك، للصائم فرحتان يفرحهما، إذا افطر فرح وإذا لقي ربه فرح بصومه. »

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزہ کے، کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، اور روزہ (جہنم سے بچاؤ کے لیے) ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو بے حیائی کی باتیں نہ کرے اور نہ چیخے، اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑائی کرے، تو کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے بلاشبہ روزہ دار کی منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ بہتر ہے، اور روزہ دار کو دو فرحتیں ملتی ہیں: ایک اس وقت جب وہ افطار کرتا ہے، اور دوسرے اس وقت جب وہ اللہ سے ملے گا تو وہ اپنے روزہ سے خوش ہوگا۔) (۱)

(۳) حضرت سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ان في الجنة بابا يقال له الريان، يدخل منه الصائمون يوم القيامة، لا يدخل منه أحد غيرهم، يقال ابن الصائمون؟ فيقومون لا يدخل منه أحد غيرهم، فإذا دخلوا أغلق، فلم يدخل منه أحد.» (۲)

(۱) البخاري: ۱۷۷۱، مسلم: ۱۹۴۷، نسائي: ۲۱۸۶، احمد: ۷۳۶۸

(۲) البخاري: ۱۷۶۳، مسلم: ۱۹۴۷

(جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الریان ہے، اس سے قیامت کے دن روزے دار داخل ہوں گے، اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس سے داخل نہ ہوگا، کہا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ وہ کھڑے ہوں گے ان کے علاوہ کوئی اور اس سے داخل نہ ہو سکے گا، جب یہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا، پس کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔)

(۴) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام ریان ہے، روزے دار اسی سے بلائے جائیں گے، جو روزہ رکھنے والا ہوگا وہ اسی سے داخل ہوگا اور جو اس سے داخل ہوگا وہ کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔ (۱)

(۴) حضرت ابوسعید خدری رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

”جو اللہ کے راستہ میں روزہ رکھتا ہے اس کو دوزخ سے ستر برس کی مسافت کی مقدار دور رکھے گا۔“ (۲)

(۵) حضرت ابوسعید خدری رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

« من صام رمضان وعرف حدوده وتحفظ مما كان ينبغي له ان يتحفظ فيه كفر ما قبله. » (۳)

(۱) ترمذی: ۶۹۶، نسائی: ۲۲۰۴، ابن ماجہ: ۱۶۳۰، احمد: ۲۱۷۷۵

(۲) البخاری: ۲۶۲۸، مسلم: ۱۹۴۸، نسائی: ۲۲۱۹، ترمذی: ۱۵۴۸، ابن ماجہ: ۱۷۰۷،

احمد: ۱۷۷۸

(۳) مسند احمد: ۱۱۵۴۱، ابن حبان: ۲۱۹/۸

(جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو جاننا، اور ان باتوں سے اپنے کو محفوظ رکھا جن سے بچنا مناسب ہے، تو یہ روزہ اس کے گزشتہ گناہوں کا کفارہ بنا دیا جاتا ہے۔)

ان احادیث سے روزے کے فضائل معلوم ہوئے اور اس پر بڑے بڑے وعدوں کا علم ہوا، لہذا اس فضیلت سے کسی مسلمان کو محروم نہیں ہونا چاہئے۔

روزے کی حقیقت اور قسمیں

روزے کو عربی میں ”صوم“ کہا جاتا ہے، اور صوم کے معنی ”امساک“ (رک جانے) کے ہیں، اور شریعت میں صوم کی حقیقت یہ ہے کہ پورا دن کھانے، پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے سے رک جائے۔ (۱)

علمائے فرمایا ہے کہ روزے کی تین قسمیں ہیں: ایک عوام الناس کا روزہ، دوسرے خواص کا روزہ اور تیسرے اخص الخواص کا روزہ۔

(۱) روزے کی پہلی قسم

عوام کا روزہ یہ ہے کہ صرف کھانے پینے اور جماع کرنے سے اپنے آپ کو روک لیا جائے، باقی دیگر اللہ کی منع کردہ چیزوں سے باز نہ آئے، یہ سب سے کم درجہ کا روزہ ہے۔ اس سے روزہ ادا تو ہو جاتا ہے؛ مگر اس پر ان فضائل و برکات کا ترتب نہیں ہوتا، جن کا ذکر احادیث میں گزرا ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ. » (۲)

(۱) التعریفات للجرجانی: ۱۷۸، انیس الفقہاء: ۱/۱۳۷

(۲) البخاری: ۱۷۷۰، ترمذی: ۶۲۱، ابوداؤد: ۲۰۱۵

(جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے، اللہ کو کچھ حاجت

نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔)

اور بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ جو جہل اور جہل پر عمل کو نہ چھوڑے، اس

کے کھانے پینے کو چھوڑنے میں اللہ کی کچھ حاجت نہیں۔ (۱)

اس حدیث کے تحت علامہ ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ جو ان باتوں (یعنی جھوٹ وغیرہ) کا ارتکاب کرے، اس کے روزے پر ثواب نہ دیا جائے گا۔ اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ روزے کی مشروعیت سے صرف بھوک و پیاس مقصود نہیں ہے؛ بل کہ اس سے مقصود شہوتوں کو توڑنا اور نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کا مطیع بنانا ہے۔ (۲)

الغرض! کھانا پینا چھوڑنے سے اگرچہ روزہ ادا ہو جاتا ہے اور ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے؛ مگر اس پر ثواب اور وہ فضائل مرتب نہیں ہوتے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) روزے کی دوسری قسم

دوسری قسم خواص کا روزہ ہے، وہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور جماع سے رکنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضا: ہاتھ، پیر، زبان، آنکھ، کان، وغیرہ کو بھی اللہ کی منع کردہ چیزوں سے محفوظ رکھا جائے، یعنی شریعت کے خلاف کوئی بات ان اعضا سے صادر ہونے نہ دیا جائے۔

شریعت میں یہ روزہ مطلوب ہے، جیسا کہ اوپر کی حدیثوں سے معلوم ہوا۔ اور اوپر پیش کردہ اس حدیث میں اسی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) ابن ماجہ: ۱۶۷۹، احمد: ۹۴۶۳

(۲) فتح الباری: ۱۱۷/۲

« من صام رمضان وعرف حدوده وتحفظ مما كان

ينبغي له ان يحفظ فيه كفر ما قبله. »

(جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو جانا، اور ان باتوں

سے اپنے کو محفوظ رکھا جن سے بچنا مناسب ہے، تو یہ روزہ اس گزشتہ

گناہوں کا کفارہ بنا دیا جاتا ہے۔)

اس سلسلہ میں ایک عبرت ناک حدیث ملاحظہ کیجئے، وہ یہ کہ دو عورتوں نے روزہ

رکھا اور پیاس کی شدت سے مرنے کے قریب ہو گئیں، ایک شخص نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلوایا،

اور جب وہ آئیں تو آپ نے ان کو ایک پیالے میں قے کرنے کے لیے فرمایا ان

عورتوں نے جب قے کیا تو اس میں خون، پیپ اور کچا گوشت نکل آیا، اس پر نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« ان هاتين صامتا عما احل الله و افطرتا على ما حرم الله

عز وجل عليهما، جلست احداهما الى الاخرى فجعلتا

تأكلان لحوم الناس. » (۱)

(ان عورتوں نے ان چیزوں سے تو روزہ رکھا جن کو اللہ نے حلال

کیا ہے، اور ان چیزوں سے روزہ کو توڑ دیا جن کو اللہ نے حرام کیا ہے،

ان میں سے ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کے گوشت کھانے

لگیں، یعنی غیبت کرنے لگیں۔)

الغرض اپنے اعضا و جوارح کو ہر قسم کے گناہوں سے بچانے کی فکر کرتے رہنا

(۱) مسند احمد: ۲۲۵۴۵، مسند ابویعلیٰ: ۱۴۶/۳، قلت: اسنادہ ضعیف

اور روزے کی حدود کا خیال رکھنا مطلوبہ روزہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

روزے کی تیسری قسم

تیسری قسم کا روزہ اخص الخواص کا روزہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تمام برائیوں اور گندگیوں سے پاک و صاف کر لیا جائے، مثلاً حسد، بغض، کینہ، تکبر، ریاکاری وغیرہ امراض قلبی سے پاک و صاف ہو جائے۔

یہ روزہ بھی شرعاً مطلوب ہے، چنانچہ بعض حدیثوں میں یہ آیا ہے:

یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور مواساة و ہم دردی و غم خواری کا مہینہ

ہے۔ (۱)

حاصل یہ کہ پہلا روزہ ناقص ہے، دوسرا کامل اور تیسرا اکمل، ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ ہم اخص الخواص یا کم از کم خواص کے روزے کی طرح روزہ رکھیں، صرف پیاسے، بھوکے نہ رہیں، جیسے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«رب صائم ليس له من صيامه الا الجوع و رب قائم

ليس له من قيامه الا السهر.» (۲)

(بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنہیں سوائے بھوک کے کچھ حاصل

نہیں، اور بہت سے رات بھر نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جنہیں سوائے

رات گزاری کے کچھ حاصل نہیں۔)

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

(۱) أخرجه ابن خزيمة: ۳/۱۹۱، والبيهقي في شعب الإيمان: ۳/۲۰۵، عن سلمان

الفارسي في حديث طويل.

(۲) ابن ماجه: ۱۶۸۰، احمد: ۳۹۰۸.

« رب صائم حظه من صيامه الجوع والعطش ورب

قائم حظه من قیامه السهر. « (۱)

(بہت سے روزہ دار ہیں جن کا نصیب بھوک و پیاس ہے، اور بہت

سے رات بھر نماز پڑھنے والے ہیں جن کا حصہ رات گزاری ہے۔)

ہم نے اس جگہ بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے، ورنہ یہ موضوع بڑا طویل ہے؛ مگر

عقل کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

روزے کے احکام و مسائل

روزہ کن لوگوں پر فرض ہے؟

ہر اس مرد و عورت پر رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے جو مسلمان ہو، بالغ ہو اور عاقل ہو۔ (۱)

البتہ ان عذروں میں سے کوئی عذر لاحق ہو اس کو جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور بعد میں ان کی قضا کر لے۔ اور وہ اعذار یہ ہیں:

(۱) سفر میں ہونا، یا در ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت ہو اور آرام و راحت کا سفر ہو، تو روزہ رکھ لینا اچھا ہے۔

(۲) روزہ رکھنے سے کسی مرض و بیماری کے پیدا ہو جانے سے یا بڑھ جانے یا مرجانے کا خوف ہو۔

نوٹ: مگر یاد رہے کہ محض دل میں اس طرح کا خیال جمالینے سے روزہ چھوڑنا جائز نہ ہوگا؛ بل کہ کسی حاذق و ثقہ متقی مسلمان ڈاکٹر و طبیب نے اگر ایسا کہا ہے، تو اس کا اعتبار ہوگا۔

(۳) ایسی کم زوری ہے کہ یہ روزہ نہ رکھ سکتا ہو اور اسی میں وہ بھی داخل ہے کہ کسی کو جہاد درپیش ہو اور روزہ رکھنے سے کم زوری کا خوف ہو۔

(۴) دشمن کی طرف سے جان یا بدن کا خوف ہو، مثلاً کہے کہ اگر تو روزہ رکھے گا

(۱) فتح القدیر: ۳۰۲/۲، البحر الرائق: ۲/۲۷۶

تو ہم تیری جان لے لیں گے یا ہاتھ کاٹ دیں گے وغیرہ۔

(۵) عورت کو حیض یا نفاس ہو۔

(۶) عورت کو حالت حمل میں روزہ رکھنے سے اپنے یا بچے کو نقصان پہنچنے کا

اندیشہ ہونا۔

(۷) عورت اپنے یا کسی اور کے بچے کو دودھ پلانے کے دنوں میں ہو اور روزہ

رکھنے سے بچے کو نقصان ہونے کا خوف ہو۔

(۸) سخت بھوک و پیاس کا ہونا۔

(۹) بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی سکت نہ ہونا۔ (۱)

ان تمام اعذار کی وجہ سے رمضان کے روزے ان دنوں میں چھوڑ دینا جائز ہے؛

لیکن عذر کے ختم ہو جانے پر ان روزوں کی قضا کرنا لازم ہے، مثلاً مسافر سفر سے

واپسی پر، عورت حیض و نفاس سے پاک ہونے کے بعد اور مریض صحت یاب ہونے

کے بعد، اسی طرح مجاہد جہاد سے واپسی پر ان روزوں کی قضا کرے گا۔

روزہ کب صحیح ہوگا؟

روزہ اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ تین شرطیں پائی جائیں:

(۱) روزہ رکھنے والا مسلمان ہو، لہذا کافر کا روزہ صحیح نہیں۔

(۲) روزہ دار حیض و نفاس سے خالی ہو، لہذا حیض و نفاس والی عورت کا روزہ صحیح

نہیں ہوگا؛ بل کہ ان عورتوں کو روزہ رکھنا جائز نہیں ہے؛ بل کہ حیض و نفاس کے بعد

ان کے روزوں کی قضا کرنا چاہیے۔

ہاں! مرد کو حالت جنابت میں روزہ رکھنا درست ہے، اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا،

البتہ بے عذر نہ نہانا گناہ کی بات ہے۔

(۳) روزے کی نیت کرنا، یعنی دل سے روزہ رکھنے کا ارادہ کرنا، لہذا اگر کوئی بلا نیت روزہ رکھے، تو اس کا روزہ نہ ہوگا۔ (۱)

مگر یہاں یاد رہے کہ روزہ کی نیت کا زبان سے ادا کرنا ضروری نہیں؛ بل کہ دل سے ارادہ کرنا ضروری ہے کہ میں فلاں دن کا روزہ رکھتا ہوں۔

نیت کے ضروری مسائل

(۱) نیت رمضان کے روزوں کی ہر روز الگ الگ کرنا چاہئے، ایک ہی دن پورے رمضان کے روزوں کی نیت کرنا کافی نہیں۔ (۲)

(۲) ہر قسم کے روزے میں افضل یہی ہے کہ طلوع فجر ہی پر نیت کر لے؛ لیکن اگر کسی نے اس وقت نہیں کی تو رمضان کے ادائی روزوں میں اس قدر گنجائش ہے کہ آدھے دن یعنی زوال سے پہلے تک بھی نیت کر لینا درست ہے، اس کے بعد نیت کرنا درست نہیں۔ (۳)

(۳) رمضان کے ادائی روزوں کی نیت میں فرض کی تخصیص نہ کرنا بھی درست ہے، یعنی صرف یہ نیت کر لیا کہ میں روزہ رکھتا ہوں تو رمضان کا روزہ ادا ہو جائے گا۔ (۴)

روزے کے فرائض

روزے میں تین چیزیں فرض ہیں:

(۱) صبح صادق کے طلوع ہونے سے آفتاب کے غروب ہونے تک کچھ نہ کھانا۔

(۱) فتح القدیر: ۳۰۲/۲، البحر الرائق: ۲/۲۷۷، نور الایضاح: ۱۰۰

(۲) البدائع: ۸۵/۲، عالمگیری: ۱۹۵/۱

(۳) فتح القدیر: ۳۰۳/۲، البدائع: ۸۵/۲، مراقی الفلاح: ۲۳۲

(۴) البدائع: ۸۴/۲، البحر الرائق: ۲/۲۸۰

(۲) طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کچھ نہ پینا اور جو چیز کھانے اور پینے کے مشابہ ہو وہ بھی اسی میں داخل ہے، مثلاً کان یا ناک میں تیل ڈالنا کہ اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، تفصیل آگے آئے گی۔

(۳) صبح صادق سے غروب آفتاب تک جماع اور ان چیزوں سے رک جانا جن سے عادت منی نکل جاتی ہے۔ (۱)

روزے کی سنتیں اور مستحبات

روزے کو اس کی تمام سنتوں اور آداب کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، تاکہ وہ عند اللہ مقبول و منظور ہو، جیسے ہم اپنے کسی بڑے کو کوئی چیز پیش کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کوشش کرتے ہیں کہ بہتر سے بہتر چیز پیش کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دربار عالی شان میں جس سے عظیم کوئی نہیں، عبادت بھی ایسی پیش کرنا چاہئے جو اس کے دربار کے شایان شان ہو، اس لیے حضرات فقہانے روزے کی سنتیں اور اس کے آداب کا ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

(۱) ایک ادب یہ ہے کہ ہر گناہ سے بچے، کیوں کہ روزہ کی اصلیت اسی سے حاصل ہوتی ہے، قرآن پاک میں اس کی طرف اشارہ ہے۔
چنانچہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرة: ۱۸۳)

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے؛ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔)

اس سے معلوم ہوا کہ روزے کا اصل مقصد تقویٰ ہے اور تقویٰ گناہوں سے

بچنے کا نام ہے۔

نیز اوپر حدیث گزر چکی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو جھوٹ اور جھوٹ پر عمل کو نہ چھوڑے، اللہ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں۔

نوٹ: یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ سے بچنا تو ہر حال میں فرض ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہر حال میں حرام ہے اور ہم نے جو اس کو سنتوں میں شمار کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹے گا نہیں، جیسا کہ کسی روزے کے فرض کو چھوڑنے سے ٹوٹ جاتا ہے، اس لحاظ سے اس کو سنت کہا گیا ہے ورنہ گناہ سے بچنا۔ قطع نظر روزے کی حالت کے۔ فرض ہے۔

(۲) روزے کی ایک سنت یہ ہے کہ دوسرے دنوں کے اعتبار سے روزے کے دنوں میں زیادہ عبادت کی جائے، خصوصاً رمضان کے اخیر عشرہ میں اس کا زیادہ اہتمام کیا جائے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان داخل ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی ازار کو سخت باندھ لیتے، پھر جب تک رمضان گزر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔ اور دوسری حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ جب رمضان آتا تو رسول اللہ ﷺ کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہو جاتی اور آپ دعائیں گڑ گڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے۔ یہ دونوں حدیثیں اوپر باحوالہ گزر چکی ہیں۔

(۳) ایک سنت یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں شب بیداری کریں اور اس میں عبادت کا اہتمام کریں؛ جیسا کہ ابھی حدیث گزری۔

(۴) ایک سنت یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا جائے، حضرت عائشہ، ابن عمرو و ابو سعید خدری، انس رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ سے

مروی ہے کہ آپ ﷺ کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری تھا۔ یہ حدیث بھی اوپر گزر گئی۔

(۵) روزے کی سنت یہ بھی ہے کہ سحری کی جائے، حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السُّحُورِ بَرَكَهً» (۱)

(سحری کھایا کرو؛ کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔)

(۶) ایک سنت یہ کہ سحری آخری وقت میں کی جائے اور افطار اول وقت پر کیا جائے، یعنی سحری ایسے وقت کی جائے کہ اس کے بعد فجر ہو جائے، اگر کوئی شخص مثلاً رات ہی میں سحری کر کے سو جائے گا، تو بھی سحری ہو جائے گی؛ مگر ایسا کرنا سنت کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح افطار سورج غروب ہوتے ہی کر لیا جائے، وقت ہو جانے کے بعد بھی خواجواہ تاخیر کرنا سنت کے خلاف ہے۔

سحری کے متعلق حدیث میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی، پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ سحری کھانے اور اذان کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پچاس آیتیں پڑھنے کے بعد رفاصلہ تھا۔ (۲)

اس حدیث سے اللہ کے رسول ﷺ کا معمول سحری کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ آپ آخری وقت میں سحری کرتے تھے۔

(۱) البخاری: ۱۷۸۹، مسلم: ۱۸۳۵، نسائی: ۲۱۱۷، ابن ماجہ: ۱۶۸۴، احمد: ۱۱۵۱۲

(۲) البخاری: ۱۷۸۷، مسلم: ۱۸۳۷، ترمذی: ۶۳۸، نسائی: ۲۱۲۶، ابن ماجہ: ۱۶۸۴،

اور افطار کے متعلق ایک حدیث میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ. »

(لوگ خیر پر باقی رہیں گے جب تک کہ وہ افطار میں جلدی کریں گے۔) (۱)

اور ایک حدیث میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَزَالُ أُمَّتِي بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْإِفْطَارَ وَ أَخْرَوْا الشُّحُورَ. »

(میری امت خیر پر رہے گی جب تک کہ وہ افطار میں جلدی اور

سحری میں تاخیر کرے گی۔) (۲)

روزے کو توڑنے والی چیزیں

یاد رکھنا چاہئے کہ روزہ کو توڑنے والی چیزیں دو قسم کی ہیں: (۱) ایک وہ جن سے صرف قضا لازم آتی ہے، (۲) دوسری وہ جن سے قضا اور کفارہ دونوں لازم آتے ہیں۔

اس کا قاعدہ یہ ہے کہ قضا و کفارہ دونوں اس وقت لازم آتے ہیں جب کہ رمضان کے روزے میں جس کی نیت سحری کے وقت سے ہی کر لیا ہو، جان بوجھ کر بلا عذر صورتہ و معنی کوئی چیز کھالے یا پی لے یا جماع کر لے۔ (۳)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ صورتہ کھانے پینے سے مراد یہ ہے کہ منہ کے ذریعہ معدہ میں چیز پہنچائی جائے اور معنی کھانے پینے سے مراد یہ ہے کہ ایسی چیز معدہ میں

(۱) البخاری: ۱۸۲۱، مسلم: ۱۸۳۸، ترمذی: ۶۳۵، ابن ماجہ: ۱۶۸۷، احمد: ۲۱۷۳۹، مالک: ۵۶۱

(۲) مسند احمد: ۲۰۳۵۰

(۳) بدائع: ۲/۹۷-۹۸، مراقی الفلاح: ۲۲۱، شامی: ۲/۴۱۰

پہنچائی جائے، جو غذا کی قسم کی ہو یا دوا کی قسم کی ہو، اور صورتہٴ جماع سے مراد یہ ہے سامنے کے یا پیچھے کے راستے سے صحبت کی جائے، اور معنیٰ جماع سے مراد ایسا کام کیا جائے جس سے جماع کی لذت حاصل ہو جائے، پس جب دونوں طرح سے کھانا پینا اور جماع ہو تو اس کی وجہ سے قضا و کفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں۔

اور صرف قضا اس وقت لازم آتی ہے جب کہ کھانا پینا اور جماع صرف صورتہٴ پائے جائیں یا صرف معنیٰ پائے جائیں، لہذا اگر منہ سے کوئی چیز کھایا یا پیا؛ مگر وہ چیز غذا یا دوا میں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً کنکر کھا گیا، تو اس سے صورتہٴ کھانا پایا گیا؛ مگر معنیٰ کھانا نہیں پایا گیا اس لیے روزہ ٹوٹ تو جائے گا اور قضا بھی لازم ہوگی؛ لیکن کفارہ لازم نہ ہوگا، یا معدہ میں ایسی چیز پہنچایا جو نفع بخش ہے اور غذا یا دوا میں استعمال کی جاتی ہے؛ مگر یہ منہ سے نہیں؛ بل کہ ناک سے یا کسی اور جگہ سے پہنچائی تو اس سے معنیٰ کھانا تو پایا گیا؛ مگر صورتہٴ کھانا نہیں پایا گیا، لہذا اس سے بھی صرف قضا لازم ہوگی کفارہ نہیں۔ اس کے بعد ہم یہاں ان دونوں قسموں کی چند جزئیات لکھتے ہیں:

پہلی قسم

وہ باتیں جن سے قضا و کفارہ دونوں لازم آتے ہیں:

(۱) رمضان شریف کے مہینے میں روزہ رکھ کر ایسی چیزیں قصداً کھانا یا پینا لینا جو غذا یا دوا یا لذت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ (۱)

(۲) قصداً ہم بستری کرنا، چاہے سامنے کی راہ سے ہو یا پیچھے سے ہو، اور خواہ منی نکلے یا نہ نکلے، اور یہ قضا و کفارہ صحبت کرنے والے پر بھی اور جس سے صحبت کی

جائے اس پر بھی واجب ہے۔ (۱)

(۳) قصد کھلوائی یا سرمہ لگایا اور کوئی ایسا کام کیا جس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ مگر اس نے یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا قصداً کھالیا، یا پی لیا تو ان صورتوں میں بھی قضا کفارہ دونوں واجب ہیں۔ (۲)

(۴) بارش کا پانی روزے دار کے منہ میں پڑ گیا اور وہ اس کو نگل گیا تو اس سے بھی قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ (۳)

(۵) اگر گنے کا رس چوسا تو اس پر قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں، کیوں کہ گنا اسی طرح کھایا جاتا ہے۔ (۴)

(۵) اگر روزے کی حالت میں بیڑی یا سگریٹ یا حقہ پیئے، تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس سے قضا لازم ہوگی اور بعض علما کے نزدیک قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے، علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (۵)

دوسری قسم

وہ چیزیں جن سے صرف قضا لازم آتی ہے:

(۱) کسی نے زبردستی روزہ دار کے منہ میں کوئی چیز ڈال دی اور وہ حلق سے اتر گئی۔

(۲) روزہ یاد تھا اور کلی کرتے وقت بلا قصد حلق میں پانی اتر گیا۔

(۱) در مختار و شامی: ۲/۴۰۹-۴۱۰

(۲) در مختار و شامی: ۲/۴۰۹-۴۱۰، مراقی الفلاح: ۲۴۱

(۳) مراقی الفلاح: ۲۴۱

(۴) بدائع الصنائع: ۲/۹۹

(۵) مراقی الفلاح: ۲۴۱، عمدة الرعاہ علی هامش شرح الوقایة: ۱/۲۴۶

(۳) قے ہوئی اور قصداً حلق میں لوٹالی۔

(۴) قصداً منہ بھر کے قے کر ڈالی۔

(۵) کنکری یا پتھر کا ٹکڑا یا گٹھلی یا مٹی کا یا کاغذ کا ٹکڑا قصداً نگل لیا۔

(۶) دانتوں میں اٹکی ہوئی چیز کو زبان سے نکال کر نگل لیا، جب کہ وہ چنے کے دانے کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور اگر منہ سے باہر نکال کر پھر نگل لیا تو چاہے چنے سے کم ہو یا زیادہ ہر صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۷) کان میں تیل ڈالا۔

(۸) ناس لیا۔

(۹) دانتوں میں سے نکلے ہوئے خون کو نگل لیا، جب کہ خون تھوک پر غالب ہو۔

(۱۰) بھولے سے کچھ کھاپی لیا اور یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا پھر قصداً کھایا پیا۔

(۱۱) یہ سمجھ کر کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی سحری کھالی، پھر معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو چکی تھی۔

(۱۲) رمضان شریف کے سوا اور دنوں میں کوئی روزہ قصداً توڑ ڈالا۔

(۱۳) ابر یا غبار کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا روزہ افطار کر لیا، حالاں کہ دن ابھی باقی تھا۔

ان سب صورتوں میں صرف ان روزوں کی قضا رکھنی پڑے گی، جن میں ان باتوں میں سے کوئی پیش آئی ہے اور کفارہ ان میں واجب نہیں۔ (۱)

کن چیزوں سے روزہ مکروہ ہوتا ہے؟

روزہ میں بعض چیزیں مکروہ ہیں، ان کے ارتکاب سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں؛ مگر

(۱) مراقی الفلاح: ۲۴۴-۲۴۷، بدائع الصنائع: ۲/۹۹-۱۰۱، عالمگیری: ۲۰۲/۱-۲۰۵

اس میں نقص و کمی آجاتی ہے، لہذا ان باتوں سے بھی بچنے کی کوشش کرنا چاہیے، وہ چیزیں یہ ہیں:

(۱) گوند یا کوئی اور چیز منہ میں ڈالے رکھنا یا چبانا اور اسی میں کوئلہ یا منجن یا پیسٹ سے دانت صاف کرنا بھی داخل ہے۔

(۲) کوئی چیز مثلاً سالن وغیرہ چکھنا، البتہ جس عورت کا خاوند سخت اور بد مزاج ہو اسے زبان کی نوک سے سالن کا نمک چکھ لینا درست ہے۔

(۳) استنجے میں زیادہ پاؤں پھیلا کر بیٹھنا یا دھونے میں مبالغہ کرنا۔

(۴) کلی یا ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنا۔

(۵) منہ میں تھوک جمع کر کے نگلنا۔

(۶) بے قراری و گھبراہٹ ظاہر کرنا۔ (یعنی روزے کی وجہ سے)

(۷) بیوی سے بغل گیر ہونا یا بوسہ لینا بشرطے کہ انزال کا خوف ہو۔

(۸) ایسا کام کرنا جس سے کم زوری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، جس کی بنا پر روزہ

توڑ ڈالنا پڑے، مثلاً کھیل کود، یا گھومنا پھرنا وغیرہ، اسی طرح روٹی وغیرہ پکانے والے کا

اپنے اس کام میں اس طرح لگنا جس سے روزہ توڑنے تک نوبت پہنچے، یہ جائز نہیں۔ (۱)

اسی طرح یہ باتیں بھی روزے میں مکروہ ہیں:

(۱) غیبت کرنا (۲) جھوٹ بولنا (۳) گالی گلوچ کرنا (۴) لڑائی جھگڑا کرنا

(۵) گانا، بجانا، گانا سننا، خواہ ریڈیو کے ذریعہ ہو یا T.V. کے ذریعہ یا کسی آدمی سے۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے، کیوں کہ اوپر ذکر کردہ احادیث سے معلوم ہوا کہ گناہ۔

کے کام سے روزہ میں فرق آجاتا ہے۔

(۱) عالمگیری: ۱/۱۹۹-۲۰۰، مراقی الفلاح: ۲۲۸-۲۲۹ در مختار مع الشامی: ۲/۴۱۶

۴۱۹-، بحر الرائق: ۲/۳۰۳-۳۰۴

وہ چیزیں جو روزے میں مکروہ نہیں ہیں

بعض باتیں ایسی ہیں جو روزے میں جائز ہیں، مکروہ بھی نہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) سرمہ لگانا۔

(۲) مسواک کرنا، خواہ تر ہو یا سوکھی ہو؛ بل کہ مسواک کرنا روزے میں بھی

سنت ہے۔

(۳) بدن پر یا سر میں تیل ڈالنا یا ملنا۔

(۴) ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا یا کپڑا تر کر کے سر پر باندھنا۔

(۵) خوش بولگانا یا خوش بوسو گھنا۔

(۶) بھول کر کچھ کھاپی لینا۔

(۷) خود بخود قے ہو جانا۔

(۸) جمع کیے بغیر ویسے ہی اپنا تھوک نکلنا۔

(۹) بلا قصد مکھی یا دھویں کا حلق سے اتر جانا۔

(۱۰) احتلام ہو جانا۔ (۱)

روزے کے چند جدید مسائل

نئے حالات و نئے دور میں فقہیات کا باب بھی وسیع ہوتا جاتا ہے، اور اس کے دامن میں نئے نئے مسائل کو جگہ لینی پڑتی ہے، چنانچہ روزہ کے سلسلہ میں بھی متعدد نئے مسائل پیدا ہو گئے، جن کا جواب فقہاء کی ذمہ داری ہے، یہاں ہم اہم اہم چند مسائل کا ذکر کرتے ہیں، اس سلسلہ میں احقر کی کتاب ”رمضان اور جدید مسائل“ کی طرف مراجعت کی جائے۔

(۱) المراقی: ۲۳۹، البحر: ۲۰۱/۲-۲۰۲، عالمگیری: ۱/۹۹۱-۲۰۱، درمختار و شامی: ۲/۳۹۶

(۱) روزہ میں انجکشن کا کیا حکم ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر عام قسم کی بیماریوں کا انجکشن لیا جائے، جو رگوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اگر ایسا انجکشن لیا جائے جو بلا واسطہ گوشت میں دیا جاتا ہو یا اور کسی منفذ اصلی سے پہنچایا جاتا ہو، تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، جیسے ذیابیطس کے لئے انسولین اور کتا کاٹنے پر دیا جانے والا انجکشن گوشت میں دیا جاتا ہے۔

(۲) روزہ کی حالت میں بدن میں خون یا گلوکوز چڑھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن بلا کسی سخت ضرورت کے ایسا نہیں کرنا چاہئے، ورنہ روزہ مکروہ ہوگا۔

(۳) اگر عورت روزہ کی حالت میں اپنی شرم گاہ میں لوپ داخل کرے، تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر لوپ پہلے داخل کر چکی ہو اور پھر روزہ رکھے تو اس سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آئے گی۔

(۴) روزہ کی حالت میں بدن سے خون نکالنا جائز ہے، بشرطے کہ اس کی وجہ سے ایسی کم زوری پیدا نہ ہو، جو روزہ توڑنے پر مجبور کر دے۔

(۵) روزہ میں اگر داڑھ یا دانت نکلوائے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن چوں کہ اس سے کم زوری پیدا ہو سکتی ہے اس لیے بلا ضرورت نکلوانے سے احتیاط کرنا چاہئے اور اگر اس موقع پر خون نکل کر حلق میں چلا جائے، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۶) روزہ کی حالت میں مصنوعی دانتوں کا استعمال جائز ہے، اس میں کوئی کراہت بھی نہیں۔

(۷) بیڑی، سگریٹ، حقہ کا استعمال روزہ کو فاسد کر دیتا ہے، کیوں کہ اس کا دھواں معدے میں بہ راہ راست پہنچتا ہے۔

(۸) اگر بتی، عود، موٹروں اور چولھے وغیرہ کا دھواں اگر منہ میں چلا جائے تو

اس سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے، بشرطے کہ اس سے بچنا ممکن ہو اور اگر اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۹) روزہ میں نسوار، ویکس، امرتجن وغیرہ سونگھی جانے والی دوائیاں اگر سونگھے اور اس کی تیزی ناک کے ذریعہ اندر محسوس ہو تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور ویکس انہیلر کا بھی احتیاطاً یہی حکم ہے، کیوں کہ اس سے اندر جانے والی دوا اگرچہ ڈاکٹروں کے بقول پھیپڑوں میں پہنچتی ہے؛ مگر کچھ اجزاء کا معدہ میں چلے جانے کا بھی امکان ہے۔

(۱۰) منجن اور ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، مکروہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں ایک قسم کا مزہ ہوتا ہے اور مزہ رکھنے والی چیز کا منہ میں رکھنا روزہ میں مکروہ ہے اور روزہ نہ ٹوٹنا اس وقت ہے جب کہ یہ حلق میں نہ جائے اور اگر حلق میں چلا گیا تو اور چیزوں کی طرح یہ بھی روزہ کو توڑ دیتا ہے۔ (۱)

(۱۱) روزہ دار اگر آنکھوں میں دوائی ڈالے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس دوا کا اثر کبھی حلق میں بھی محسوس ہو۔

(۱۲) گیس کے اندر پہنچ جانے سے روزہ فاسد ہو جائے گا، جیسے دھواں پہنچ جانے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، ہاں! اگر اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔

قضا و کفارے کے احکام

(۱) قضا جس قدر جلدی ہو سکے رکھ لینا چاہئے تاخیر نہ کرے، قرآن میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

(۲) قضا روزے کا وقت رمضان کے بعد عید الفطر کا دن اور ایام تشریق (۱۰/ ذی الحجہ سے ۱۳/ ذی الحجہ) کے علاوہ پورا سال ہے۔ (۲)

(۱) بدائع: ۲/۱۰۳

(۲) بدائع: ۲/۱۰۳

(۲) اگر کئی روزے قضا ہوں تو لگاتار رکھنا ضروری نہیں؛ بل کہ وقتاً فوقتاً ایک ایک، دو دو بھی رکھ سکتے ہیں۔ (۱)

(۳) اگر ایک رمضان کے کچھ یا پورے روزے قضا ہو گئے اور ان کی قضا رکھنے سے پہلے دوسرا رمضان آ گیا، تو اب پہلے اس رمضان کے ادا روزے رکھے، پھر رمضان کے بعد پہلے رمضان کی قضا کرے۔ (۲)

(۴) روزے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے؛ لیکن ان ملکوں میں غلام نہیں ہیں، اس لیے یہاں صرف دو صورتوں سے کفارہ دیا جاسکتا ہے، ایک یہ کہ دو مہینے یعنی ساٹھ دن لگاتار روزے رکھے، دوسرے یہ کہ اگر دو مہینے کے روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں (غریبوں) کو دونوں وقت (صبح و شام) پیٹ بھر کر کھانا کھلائے، یا ساٹھ مسکینوں کو فی کس پونے دو سیر گیہوں یا ان کی قیمت یا اس قیمت کے برابر چاول، باجرہ، جوار دیدے۔ (۳)

(۵) یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی کو کفارے میں ساٹھ روزے رکھنے کی طاقت ہو، تو اس کو مسکینوں کو کھانا کھلا دینا کافی نہ ہوگا، یہ صرف اس کے لیے ہے جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ (۴)

(۶) اگر کسی نے ایک ہی رمضان کے کئی روزے توڑ دیے تو صرف ایک کفارہ لازم ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے پہلا روزہ اور اکیسواں روزہ توڑ دیا تو یہ دو روزے قضا رکھے اور ساٹھ روزے کفارے کے رکھ لے، یہ اس کے لیے کافی ہے۔ (۵)

(۱) عالمگیری: ۲۱۵/۱

(۲) عالمگیری: ۲۰۸/۱، در مختار و شامی: ۴۲۳

(۳) مراقی الفلاح: ۲۴۳، تاتر خانیہ: ۱۳۹/۳، عالمگیری: ۲۱۵/۱

(۴) مراقی الفلاح: ۲۴۳، عالمگیری: ۲۱۵/۱

(۵) بدائع: ۱۰۱/۲، عالمگیری: ۲۱۵/۱

(۷) اگر ایک فقیر و مسکین کو ساٹھ دنوں تک ہر روز ایک دن کا غلہ (پونے دو سیر گیہوں) دے دیا جائے یا اسے ساٹھ دن تک دونوں وقت کھانا کھلا دیا جائے، تو جائز ہے، یعنی ساٹھ مسکینوں کے بہ جائے ایک ہی کو اوپر کی صورت کے مطابق دیا جاسکتا ہے؛ لیکن اگر ایک مسکین کو ایک دن میں ایک دن سے زیادہ کا غلہ یا اس کی قیمت دی جائے، تو ایک دن کا کفارہ صحیح ہوگا اور زیادہ کا کفارے میں شمار نہ ہوگا۔ (۱)

(۸) ایک فقیر کو ایک دن کے غلہ کی مقدار سے کم دینا بھی درست نہیں۔ (۲)

فدیہ کے احکام

(۱) اگر کوئی اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ روزے رکھنے کی طاقت نہیں اور آئندہ بھی طاقت آنے کی امید نہیں ہے، تو اس کو روزوں کا فدیہ دینا چاہیے۔ (۳)

(۲) اگر کوئی ایسا بیمار ہے کہ صحت پانے کی امید نہیں اور اس کا مرض بڑھتے بڑھتے موت تک دراز ہو گیا، تو اس پر قضا نہیں ہے اور نہ فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے، ہاں! اگر وہ وصیت کر جائے کہ میرے روزوں کا فدیہ دیے دو، تو اس کی یہ وصیت درست ہے اور اس کے مال کے تہائی میں سے اس کو پورا کیا جائے گا۔ (۴)

(۳) اور اگر بیمار آدمی اپنی بیماری سے صحت یاب ہو گیا اور اسے اپنے چھوٹے ہوئے روزوں کو قضا کرنے کی مدت بھی ملی، تو اس پر قضا لازم ہے، اگر اس نے قضا نہیں کی اور موت کا وقت آ گیا، تو اس پر فدیہ دینے کی وصیت کرنا لازم ہے، اگر

(۱) تانار خانہ: ۳/۱۱۴۱ البحر الرائق: ۴/۱۰۹

(۲) البحر الرائق: ۴/۱۱۰

(۳) عالمگیری: ۱/۲۰۷، البحر الرائق: ۲/۳۰۸

(۴) عالمگیری: ۱/۲۰۷، در مختار مع شامی: ۲/۷۴

اس نے وصیت نہیں کی اور اس کے وارثین اس کی طرف سے فدیہ دے دیں تو جائز ہے؛ مگر ان پر واجب نہیں۔ (۱)

(۲) ایک شخص کے ذمے روزے قضا تھے، اس کا انتقال ہو گیا، تو اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص اس کے روزے نہیں رکھ سکتا؛ بل کہ چاہے تو اس کا وارث فدیہ دے سکتا ہے۔ (۲)

(۵) اور فدیہ یہ ہے کہ ہر روزے کے بدلے میں پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو، یا ان میں سے کسی کی قیمت یا ان کی قیمت کے برابر کوئی غنہ مثلاً چاول وغیرہ دے دیا جائے۔ (۳)

(۶) فدیہ میں ہر روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کو صبح و شام کھانا پیٹ بھر کر کھل دینا بھی جائز ہے اور فدیہ کے غلے کو اگر بانٹ کر کئی مسکینوں کو دے دے، تو بھی درست ہے۔ (۴)

(۷) فدیہ اگر شروع رمضان ہی میں ایک مشت دے دیا، تو بھی جائز ہے اور اگر اخیر میں یک مشت دے دیا تو بھی جائز ہے۔ (۵)

یہ چند اہم مسائل ہیں جو روزے کے احکام سے متعلق یہاں پیش کئے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں، ضرورت پر حضرات علما سے پوچھ لینا چاہئے۔

(۱) مراقی الفلاح: ۱/۷۰، عالمگیری: ۱/۲۰۷

(۲) مراقی الفلاح: ۱/۷۰، بدایۃ المبتدی: ۴۱، عالمگیری: ۱/۲۰۷

(۳) بدایۃ المبتدی: ۴۱، البحر الرائق: ۲/۳۰۸، عالمگیری: ۱/۲۰۷

(۴) در مختار مع شامی: ۲/۴۲۸، البحر الرائق: ۲/۳۰۸

(۵) عالمگیری: ۱/۲۰۷، البحر الرائق: ۲/۳۰۸

نماز تراویح کا بیان

رمضان کے خاص اعمال میں سے ایک نہایت اہم عمل نماز تراویح ہے، احادیث میں اس کی اہمیت و فضیلت بہت واضح انداز میں بیان ہوئی ہے، ہماری کوتاہیوں کی فہرست میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر ہم لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں، بہت سے لوگ رمضان میں افطاری کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگتے ہیں اور بعض لوگ عشا کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے ہیں، اور بعض دوستوں میں اول فول بکواس کرتے بیٹھتے ہیں اور تراویح نہیں پڑھتے، حالاں کہ جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔ تراویح نہایت اہمیت کی چیز ہے اور اس میں کوتاہی کرنا بری بات ہے، ہم یہاں پہلے اس کی فضیلت و ثواب، پھر اس کے متعلق احکام و مسائل بیان کریں گے۔

نماز تراویح کی فضیلت

نماز تراویح کی فضیلت میں چند احادیث پیش کرتا ہوں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

« من قام رمضان ايماناً واحتساباً غفر له ماتقدم من

ذنبه. » (۱)

(۱) البخاری: ۳۶، نسائی: ۲۱۷۰، احمد: ۸۹۲۰

(جو شخص رمضان میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے قیام کرے، (یعنی نماز پڑھے) اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«من صام رمضان وقامہ ایمانا واحتسابا غفرلہ ماتقدم من ذنبہ.» (۱)

(جو شخص رمضان میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے روزے رکھے گا اور قیام کرے گا، (یعنی نماز پڑھے گا) اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔)

اس حدیث میں گناہوں سے کون سے گناہ مراد ہیں؟ اس میں دونوں قول ہیں: بعض نے کہا کہ اس سے مراد صغیرہ و کبیرہ دونوں گناہ ہیں، علامہ ابن المیزان رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مشہور ہے یہ ہے کہ یہ معافی صغیرہ گناہوں کے ساتھ خاص ہے، امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ اگر کسی کے چھوٹے گناہ نہ ہوں تو اس کے بڑے گناہ معاف ہوں گے۔ (۲)

ان روایات میں صرف پچھلے گناہوں کا بخشا جانے کا ذکر ہے؛ مگر بعض روایتوں میں ”وماتاخر“ بھی آیا ہے، یعنی اگلے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے جیسا کہ ابن حجر

(۱) ترمذی: ۶۱۹، احمد: ۱۰۱۳۳

(۲) فتح الباری: ۲۵۱/۴

رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں ان روایات کو نقل کیا ہے۔ (۱)
 اور اگلے گناہوں کے بخشتے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں سے
 بچالیں گے، لہذا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تراویح پڑھنے کے بعد گناہ کرنے سے
 اس کا وبال نہ آئے گا؟ اور یہ گناہوں سے بچنا بھی اضطراری نہیں؛ بل کہ اس کا حاصل
 صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا فرمادیں گے کہ انسان کو گناہوں سے بچنا
 آسان ہو جائے گا۔ (فافہم)

(۳) حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 فرمایا:

«ان الله تبارك وتعالى فرض صيام رمضان عليكم
 وسنت لكم قيامه، فمن صامه وقامه ايماناً واحتساباً خرج
 من ذنوبه كيوم ولدته امه.» (۲)

(اللہ تبارک و تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے اور میں
 نے اس کے قیام یعنی تراویح کی نماز کو سنت قرار دیا ہے، پس جو شخص
 رمضان کے روزے اور اس کی نماز ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت
 سے ادا کرتا ہے وہ گناہوں سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے اس دن
 تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔)

(۴) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ

(۱) فتح الباری: ۲/۲۵۱

(۲) نسائی: ۲۱۸۰، ابن ماجہ: ۱۳۱۸، احمد: ۱۵۶۹، ابن خزیمہ: ۳/۳۳۵، مسند
 طیالسی: ۱/۳۰، مسند ابویعلیٰ: ۲/۱۷۰

صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جملے بھی نقل فرمائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا:

« فانی أشهدکم یاملا ئکتی! انی قد جعلت ثوابہم من

صیامہم شہر رمضان و قیامہ رضائی و مغفرتی. » (۱)

(اے میرے ملائکہ! تم گواہ رہنا کہ میں نے میرے بندوں کے

رمضان کے روزوں اور اس کے قیام یعنی تراویح کی نماز کا ثواب میری

رضا اور بخشش کو ٹھہرایا۔)

ان سب احادیث میں قیام رمضان یعنی تراویح کی فضیلت و بزرگی کا

بیان ہے۔

تراویح کے احکام و مسائل

(۱) رمضان المبارک میں نماز تراویح مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سنت مؤکدہ ہے۔ (۱)

نوٹ: یاد رکھنا چاہیے کہ تراویح روزے سے الگ عبادت ہے، لہذا جو لوگ کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں، ان کو بھی تراویح پڑھنا چاہیے۔

(۲) نماز تراویح کا وقت عشا کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر صبح صادق تک رہتا ہے، لہذا عشا سے پہلے تراویح نہ ہوگی۔ (۲)

(۳) وتر کی نماز تراویح کے بعد پڑھنا افضل ہے، اگر پہلے پڑھ لے تو بھی ہو جائے گی۔ (۳)

(۴) نماز تراویح تہائی رات کے بعد افضل ہے اور نصف شب کے بعد خلاف اولیٰ ہے۔ (۴)

(۵) تراویح کی ہر دو رکعت پر الگ الگ نیت کرنا چاہئے، ایک دم بیس رکعت کی نیت کر لینا بھی بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے؛ لیکن احتیاط اسی میں ہے الگ الگ نیت کی جائے۔ (۵)

(۱) مراقی الفلاح: ۱۵۹، تاتارخانیہ: ۴۱۰/۱، البحر الرائق: ۲/۶۶

(۲) تاتارخانیہ: ۴۱۳/۱

(۳) تاتارخانیہ: ۴۱۳/۱

(۴) تاتارخانیہ: ۴۱۴/۱

(۵) شامی: ۴۴/۲

(۶) تراویح کی نماز کا جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنا سنت کفایہ ہے، لہذا مسجد کی جماعت کے علاوہ کسی اور جگہ بھی تراویح پڑھنا درست ہے، جب کہ محلہ کی مسجد میں بھی جماعت کا انتظام ہو۔ (۱)

(۷) تراویح کی بیس رکعات اس طرح پڑھنا چاہئے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر دے اور ہر چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر آرام کرے۔ (۲)

(۸) ہر چار رکعت کے بعد جب بیٹھے تو اس میں خواہ خاموش رہے یا نفل پڑھے یا ذکر کرے یا تلاوت کرے یا دعائے مانگے، سب اختیار ہے۔ (۳)

(۹) بعض علاقوں میں تراویح کی دعا کے نام سے جو دعائیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ناموں پر مشتمل رائج ہیں اور ہر دو یا چار رکعتوں پر تمام لوگ مل کر یا کوئی ایک مقرر آدمی زور زور سے پڑھتا ہے، شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور بدعت میں داخل ہے۔ اسی طرح جو دعا ”سبحان الملک القدوس الخ“ کے الفاظ سے پڑھی جاتی ہے، اس کا بھی احادیث سے ثبوت نہیں، لہذا اس کو ضروری سمجھنا اور امام یا مقتدیوں پر اس کے پڑھنے کو لازم کرنا بدعت ہے، ہاں اور دعاؤں کی طرح بلا التزام پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (دیکھو احقر کا رسالہ ”منکرات رمضان“)

(۱۰) اگر عشا کی نماز جماعت سے نہیں پڑھا تو تراویح کی نماز بھی جماعت سے نہ پڑھے؛ لیکن اگر کوئی شخص عشا کی جماعت میں شریک نہ تھا، دوسرے لوگوں نے عشا جماعت سے پڑھی تو یہ ان لوگوں کے ساتھ تراویح جماعت سے پڑھ سکتا ہے، جو جماعت سے عشا پڑھ چکے ہوں۔ (۴)

(۱) البحر الرائق: ۲/۶۸، شامی: ۲/۲۵

(۲) تاتارخانیہ: ۱/۴۱۲

(۳) تاتارخانیہ: ۱/۴۱۲، البحر الرائق: ۲/۶۹

(۴) البحر الرائق: ۲/۷۰، شامی: ۲/۲۸

(۱۱) اور اگر کوئی شخص تراویح کی نماز جماعت سے نہیں پڑھا، تو وہ وتر کی نماز میں امام کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔ (۱)

(۱۲) اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچا کہ عشا کی نماز ہو چکی ہو، تو اسے چاہئے کہ پہلے عشا کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو اور جو رکعتیں تراویح کی چھوٹ جائیں ان کو وتر کے بعد پڑھے، یا ترویجہ کے موقع پر پڑھ لے۔ (۲)

(۱۳) مہینہ میں ایک مرتبہ قرآن مجید کا ترتیب وار تراویح میں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ (۳)

(۱۴) تراویح میں ایک مرتبہ کسی بھی سورت کے شروع میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ بلند آواز سے پڑھ لینا چاہیے ورنہ سننے والوں کا قرآن مکمل نہ ہوگا۔

(۱۵) بعض لوگ تراویح میں ”قل هو اللہ احد“ کو تین بار پڑھتے ہیں، یہ مکروہ ہے۔

(۱۶) تراویح میں قرآن سنانے کی اجرت لینا ناجائز ہے، اگر کوئی بلا اجرت حافظ نہ ملے تو ”الم تر کیف“ سے پڑھ لیں۔ (تفصیل کے لیے ”منکرات رمضان“ اور ”رمضان اور جدید مسائل“ دیکھیں۔)

تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت

نماز تراویح میں کتنی رکعات ہیں؟ اس میں جمہور امت کا جواب یہ ہے کہ بیس رکعات ہیں اور غیر مقلدین نے بارہ سو سال کے بعد اس مسئلہ سے اختلاف کیا

(۱) درمختار مع شامی: ۲/۴۸

(۲) درمختار مع شامی: ۲/۴۴

(۳) مراقی الفلاح: ۱۶۰، شامی: ۲/۴۶، البحر الرائق: ۲/۷۴

اور یہ دعویٰ کیا کہ تراویح میں آٹھ رکعتیں ہیں۔

چوں کہ یہ مسئلہ آج کل نزاع کا باعث بنتا جا رہا ہے، اور عوام الناس پریشان ہوتے ہیں، اس لیے ہم یہاں صرف جمہور امت کی تائید میں چند دلائل کا ذکر کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ ان لوگوں کو جو تذبذب کا شکار ہیں تشفی ہو سکے، باقی کسی سے بحث مباحثہ مقصود نہیں۔

لہذا عرض ہے کہ تراویح میں بیس رکعت ہونے کا ثبوت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی ہوتا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اس کے مطابق ہونا بعض روایات میں آیا ہے۔

(۱) یحییٰ بن سعید انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے:

« ان عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ أمر رجلاً أن يصلي بهم
عشرين ركعة. » (۱)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات

پڑھائے۔)

یہ روایت منقطع ہے، کیوں کہ یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا؛ مگر اولاً تو احناف کے نزدیک تابعین کے قرن کا انقطاع جرح نہیں، پھر اس روایت کی تائید دوسری روایتوں سے ہوتی ہے جیسے کہ آگے مذکور ہے۔

(۲) سائب بن یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس

رکعات پڑھتے تھے۔ (۲)

(۳) سائب بن یزید ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے:

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲

(۲) آثار السنن: ۵۵/۲

« كانوا يقومون على عهد عمر ابن الخطاب رضي الله عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة . » (۱)

(لوگ حضرت عمر رضي الله عنه کے زمانے میں رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔)

علامہ نیموی رحمۃ اللہ ”آثار السنن“ میں کہتے ہیں کہ اس کو بیہقی نے ”معرفہ“ میں روایت کیا ہے اور علامہ سبکی رحمۃ اللہ نے ”شرح منہاج“ میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور اسی روایت کے ایک طریق میں یوں آیا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضي الله عنه کے عہد خلافت میں رمضان میں بیس رکعات پڑھتے تھے، اس کو علامہ نووی رحمۃ اللہ نے ”خلاصۃ“ میں اور ابن العراقی رحمۃ اللہ نے ”شرح تقریب“ میں اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے ”مصانح“ میں صحیح قرار دیا ہے۔ (۲)

(۳) یزید بن رومان کہتے ہیں کہ:

« كان الناس يقومون في زمان عمر بن الخطاب رضي الله عنه في رمضان ثلاث وعشرين ركعة . » (۳)

(لوگ حضرت عمر رضي الله عنه کے زمانے میں رمضان میں تیس رکعت پڑھتے تھے۔)

(۴) عبدالعزیز بن رفیع رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

« كان ابي ابن كعب رضي الله عنه يصلي بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة ويوتر بثلاث . » (۴)

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲

(۲) آثار السنن: ۵۵/۲

(۳) مؤطا امام مالک: ۱۱۵، شعب الایمان: ۱۷۷/۳، سنن بیہقی: ۴۹۶/۲

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، سنن بیہقی: ۴۹۷/۲

(حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو رمضان میں مدینہ میں بیس رکعت پڑھاتے تھے اور تین رکعت وتر۔)
(۵) ابوالحسناء رحمۃ اللہ سے مروی ہے:

«ان علیا أمر رجلاً أن یصلی بهم عشرين رکعة .» (۱)
(حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔)

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے حضرت شتیر بن شکل رحمۃ اللہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن قیس رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔ (۲)

(۷) مشہور تابعی امام حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ کہتے ہیں:
«أدرکت الناس وهم یصلون ثلاثة وعشرين رکعة بالوتر .» (۳)

(میں نے لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ وتر کے ساتھ تیس رکعت پڑھتے تھے۔)

(۸) حضرت نافع بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:
«کان ابن ابی ملیکة رضی اللہ عنہ یصلی بنافی رمضان عشرين رکعة .» (۴)

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، سنن بیہقی: ۲/۲۹۷

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، سنن بیہقی: ۲/۲۹۶

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲

(حضرت ابن ابی ملیکہ صحابی رضی اللہ عنہ ہمیں رمضان میں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔)

(۹) حضرت ابوالخضیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

« کان یؤمناسوید بن غفلة رضی اللہ عنہ فی رمضان فیصلي

خمیس ترویحات عشرين رکعة. » (۱)

(حضرت سوید بن غفلہ صحابی رضی اللہ عنہ رمضان میں ہماری امامت

فرماتے تھے، پس پانچ ترویحات سے بیس رکعت پڑھاتے تھے۔)

ان سب روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ حاصل کیا نکلتا ہے؟ ان میں سے بعض روایات منقطع و ضعیف سہی؛ مگر حکم مجموعہ روایات پر ہوتا ہے، پھر دوسری روایت تو بالکل صحیح ہے، اساطین علم نے اس کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ نقل کیا جا چکا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا عمل اختیار نہیں کر سکتے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف ہو، لہذا اس کو اس لحاظ سے حکماً مرفوع بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ رکعت کی تعداد قیاسی و اجتہادی چیز نہیں اور جو امر خلاف قیاس ہو، اور صحابہ سے اگر منقول ہو، تو حکم میں مرفوع کے ہوتا ہے، چناں چہ اس کی تائید ایک مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے۔

(۱۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلي فی رمضان

عشرين رکعة والوتر. » (۲)

(۱) سنن بیہقی: ۲/۳۹۶

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۱۶۳، معجم کبیر: ۱۱/۳۹۳، معجم اوسط: ۲۴۳، سنن

بیہقی: ۲/۳۹۶ مسند عبد ابن حمید: ۱/۲۱۸

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر

پڑھتے تھے۔)

ابن ابی شیبہ کی روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، سوائے ایک کے جن کا نام ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ہے اور اگرچہ ان کے متعلق اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ ضعیف ہیں؛ مگر ان کے بارے میں محدثین میں سے بعض اچھی رائے بھی رکھتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے ”تہذیب التہذیب“ میں نقل کیا ہے کہ ابن عدی رحمۃ اللہ نے کہا کہ ان کی احادیث صالحہ ہیں اور یہ ابراہیم بن ابی حنیہ سے اچھے ہیں۔ (۱)

ابن عدی رحمۃ اللہ نے ان کو ابراہیم بن ابی حنیہ سے بہتر قرار دیا ہے اور ابراہیم بن ابی حنیہ کے بارے میں امام عثمان الدارمی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ نے کہا کہ: ”شیخ ثقہ کبیر“ (یہ قابل اعتماد شیخ کبیر ہیں۔) (۲)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن ابی حنیہ کے بارے میں اختلاف ہے اور وہ حسن الحدیث ہیں، عثمان الدارمی رحمۃ اللہ نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ یہ شیخ ثقہ کبیر ہیں، پس جو ان ابراہیم سے بھی بہتر اور اچھا ہو گا وہ مختلف فیہ اور حسن الحدیث ہونے سے کم نہ ہو گا۔ (۳)

بہر حال یہ روایت بھی حسن ہوگی اور پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی اس کا مؤید ہے، لہذا معلوم ہوا کہ بیس رکعت تراویح جیسے صحابہ کا عمل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معمول رہا ہے۔

(۱) تہذیب التہذیب: ۱/۱۳۵

(۲) لسان المیزان: ۱/۵۲

(۳) اعلاء السنن: ۷/۷۱

آٹھ رکعت کی حدیث کا جواب

اب ذرا ان لوگوں کی دلیل کا جائزہ بھی لیجیے جو یہ کہتے ہیں کہ تراویح صرف آٹھ رکعت ہے۔ ان لوگوں نے اس پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

« كيف كان صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم في

رمضان؟ »

(رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیا کیفیت

ہوتی تھی؟)

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

« ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى

عشرة ركعة ، يصلي اربعا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن ،

ثم يصلي اربعا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن ، ثم يصلي

ثلاثا . » (۱)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان وغیر رمضان میں آٹھ رکعات

سے زائد نہ پڑھتے تھے، چار رکعتیں ایسی پڑھتے کہ ان کی خوب صورتی

اور ان کا طول نہ پوچھو، پھر چار رکعتیں ایسی پڑھتے کہ ان کی خوب

صورتی اور ان کا طول نہ پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے تھے۔)

(۱) البخاري: ۱۸۷۴، مسلم، ۱۲۱۹، ترمذی: ۴۰۷، نسائی: ۱۶۷۹، ابوداؤد: ۱۱۳۳،

اس حدیث سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تراویح بھی آٹھ ہی رکعت پڑھتے تھے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ آپ رمضان وغیرہ رمضان میں آٹھ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے؛ مگر یہ بات صحیح نہیں؛ کیوں کہ خود بخاری و مسلم کی روایات سے اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ آپ تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔ (۱)

لہذا بات یہ ہے کہ یہ حدیث درحقیقت تراویح کے بارے میں نہیں ہے؛ بل کہ تہجد کے متعلق ہے، جو آپ اکثر گیارہ رکعات پڑھتے تھے اور کبھی تیرہ بھی پڑھتے تھے، دوسرے یہ دیکھئے کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس نماز کا ذکر کیا ہے، جو رمضان وغیرہ رمضان ہر وقت پڑھی جاتی تھی اور یہ سب کو معلوم ہے کہ تراویح کی نماز رمضان میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ رمضان کے علاوہ دوسرے اوقات میں، لہذا اس حدیث کو رمضان کی خاص نماز تراویح سے کوئی تعلق نہیں، اس کو تراویح کی آٹھ رکعات کے ثبوت میں پیش کرنا صحیح نہیں۔

اور مؤطا امام مالک میں جو آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعت پڑھانے کا حکم دیا، یہ روایت مضطرب ہے؛ کیوں کہ اس کے متعدد طرق ہیں اور ان میں متعدد باتیں بیان ہوئی ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح الباری“ میں نقل کیا ہے۔ (۱)

اور یہ کہنا کہ ”یہ مختلف احوال پر محمول ہے“ صحیح نہیں؛ کیوں کہ مخرج ایک ہے، اس میں مختلف احوال کی بات کیسے پیدا ہوگئی؟

(۱) البخاری: ۱۰۹۴، مسلم: ۱۲۲۰

(۲) فتح الباری: ۳۵۳/۴، تفصیل کے لیے دیکھئے: ”رکعات تراویح“ از مولانا حبیب الرحمن اعظمی

بہ ہر حال آٹھ رکعت کے بہ جائے بیس رکعت پڑھنا چاہئے؛ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے موافقت ہو جائے اور نیز امت کا اس پر اجماع بھی ہے، اس کے خلاف لازم نہ آئے۔

یہاں ہم نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے کہ یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے اور ہم نے اس مسئلے پر دوسرے موقعہ پر تفصیل سے لکھا ہے، چنانچہ ہم نے ہمارے ایک رسالے ”دلیل نماز“ میں مفصل کلام کیا ہے جو ہم نے مولانا عبدالممتین صاحب جوناگڑھی کی کتاب ”حدیث نماز“ کے رد میں لکھا ہے۔

اعتکاف - فضائل و احکام

تمہید

اعتکاف اسلامی عبادات میں سے ایک اہم عبادت ہے، اس کا درجہ و مقام بڑا اونچا ہے اور اس کے فضائل بے شمار ہیں؛ لیکن اکثر لوگ اس کی حقیقت سے ناواقف، اس کے فضائل سے بے خبر اور اس کے مسائل و احکام سے نا بلد ہیں، اس لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس اہم ترین عبادت اسلام کی حقیقت و اہمیت کو اجاگر اور اس کے فضائل و مسائل کو واضح کیا جائے۔

اعتکاف کی تعریف

اعتکاف کے معنی لغت میں کسی چیز کو لازم پکڑ لینے اور محبوس ہو جانے کے ہیں، مثلاً کسی نے اپنے رہنے کے لیے کسی خاص مکان کا انتخاب کر کے اس کو لازم پکڑ لیا یا کسی نے تجارت کو اپنا لازمی پیشہ بنا لیا تو یہ لغت میں اعتکاف کہلاتا ہے اور شرعی اصطلاح میں مخصوص عبادت کو مخصوص وقت میں مخصوص شرائط پر مخصوص جگہ میں لازم کر لینے کو اعتکاف کہتے ہیں۔ (۱)

اور علامہ جر جانی رحمۃ اللہ نے اعتکاف کی شرعی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

”وفي الشرع لبث صائم في مسجد جماعة بنية و تفرغ

القلب عن شغل الدنيا و تسليم النفس إلى المولى“

(روزہ دار کائنیت کے ساتھ ایسی مسجد میں قیام کرنا جہاں جماعت

(۱) تفسیر قرطبی: ۳۳۲/۲

ہوتی ہو اور دنیا کے مشاغل سے اپنے دل کو خالی کر لینا اور اپنا نفس مولیٰ کے حوالے کر دینا۔ (۱)

اعتکاف کی ضرورت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں اعتکاف کی ضرورت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بعض اوقات انسان اپنی باطنی سمجھ کی بہ دولت یہ معلوم کر لیتا ہے کہ امور معاش میں اس کے لیے تو غل کرنا (یعنی حد سے زیادہ منہمک ہونا) سخت مضر ہے، اسی طرح اگر اس کے حواس خمسہ (ظاہرہ) بیرونی واقعات کا اثر قبول کرتے رہیں، تو اس سے اس کا آئینہ قلب سخت مکرر ہوتا ہے، اس سے خلاصی پانے کی تدبیر اس کو یہ سوچتی ہے کہ تمام اشغال کو چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں بیٹھ جائے اور اپنے تمام اوقات عزیز کو اللہ عزوجل کی یاد اور اس کی عبادت میں صرف کر لے؛ لیکن اس پر مداومت کرنا اس کو ناممکن نظر آتا ہے، فوراً اس کے ذہن میں اصول آجاتا ہے کہ ”مَا لَا يُدْرِكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ“ کہ جس چیز کو پورے طور پر حاصل نہ کیا جاسکے اس کو پورے طور پر چھوڑنا بھی نہ چاہئے، اس لیے وہ اپنے اشغال سے وقت فرصت نکال کر تدبیر مذکور کو جزوی طور پر عمل میں لاتا ہے، اسی کا نام شرع میں اعتکاف ہے۔“ (۲)

(۱) التعریفات للجرجانی: ۴۷

(۲) حجۃ اللہ البالغہ

حاصل یہ ہے کہ دنیوی علاق اور مصروفیات کی وجہ سے انسانی قلب پر جو کدورت و میل آجاتا ہے اور اس کو دھونے اور صاف کرنے کے کی ضرورت ہر صاحب عقل و بصیرت محسوس کرتا ہے، لہذا اس کے لیے ایک آسان تدبیر یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ان دنیوی علاق سے خود کو آزاد کر لیا جائے اور اللہ کی یاد میں خود کو لگایا جائے، اور بہ زبان حال یوں گویا ہوتا ہے کہ اے اللہ! جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہوگا میں واپس نہیں لوٹوں گا، اسی کا نام اعتکاف ہے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:
 ”إن مثل المعتكف مثل المحرم ألقى نفسه بين يدي الرحمن فقال: واللّٰه لا أبرح حتى ترحمني“

(اعتکاف کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے احرام پہننے والا حاجی کہ وہ رحمن کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس وقت تک نہیں لوٹوں گا جب تک کہ تو مجھ پر رحم نہ کر دے۔) (۱)

اعتکاف کی حکمتیں

اعتکاف کی حکمتیں علما نے بہت سی بیان فرمائی ہیں، من جملہ ان کے یہ بھی ہیں:
 (۱) چوں کہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے اس لیے مسجد میں رہنے کی وجہ سے ہر وقت نماز کا جماعت سے ادا کرنا آسان ہوگا۔
 (۲) بہت سی لغو و گناہ کی باتوں سے وہ بچا رہے گا، کیوں کہ مسجد میں وہ کام نہیں ہو سکتے۔

(۳) ذہنی انتشار و قلبی اضطراب سے محفوظ رہے گا، کیوں کہ یکسوئی کی جگہ میں

یکسوئی حاصل ہوا کرتی ہے۔

(۴) سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو ہر وقت ثواب ملتا رہے گا اور اللہ کا قرب و رضا حاصل ہوگی۔

ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ اعتکاف پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا عبادت ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں بیٹھ جائیں اور اس پر ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں :
”لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ“ کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حدیث میں ”لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ“ آیا ہے، اسی طرح حدیث میں اعتکاف کے فضائل بھی وارد ہوئے ہیں، تو تم ایک حدیث کو لیتے ہو اور دوسری کو چھوڑتے ہو؟ اسلام کا اقرار کرنے والا ایسا نہیں کر سکتا، پھر بھی اگر کرتا ہے، تو وہ ہم پر نہیں اسلام پر اعتراض کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ اعتکاف کو رہبانیت قرار دینا بالکل غلط ہے؛ اس لیے کہ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیوی علاق سے بے تعلق ہو کر رہ جائے اور اعتکاف میں اس طرح نہیں ہوتا، بل کہ اس میں ہر طرح کا صحیح تعلق قائم رکھا جاتا ہے۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے در پر رہنے کو اپنے لیے فضیلت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

اعتکاف کی فضیلت

اعتکاف کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، یہاں چند ایک نقل کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا:

”هُوَ يَعْكِفُ الذُّنُوبَ وَيُجْرِي لَهُ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ
الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا“

(اعتکاف کرنے والا گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لیے

نیکیاں اتنی ہی لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لیے) (۱)

فائدہ: اس میں اعتکاف کرنے والے کے لیے اتنی نیکیوں کی بشارت سنائی

گئی ہے جتنی کہ کرنے والے کے لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتکاف کرنے والا
اعتکاف کی وجہ سے بعض نیک اعمال نہیں کر سکتا، مثلاً مریض کی عیادت، جنازہ میں
شرکت وغیرہ، ایسے اعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اعتکاف کرنے والا اگرچہ
عمل نہیں کرتا؛ مگر اس کو اتنا ہی ثواب دیا جاتا ہے جتنا کہ کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد بھی نقل کرتے ہیں:

”مَنْ اَعْتَكَفَ يَوْمًا ابْتِغَاءً وَجْهِ اللَّهِ جَعَلَ اللَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ

النَّارِ ثَلَاثَ خَنَادِقٍ كُلُّ خَنْدَقٍ اُبْعَدُ مِمَّا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ“

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایک دن کا بھی

اعتکاف اللہ کی رضا کے واسطے کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کے اور جہنم

کے درمیان تین خندقیں آڑ فرما دیتے ہیں جن کی مسافت آسمان اور

زمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔) (۲)

(۱) ابن ماجہ: ۱۷۷۱، شعب الایمان: ۳/۲۲۲

(۲) المعجم الاوسط: ۷/۲۲۰، شعب الایمان: ۳/۲۲۲،

(۳) حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”مَنْ اغْتَكَفَ عَشْرًا فِي رَمَضَانَ كَانَ كَحَجَّتَيْنِ وَ عُمْرَتَيْنِ“
(جو شخص عشرہ رمضان کا اعتکاف کرے، اس کو دو حج اور دو عمروں کا اجر ہے۔) (۱)

اعتکاف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اعتکاف کی اسی فضیلت و اہمیت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خاص اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ حدیثوں میں آپ کا طرز عمل اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَغْتَكِفُ الْعَشْرَ
الْأَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ“

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔) (۲)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَغْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَّلَ مِنْ
رَمَضَانَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ“ (۳)

(۱) شعب الایمان: ۳/۲۲۵

(۲) البخاری: ۱۸۸۵، مسلم: ۲۰۰۲، ابو داؤد: ۲۱۰۹، ابن ماجہ: ۱۷۶۳، احمد: ۵۷۹۶

(۳) البخاری: ۱۸۸۶، مسلم: ۲۰۰۶، ترمذی: ۷۲۰، ابو داؤد: ۲۱۰۶، احمد: ۲۳۲۶۲

(اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دنوں کا اعتکاف کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دے دی۔
(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ فِي كُلِّ رَمَضَانَ عَشْرَةَ أَيَّامٍ ، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الَّذِي قُبِضَ فِيهِ اغْتَكَفَ عَشْرَيْنَ يَوْمًا“ (۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن اعتکاف کرتے تھے، لیکن جو آپ کی وفات کا سال تھا تو آپ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔)

علماء نے لکھا ہے کہ آپ نے بیس دن کا اعتکاف اس لیے فرمایا تھا کہ آپ کو منکشف ہو گیا تھا کہ یہ آپ کا آخری رمضان ہے، آپ نے چاہا کہ اعمال خیر میں کثرت کی جائے؛ تاکہ امت کو عمل خیر میں جدوجہد کرنا ظاہر ہو جائے اور بعض نے کہا کہ یہ بیس دن کا اعتکاف اس لیے تھا کہ آپ نے اس سے پہلے سال رمضان میں سفر ہو جانے کی بنا پر اعتکاف نہیں کیا تھا، اس لیے اس سال بیس دن کا اعتکاف دس دن کا اسی سال کا ادائی اور دس دن گزشتہ سال کی قضا کے طور پر کیا تھا۔ بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی نظر میں یہ اہم چیز تھی۔

اعتکاف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَّلَ

(۱) البخاری: ۱۹۰۳، ابو داؤد: ۲۱۱۰، ابن ماجہ: ۱۷۵۹، احمد: ۸۰۸۱، دارمی: ۱۷۱۳

مِنْ رَمَضَانَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجَهُ مِنْ
بعده، (۱)

(اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دنوں کا اعتکاف
کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دیدی، پھر آپ
کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری عشرہ
کا اعتکاف کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے اعتکاف کرنے کی اجازت
چاہی، آپ نے ان کو اجازت دی، تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، جب حضرت
حفصہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، پھر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا
نے یہ سنا تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
یہ چادریں دیکھی تو کہا یہ کیا ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ کیا ہے۔ (آپ نے اس کو منع
کر دیا کہ دکھاوا ہوگا)۔ (۲)

اس سے حضرات صحابہ کا اعتکاف کے لیے جدوجہد، شوق معلوم ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اوپر کی تقریر سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ازواج
مطہرات اعتکاف کیا کرتی تھیں اور اس کا بڑا ان کو شوق و جذبہ بھی تھا، یہی حال وہ
دوسرے اور صحابہ کا بھی ہے، مگر حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں
نے فرمایا کہ میں نے اعتکاف کے بارے میں غور کیا اور اس میں بھی کہ صحابہ نے اس

(۱) البخاری: ۱۸۸۶، مسلم: ۲۰۰۶، ابو داؤد: ۲۱۰۶، احمد: ۲۳۳۶۲

(۲) البخاری: ۱۹۰۰، مسلم: ۲۰۰۷، نسائی: ۷۰۲، ابو داؤد: ۲۱۰۸، ابن ماجہ: ۱۷۶۱، احمد: ۲۳۳۶۰۴

کو کیوں ترک کر دیا تھا جب کہ وہ لوگ شدت کے ساتھ اتباع سنت کرتے تھے، پس میرے جی میں یہ بات آئی کہ یہ صوم وصال کی طرح ہے اور صحابہ نے اس کو سخت ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا تھا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ نے اس سنت کو اپنایا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ نے غالباً کسی خاص طریقہ پر اعتکاف کرنے کے بارے میں یہ بات فرمائی ہوگی، ورنہ حضرات صحابہ سے روایات میں اعتکاف کرنا منقول ہے۔ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے ”فتح الباری“ میں کہا کہ ہم سے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اعتکاف کرنا بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

اعتکاف کی قسمیں

جاننا چاہیے کہ علمائے احناف کے نزدیک اعتکاف کی تین قسمیں ہیں:

(۱) واجب (۲) سنت موکدہ (۳) مستحب۔

(۱) اعتکاف صرف اسی صورت میں واجب ہوتا ہے جب کہ اس کی نذر کی جائے، جیسے کسی نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے، تو میں اتنے دن اعتکاف کروں گا یا ویسے ہی کہا کہ میں اتنے دن اعتکاف کروں گا، تو یہ اعتکاف واجب ہوتا ہے۔

(۲) سنت موکدہ وہ رمضان میں اخیر عشرہ کا اعتکاف ہے، اس عشرہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالالتزام اعتکاف کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

(۳) مستحب وہ اعتکاف ہے جو نذر اور رمضان کے اخیر عشرہ کے سوا کسی بھی

وقت کیا جائے۔ (۲)

(۱) فتح الباری: ۲/۲۷۲

(۲) البحر الرائق: ۲/۳۲۲، در مختار مع شامی: ۲/۴۴۱

اعتکاف کے احکام و مسائل

اعتکاف کے احکام و مسائل بہت سے ہیں، ہم یہاں ان میں سے چند ضروری اور اہم مسائل بیان کرتے ہیں، تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

اعتکاف کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

(۱) ایک یہ کہ مرد مسجد میں ٹھہرے، خواہ اس مسجد میں پانچوں وقت نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور بعض فقہانے مسجد جماعت ہونا شرط قرار دیا ہے اور بعض نے یہ کہا کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں جائز ہے جہاں جمعہ ہوتا ہو؛ مگر اول قول پر ہی فتویٰ ہے۔ ہاں! عورت اپنے گھر میں ایک جگہ مقرر کر لے اور اسی میں اعتکاف کرے۔ (۱)

(۲) دوسری یہ کہ اعتکاف کی نیت سے ٹھہرے، اگر بغیر ارادہ و نیت مسجد میں ٹھہر جائے، تو یہ اعتکاف نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی شرط نہیں پائی گئی۔ (۲)

(۳) تیسری یہ کہ اعتکاف کرنے والا مرد جنابت سے پاک ہو اور عورت ہو، تو حیض و نفاس اور جنابت سے پاک و خالی ہو۔

مگر اس مسئلے کی ذرا تفصیل ہے اس کو یہاں عرض کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ جس اعتکاف میں روزہ شرط ہے اس میں حیض و نفاس سے خالی ہونا شرط صحت ہے، یعنی اگر حیض و نفاس جاری ہو، تو یہ اعتکاف صحیح نہیں ہوتا اور جس اعتکاف میں روزہ شرط نہیں اس میں حیض و نفاس سے خالی ہونا شرط صحت تو نہیں ہے، شرط حلت ہے، یعنی اگر حیض و نفاس جاری ہو، تو اعتکاف صحیح ہو جاتا ہے، البتہ ایسا کرنا حلال و جائز نہیں،

(۱) البحر الرائق: ۲/۳۲۲ در مختار مع شامی: ۲/۴۴۰

(۲) در مختار مع شامی: ۲/۴۴۱، البحر الرائق: ۲/۳۲۲

اور حیض و نفاس سے اور جنابت سے پاک ہونا کسی اعتکاف کے لیے بھی شرط صحت نہیں، یعنی حیض و نفاس و جنابت کا غسل کر کے پاک ہونا شرط صحت نہیں ہے؛ بل کہ شرط حلت ہے۔ (۱)

سب سے افضل وہ اعتکاف ہے جو مسجد حرام میں کیا جائے، پھر وہ جو مسجد نبوی میں کیا جائے، پھر وہ جو مسجد اقصیٰ میں ہو، اس کے بعد جامع مسجد میں، پھر محلہ کی مسجد میں اور عورتیں اپنے گھر میں کسی جگہ مسجد بنالیں اور اسی میں اعتکاف کریں۔ (۲)

نذر کے اعتکاف میں روزہ شرط ہے اور اعتکاف مسنون میں روزہ شرط ہے یا نہیں؟ اس میں ابن نجیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس میں روزہ شرط نہیں؛ مگر شامی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور روزہ کو اس میں بھی شرط قرار دیا ہے، لہذا اگر کوئی بیماری کی وجہ سے روزہ نہ سکے، تو وہ ابن نجیم کی رائے کے مطابق اعتکاف بغیر روزہ کے کر سکتا ہے اور شامی کی رائے کے مطابق یہ اعتکاف مسنون نہیں کر سکتا، ہاں! اس کو نقل اعتکاف کا ثواب مل جائے گا اور اعتکاف مستحب میں روزہ شرط نہیں ہے۔ (۳)

اعتکاف واجب کم سے کم ایک دن کا ہوتا ہے اور زیادہ جس قدر نیت کرے اور اعتکاف مسنون ایک عشرہ کا۔ جو رمضان کی اکیسویں شب سے شروع ہو کر عید کا چاند نظر آنے تک ہے۔ ہوتا ہے اور اعتکاف مستحب کے لیے کوئی مقدار نہیں، وہ ایک منٹ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ (۴)

(۱) در مختار مع شامی: ۴۴۱/۲، البحر الرائق: ۳۲۲/۲

(۲) البحر الرائق: ۳۲۲/۲، شامی: ۴۴۱/۲

(۳) البحر الرائق: ۳۲۳/۲، شامی: ۴۴۲/۲

(۴) در مختار مع شامی: ۴۴۳/۲، البحر الرائق: ۳۲۲/۲

اعتکاف میں ممنوع اعمال

اعتکاف میں دو قسم کی باتیں حرام ہیں، یعنی اگر اعتکاف واجب ہے یا سنت تو ان کے ارتکاب سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا اور اس کی پھر قضا کرنا ہوگا اور اگر اعتکاف مستحب تھا تو ختم ہو جائے گا۔

(۱) معتکف (اعتکاف کی جگہ) سے بے ضرورت باہر نکلنا خواہ عمدہ ہو یا بھول کر ہو۔

(۲) جماع وغیرہ کرنا خواہ قصد کیا جائے یا بھول کر۔

ان دونوں کے متعلق بعض تفصیلات ہیں، ان کو ہم نیچے درج کرتے ہیں:

(۱) اعتکاف کی جگہ سے باہر نکلنے سے اعتکاف اس وقت فاسد ہوگا جب کہ یہ نکلنا بلا ضرورت ہو، اور اگر ضرورت ہو تو نہیں ٹوٹے گا اور ضرورت عام ہے خواہ طبعی ہو یا شرعی، جیسے پیشاب، پاخانہ، غسل جنابت اور کھانا لانے والا نہ ہو، تو کھانے کے لیے اور شرعی ضرورت جیسے جمعہ یا عیدین کی نماز کے لیے جانا۔ (۱)

(۲) اگر ضرورت سے باہر جانا ہو، تو ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد فوراً واپس آجائے۔ (۲)

(۳) مریض کی عیادت یا نماز جنازہ کے لیے بھی باہر نکلنا درست نہیں، البتہ کسی ضرورت سے نکلا تھا، راستہ میں مریض کی عیادت کر لیا یا نماز جنازہ میں شریک ہو جائے تو مضاائقہ نہیں۔ (۳)

(۱) در مختار مع شامی: ۲/۴۲۵، البحر الرائق: ۲/۳۲۵، الولو الجیہ: ۱/۲۴۱

(۲) در مختار مع شامی: ۲/۴۲۷، البحر الرائق: ۲/۳۲۵

(۳) البحر الرائق: ۲/۳۲۵، الولو الجیہ: ۱/۲۴۱

(۴) اگر کوئی شخص زبردستی معتکف سے باہر نکال دیا جائے تب بھی اس کا اعتکاف نہ رہے گا۔

(۵) جماع کرنے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا، خواہ بھول کر کیا ہو یا قصداً، اسی طرح مسجد میں کیا ہو یا مسجد کے باہر۔ (۱)

(۶) جو کام غالباً جماع کا باعث ہوتے ہیں جیسے بوسہ لینا، وغیرہ تو یہ بھی اعتکاف میں ناجائز ہو جاتے ہیں؛ مگر ان سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا، البتہ ان چیزوں سے منی نکل جائے تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ (۲)

مکروہات اعتکاف

(۱) اعتکاف میں بے ضرورت کسی دنیوی کام میں مشغول ہونا مکروہ تحریمی ہے، مثلاً بے ضرورت خرید و فروخت کرنا وغیرہ، ہاں! اگر کوئی کام نہایت ضروری ہو اور گھر میں کوئی دوسرا نہ ہو، تو ایسی ضرورت میں دنیوی کام بھی کر سکتا ہے۔ (۳)

(۲) حالت اعتکاف میں خاموش بیٹھنا کوئی عبادت نہیں، خاموشی کو عبادت سمجھ کر خاموش بیٹھنا مکروہ ہے؛ بل کہ کوئی عبادت یا مباح کام یا کلام کرنا درست ہے۔ (۴)

(۳) خرید و فروخت کا سامان مسجد میں لانا بھی مکروہ ہے، اگرچہ ضرورت کے لیے اعتکاف کرنے والے کو خریدنے بیچنے کی اجازت ہے۔ (۵)

(۱) در مختار مع شامی: ۲/۴۵۰، البحر الرائق: ۲/۳۲۸

(۲) در مختار مع شامی: ۲/۴۵۰، البحر الرائق: ۲/۳۲۵

(۳) در مختار مع شامی: ۲/۴۴۹، البحر الرائق: ۲/۳۲۵

(۴) در مختار مع شامی: ۲/۴۴۹، البحر الرائق: ۲/۳۲۵

(۵) در مختار مع شامی: ۲/۴۴۹، البحر الرائق: ۲/۳۲۷

تنبیہ

یاد رہے کہ مسجد صرف اس حصہ کو کہتے ہیں جو نماز پڑھنے کے لیے بنایا گیا ہو، خواہ وہاں چھت ہو یا نہ ہو، خواہ وہاں نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اور اس حصے کے علاوہ جو جگہ مسجد کے اطراف و اکناف میں ہوتی ہے، وہ مسجد میں داخل نہیں اور اس جگہ جا کر بلا ضرورت بیٹھنے اٹھنے سے بھی؛ بل کہ محض اس جگہ جانے سے بھی اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

تلاوتِ قرآن

رمضان سے خصوصیت سے تعلق رکھنے والے اعمال میں سے ایک قرآن پاک کی تلاوت بھی ہے، وجہ یہ ہے کہ رمضان مبارک کا مہینہ دراصل قرآن کے نزول کا مہینہ بھی ہے۔

جیسا کہ قرآن نے خود ہی کہا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البَقَرَةُ: ۱۸۵)

(کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔)

اس لیے گویا یہ مہینہ قرآن کی ولادت کا مہینہ ہے؛ اس لیے اس ماہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تلاوت کرنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اوقات سے زیادہ رمضان میں سخی ہو جاتے تھے، جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے اور جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملتے تھے، یہاں تک کہ رمضان گزر جاتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔ غرض جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے، تو آپ تیز ہو اسے بھی زیادہ نیکی میں سخی ہو جاتے تھے۔ (۱)

اور ابن ماجہ نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک

(۱) بخاری: ۱۷۶۹، مسلم: ۲۲۶۸، نسائی: ۲۰۶۸، احمد: ۳۲۵۰، ابن خزیمہ: ۱۹۳/۳، ابن حبان: ۲۲۵/۸

مرتبہ جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام کو قرآن سناتے تھے؛ لیکن اس سال جس میں آپ نے وفات پائی، آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ (۱)

بہ ہر حال رمضان میں چاہیے کہ ہم کثرت کے ساتھ تلاوت کلام اللہ کیا کریں۔ حضرات اولیاء اللہ کے یہاں بھی یہ معمول ہے کہ وہ رمضان میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ کا معمول تھا کہ رمضان میں روزانہ ایک قرآن اور کچھ پارے پڑھ لیا کرتے تھے اور پورے رمضان میں چالیس قرآن ختم کیا کرتے تھے۔

مگر یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تلاوت اس کے آداب کے ساتھ کرنا ضروری ہے اور اس کے آداب بہت ہیں، مختصراً چند اہم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) وضو کے ساتھ باادب و احترام تلاوت کرے۔

(۲) خشوع و اخلاص کے ساتھ تلاوت کرے۔

(۳) قرآن کو صحیح پڑھنے کا اہتمام کرے، (اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی عالم

وقاری سے سیکھے)

(۴) قرآن میں غور و فکر کرتے ہوئے پڑھے، غفلت کے ساتھ نہ پڑھے۔

(۵) یہ سوچتے ہوئے پڑھے کہ اللہ تعالیٰ میرا یہ پڑھنا سنتے ہیں، اس سے اللہ کی

طرف دھیان رہے گا اور غفلت دور ہوگی۔

(۶) عذاب کی آیتوں پر رو کر پناہ مانگے اور ثواب و بشارت کی آیتوں پر خوش ہو کر

اللہ سے مانگے۔

(۷) سجدے کی آیت آئے تو سجدہ کرے۔

(۸) تلاوت کے شروع میں اعوذ باللہ وبسم اللہ پڑھے۔

(۹) اگر ریا کا اندیشہ نہ ہو، تو زور سے پڑھے ورنہ آہستہ۔

(۱۰) قرآن کو اچھی آواز سے اچھے لہجے میں پڑھے، بھونڈے انداز سے نہ پڑھے۔

عبادات میں کثرت

رمضان کی ایک سنت یہ ہے کہ اس میں ہر نیکی اور بھلائی کے کام میں اضافہ کرنا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، اوپر بہ حوالہ ابن خزمہ و بیہقی یہ حدیث ہم نے ذکر کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ شَدَّ

مِنْزَرَهُ ثُمَّ لَمْ يَأْتِ فِرَاشَهُ حَتَّى يَنْسَلِخَ. »

(جب رمضان داخل ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی

ازار کو سخت باندھتے، پھر جب تک رمضان گزر نہ جاتا آپ بستر پر نہ

آتے تھے۔)

اسی طرح یہ حدیث بھی ہم نے بہ حوالہ شعب الایمان او پر ذکر کی ہے کہ حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

« إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَ كَثُرَتْ صَلَوَتُهُ وَ

ابْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ وَأَشْفَقَ مِنْهُ. »

(جب رمضان آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل

جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہو جاتی اور آپ دعا میں گڑگڑاتے اور

رمضان کی حرص کرتے۔)

نیز حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرات تو ہمیشہ ہی کرتے تھے؛ مگر رمضان میں اس کثرت کے ساتھ کرتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ آپ رمضان میں اللہ کی طرف سے جو رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں، ان سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔ (۱)

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے رحمت کی ہوا ہر اچھے اور برے سب پر یکساں چلتی اور ان کو فائدہ دیتی ہے، اسی طرح آپ بھی ہر کس و نا کس کو اپنی سخاوت سے فیض یاب کرتے تھے۔

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ خبر دے کر کہ رمضان میں ایک فرض ستر فرضوں کے برابر اور نفل فرض کے برابر ثواب کا مستحق ہوتا ہے، رمضان میں نیکی میں اضافے کی طرف ترغیب دی ہے۔

پھر احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان مبارک کا ورود مسعود ہی اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں نیکی کر کے آدمی اپنی مغفرت کا سامان تیار کر لے، چنانچہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منبر کے قریب ہو جاؤ، وہ کہتے ہیں کہ ہم منبر کے قریب ہو گئے، جب آپ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا اور جب تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا، حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ منبر سے بعد خطبہ اترے تو ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آج ہم نے آپ سے ایک ایسی بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت

(۱) بخاری: ۱۷۶۹، مسلم: ۴۲۶۸، نسائی: ۲۰۶۸، احمد: ۳۲۵۰، ابن خزیمہ: ۱۹۳/۳،

ابن حبان: ۲۲۵/۸

جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہو جائے جس نے رمضان کو پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہیں ہوئی، اس پر میں نے آمین کہی، اور جب میں نے دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہو جائے جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے، اس پر میں نے آمین کہی، اور جب میں نے تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہو جائے جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو ان کے بڑھاپے میں پائے پھر بھی وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائیں، اس پر میں نے آمین کہی۔ (۱)

الغرض ہر نیکی رمضان میں کثرت کے ساتھ ہونا چاہئے؛ تاکہ مغفرت کا سامان بن جائے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے رمضان ہمیں عطا فرماتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ میں اس رسالے کی ابتدا میں احادیث نقل کر دی ہیں، ان کو دوبارہ پڑھ لیا جائے۔

لیلۃ القدر کا بیان

ماہ رمضان المبارک میں ایک رات آتی ہے جسے قرآن کریم نے ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے اور اس کو لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ اس رات کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ رمضان میں آتی ہے اور یہ کہ قرآن نے اس کا ذکر بڑے اونچے الفاظ میں کیا ہے اور اس کو ایک ہزار مہینوں سے افضل و بہتر قرار دیا ہے۔

(۱) مستدرک: ۴/۱۷۰، معجم کبیر: ۱۹/۱۲۲، شعب الایمان: ۲/۲۱۵، حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے۔

چناں چہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ. وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ. تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ. سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾
(القدر: ۳۰)

(ہم نے اس (قرآن) کو اتار الیلۃ القدر میں اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ لیلۃ القدر ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس (رات) میں فرشتے اور روح (جبرئیل) اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں ہر کام پر، سلامتی ہے یہ رات صبح کے نکلنے تک۔)

یہاں چند اہم امور کی طرف نشان دہی کی جاتی ہے، جن کا تعلق لیلۃ القدر سے ہے: (۱) حضرات مفسرین نے اس کی شان نزول میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر کا یہ عطیہ امت محمدیہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور امت کو اس سے مشرف نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ابن ابی حاتم نے حضرت علی و عروۃ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے ایک دن بنی اسرائیل کے بزرگوں کا ذکر کیا، جنہوں نے اسی برس تک اللہ کی اس طرح عبادت کی کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی کوئی گناہ نہیں کیا، آپ ﷺ نے ان چاروں کا نام بتایا کہ وہ حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل بن العجو ز اور حضرت یوشع بن نون علیہم السلام تھے، اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے محمد! ﷺ آپ کی امت ان افراد کی عبادت پر تعجب کر رہی ہے کہ انہوں نے

اسی برس عبادت کی، اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس سے بھی بہتر چیز نازل کی ہے، پھر سورہ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ پڑھی، پھر فرمایا کہ یہ لیلۃ القدر اس سے افضل ہے جس پر آپ نے اور آپ کی امت نے تعجب کیا تھا۔ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرور ہوئے۔ (۱)

یہ عظیم و مبارک رات کب آتی ہے؟ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں اس بارے میں چھالیس (۴۶) اقوال اور ان کے دلائل کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جمہور علما نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے، اور اس میں بھی طاق راتوں میں ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:
 «تَحْرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوَتَرِ مِنَ الْعَشْرِ وَالْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ.» (۲)

”لیلۃ القدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو۔“
 اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْتَمَسُوَهَا فِي الْعَشْرِ وَالْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي تَاسِعَةٍ تَبْقَى فِي سَابِعَةٍ تَبْقَى فِي خَامِسَةٍ تَبْقَى.» (۳)
 (لیلۃ القدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو، وہ نویں رات

(۱) درمنثور: ۵۶۸/۸، روح المعانی: ۲۲۲/۳۰، قرطبی: ۱۳۲/۲۰

(۲) بخاری: ۱۸۷۸، مسلم: ۱۹۹۸، ترمذی: ۷۲۳، احمد: ۲۳۱۵۷

(۳) بخاری: ۱۸۸۱، ابوداؤد: ۱۱۷۳، احمد: ۱۹۴۸

میں جونچ جائے، ساتویں رات میں جونچ جائے، پانچویں رات میں
جونچ جائے نویں دن.....“۔)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد مروی
ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرہ رمضان میں آتی ہے، نیز یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آخری عشرہ
میں بھی وتر یعنی طاق راتوں میں زیادہ امکان ہے۔

پھر بعض روایات میں ستائیس رمضان کی شب میں لیلۃ القدر ہونے کا ذکر بھی آیا
ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے لیلۃ القدر کے بارے میں
رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

« لیلۃ القدر لیلۃ سبع وعشرین . » (۱)

(لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہے۔)

اسی طرح بعض صحابہ سے بھی مروی ہے، چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ جانتے ہیں کہ لیلۃ القدر رمضان میں
ہوتی ہے اور رمضان کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے اور یہ کہ وہ ستائیسویں رات میں ہوتی
ہے، پھر خود قسم کھا کر فرمایا کہ وہ بلا استثناء و بلا تخلف ستائیسویں میں ہوتی ہے۔ (۲)

مگر چوں کہ دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ستائیسویں ہی میں یہ متعین نہیں
ہے، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بخاری میں ایک قول ستائیسویں کا اور دوسرا
چوبیسویں کا مروی ہے، پھر علما نے ان کے اقوال کی توجیہ و تطبیق میں بھی لمبا کلام کیا
ہے، پھر مسلم میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے دیکھا کہ لیلۃ القدر ستائیسویں میں ہے،

(۱) ابوداؤد: ۱۱۷۸ (اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)

(۲) مسلم: ۱۲۷۲، ابوداؤد: ۱۱۷۰۱، ترمذی: ۷۲۳

اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی تمہاری طرح دکھایا گیا ہے، لہذا تم آخری عشرہ میں سے طاق راتوں میں اس کو تلاش کرو۔ (۱)

اس میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ تسلیم کر کے کہ ستائیسویں میں لیلة القدر ہوئی، پھر بھی فرمایا کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ معلوم ہو کہ دوسری راتوں میں ہونے کا بھی امکان ہے، لہذا آخری عشرہ میں تلاش جاری رکھنا چاہئے۔

(۳) روایات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس عطیہ خداوندی سے مقصود یہ ہے کہ امت محمدیہ اس رات محض اللہ کی عبادت و اطاعت میں لگی رہے اور ایک رات کے اس عمل سے کچھلی اُمتوں کے ان حضرات کا ثواب حاصل کر لے جنہوں نے اسی اسی برس اللہ کی عبادت و اطاعت میں زندگی بسر کی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کی ترغیبات و تلقینات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس رات اللہ کی عبادت میں اشتغال و انہماک ہونا چاہئے۔
حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« من قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من

ذنبه. » (۲)

جو شخص لیلة القدر میں قیام کرے گا ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے، اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیں گے۔
اس سے معلوم ہوا کہ لیلة القدر میں قیام یعنی نماز، سب سے افضل عبادت ہے؛

(۱) مسلم: ۱۹۸۷

(۲) بخاری: ۳۴، مسلم: ۱۲۶۸، ترمذی: ۶۱۹، نسائی: ۲۱۷۳، ابوداؤد: ۱۱۶۵، احمد: ۶۹۷۹

لیکن اگر کوئی دوسری عبادت میں بھی لگا رہے تو بھی مضائقہ نہیں۔

اس حدیث سے لیلۃ القدر میں عبادت و اطاعت کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رغبت اسی لیے دلائی جاتی ہے کہ یہ کام اس موقع پر کرنے کا ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ عبادت و اطاعت کی رات ہے۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں تو اس میں کیا کہوں؟ فرمایا کہ یہ دعا کرو:

« اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا. » (۱)

اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے، لہذا اہم کو معاف فرما۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر میں ایک کام اللہ سے دعا مانگنا بھی ہے، جس میں عاجزی و انکساری، انا بت و توجہ الی اللہ کے عناصر شامل ہوں، ان مقاصد کے لیے ہمیں لیلۃ القدر عطا فرمائی گئی ہے۔

(۴) اس رات میں عبادت کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے جتنا اس کو ملتا ہے جو ہزار ماہ عبادت کرتا رہا۔ ایک ہزار مہینے کے ۸۳ برس اور چار ماہ ہوتے ہیں؛ مگر معلوم ہونا چاہئے کہ اس رات میں جس طرح نیکی کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، گناہ پر عذاب بھی زیادہ ہوتا ہے، بعض لوگ اس رات میں تفریح و ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں، بعض لوگ پوری رات خرید و فروخت کر کے گزار دیتے ہیں، یہ بڑی بری بات ہے۔

(۵) غنیۃ الطالبین میں ایک لمبی حدیث نقل کی گئی ہے:

(۱) ترمذی: ۳۲۳۵، ابن ماجہ: ۳۸۴۰، احمد: ۲۲۲۱۵

لیلۃ القدر میں اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَامُ سدرۃ المنتہی کے ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ زمین پر آتے ہیں اور ان سب کے ہاتھوں میں نور کی جھنڈیاں ہوتی ہیں یہ فرشتے ان جھنڈیوں کو چار مقامات پر گاڑ دیتے ہیں، کعبۃ اللہ کے پاس، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس، بیت المقدس کے پاس اور کوہ طور کے پاس، پھر حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَامُ حکم دیتے ہیں کہ زمین پر منتشر ہو جاؤ، پس یہ فرشتے منتشر ہو جاتے ہیں اور ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی گھر کوئی پتھر، کوئی کشتی نہیں چھوڑتے جہاں کوئی مومن بندہ یا مومنہ بندی ہو۔ سب جگہ چلے جاتے ہیں؛ مگر اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا خنزیر ہو، یا شراب ہو یا زنا کر کے کوئی ناپاک آدمی ہو یا جان دار کی تصویر ہو، یہ فرشتے اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے اور امت محمدیہ کے لیے استغفار کرتے ہیں، جب صبح ہو جاتی ہے تو آسمانوں کی طرف چلے جاتے ہیں، (پھر آگے چل کر ہے) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے امت محمدیہ کے لیے میرے پاس ایسی چیزیں رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر اس کا خطرہ گذرا۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں جہاں ہوتی ہیں وہاں فرشتے نہیں آتے، اور اس عظیم رات میں بھی وہ گھر جہاں یہ چیزیں ہوں فرشتوں سے محروم ہوتا ہے اور وہاں کے لوگ ان کی دعاؤں سے محروم ہوتے ہیں۔

عید و صدقہ فطر

رمضان کے ختم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل اسلام کو ”عید الفطر“ کے عظیم و خصوصی تحفہ و عطیہ سے نوازا جاتا ہے، جو درحقیقت ان کے رمضان کے روزوں اور دیگر عبادات کے انعام کے طور پر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

”جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں اور فرشتے اتر کر تمام گلیوں اور راستوں پر کھڑے ہو جاتے اور پکار کر کہتے ہیں کہ اے امت محمدیہ اس کریم رب کی درگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے بڑے قصور معاف فرما دینے والا ہے، پھر جب لوگ عید گاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ اس مزدور کا کیا بدلہ ہے جس نے پورا کام کیا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی پوری مزدوری دے دی جائے، اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! گواہ رہو کہ میں نے رمضان کے روزے اور تراویح کے بدلہ ان لوگوں کو اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی، پھر آخر حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے فرماتے ہیں کہ اب تم بخشے بخشائے لوٹ جاؤ، میں تم سے راضی ہو گیا۔“ (۱)

ایک اور حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور وہاں کے لوگوں کے نزدیک دو دن ایسے

تھے جن میں وہ کھیل کود کرتے تھے، آپ نے ان سے معلوم کیا کہ یہ دودن کیا ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ان دودنوں میں ہم زمانہ جاہلیت سے کھیلتے آرہے ہیں، (یعنی عید مناتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَبَدَ لَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِنْهَا يَوْمَ الْاضْحَى وَيَوْمَ

الْفِطْرِ.» (۱)

(اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان دودنوں کے بدلہ ان سے بہتر دو

دن عطا عطا کئے ہیں، یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر۔)

اس سے معلوم ہوا کہ غیروں کی عید میں اور ہماری عید میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری عید اللہ کی جانب سے مقرر کی ہوئی ہے، اور غیروں کی عید ان کی اپنی ایجاد ہے۔

عید کے چند احکام و آداب

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید

کے دن لال چادر پہنتے تھے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زینت و تجل کا اختیار کرنا سنت ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن لال چادر کا اہتمام فرماتے تھے، اور اس لال چادر سے مراد ایسی چادر ہے جس میں لال لال دھاریاں ہوں، پوری لال اس سے مراد نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ نے زاد المعاد میں بیان فرمایا ہے۔

بہر حال حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زیب و زینت کا اہتمام کرنا

(۱) ابو داؤد: ۱/۱۶۱، نسائی: ۱/۲۳۱، اس کی سند صحیح ہے، بلوغ المرام: ۳۵

(۲) مجمع الزوائد: ۱/۲۲۱

چاہئے؛ مگر اس میں غلو نہ کرے کہ صرف کپڑوں اور جوتوں کی فکر میں پڑا رہے؛ بل کہ اپنے کپڑوں میں سے جو عمدہ ہیں ان کو استعمال کرے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول امام بیہقی نے بہ سند صحیح نقل کیا ہے کہ وہ عیدین میں اپنے سب سے عمدہ و بہتر کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔ (۱)

(۲) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر و عید الاضحیٰ میں غسل فرمایا کرتے تھے۔ (۲)

اور حضرت فاکہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر و عید الاضحیٰ اور عرفہ کے دنوں میں غسل فرمایا کرتے تھے۔ (۳)

فقہائے کرام نے بھی لکھا ہے کہ عید کے دن غسل کرنا مستحب ہے، اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن غسل فرماتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح جمعہ کے دن اجتماع ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے احادیث میں غسل کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح عید میں بھی اجتماع ہوتا ہے تو عید کے دن بھی اس کی بنا پر پاکی صفائی کا اہتمام پسندیدہ ہے۔ (۴)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نہیں جاتے تھے جب تک کہ کھجور نہ کھاتے تھے۔ (۵)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر

(۱) فتح الباری: ۲/۲۳۹

(۲) ابن ماجہ: ۱۳۰۵

(۳) ابن ماجہ: ۱۳۰۶، احمد: ۱۶۱۲۱

(۴) قالہ صاحب الہدایہ: ۱/۱۵۳

(۵) بخاری: ۹۰۰، ترمذی: ۲۹۸، ابن ماجہ: ۱۷۴۲، احمد: ۱۱۸۲۰

کے دن نہیں نکلتے تھے جب تک کہ نہ کھا لیتے اور عید الاضحیٰ میں کھاتے نہیں تھے جب تک کہ عید کی نماز نہ پڑھ لیتے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عید الفطر میں عید گاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے، بہتر یہ ہے کہ کھجور کھائیں اور بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ تین، پانچ یا سات کھجور کھاتے تھے یا اس سے کم یا زیادہ؛ مگر طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔ (۲)

لہذا طاق عدد کھجور استعمال کئے جائیں اور بعض علما نے مطلق میٹھی چیز کو مستحب قرار دیا ہے، ابن حجر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ بعض تابعین نے کسی بھی میٹھی چیز جیسے شہد کھانے کو پسند کیا ہے، اور ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن قرۃ اور ابن سیرین وغیرہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ (۳)

اور عید الفطر میں کھا کر جانے کی حکمت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ عید کی نماز تک روزہ لازم ہے، اور بعض نے یہ فرمایا کہ اس میں یہ حکمت ہے کہ روزوں کے بعد جب عید کے دن روزہ نہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا تو یہ بات مستحب قرار پائی کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں جلدی کرتے ہوئے کچھ کھالے۔ (واللہ اعلم)

انتباہ: عید الفطر کی صبح عوام میں سویاں (شیر خورما) پکانے کا رواج ہے، اس کو ضروری خیال کرنا، اور عید کے دن اس کی تخصیص والتزام کرنا غلط ہے، حدیث سے تو کھجور کا ثبوت خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے، اگر میسر نہ آئے تو کسی اور میٹھی چیز کو استعمال

(۱) احمد: ۱۱۸۲۰، ترمذی: ۲۹۷، ابن ماجہ: ۱۷۶۱

(۲) فتح الباری: ۲/۴۴۷

(۳) فتح الباری: ۲/۴۴۷

کیا جاسکتا ہے خواہ وہ شیر خور ماہویا کچھ اور؛ مگر شیر خور ماہی کو مخصوص طور پر اہتمام والتزام کے ساتھ پکانا من گھڑت بات ہے، احقر نے اس مسئلہ پر اپنے رسالہ ”منکرات رمضان“ میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔

(۴) حضرت زہری سے مرسل روایت ہے کہ نبی کریم عید الفطر میں نکلتے تھے اور اپنے گھر سے نکلنے کے وقت سے پہلے عید گاہ جانے تک تکبیر پڑھتے تھے۔ (۱)
ائمہ احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عید گاہ کے راستے میں تکبیر کہتے ہوئے جانا چاہئے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی تھا جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بہ روایت دارقطنی و بیہقی نقل فرمایا ہے۔ (۲)

(۵) حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ عید گاہ تشریف لے گئے عید الفطر یا عید الاضحیٰ کا موقعہ تھا، امام نے تاخیر کر دی، تو فرمایا کہ ہم تو اس وقت تک فارغ ہو جایا کرتے تھے، اور یہ تسبیح (یعنی نفل نماز) کا وقت تھا۔ (۳)
علمائے لکھا ہے کہ عید الاضحیٰ میں عید الفطر کی بہ نسبت جلدی جانا چاہیے، عید الفطر میں اس وقت جائے جب کہ سورج دو نیزے کی بہ قدر بلند ہو جائے اور عید الاضحیٰ میں اس وقت جب کہ سورج ایک نیزہ بلند ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے علاقوں میں جو عام طور پر عید الفطر کی نماز بہت تاخیر سے پڑھتے ہیں، یہ اچھا نہیں ہے اور عید الاضحیٰ کو تاخیر سے پڑھنا تو اور بُرا ہے۔
(۶) اصحاب صحاح اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

(۱) تلخیص الحبیر: ۴۳/۱

(۲) الدرایہ مع الہدایہ: ۱۵۳/۱

(۳) ابوداؤد: ۹۶۰، ابن ماجہ: ۱۳۰۷

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو رکعتیں (عید کی)

پڑھیں اور ان سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھی اور نہ بعد میں پڑھی۔“ (۱)
اس سے معلوم ہوا کہ عید گاہ میں صرف دو رکعت عید کی نماز پڑھی جائے گی، کوئی اور نماز نہ اس سے پہلے ہے نہ اس کے بعد۔

(۷) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف نکلتے تھے الخ۔ (۲)

ابن حجر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے عید گاہ جانے کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے، اور اس پر کہ عید کی نماز عید گاہ میں جا کر پڑھنا، مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔ (۳)

البتہ کوئی عذر ہو تو مسجد میں بھی عید کی نماز ادا کی جاسکتی ہے جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ایک دفعہ بارش ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز مسجد میں پڑھائی۔ (۴)

(۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ عید کے لیے پیدل جائے اور جانے سے پہلے کچھ کھالے۔ (۵)

اسی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی روایت ہے

(۱) بلوغ المرام: ۳۵

(۲) بخاری: ۱۳۶۹، نسائی: ۱۵۵۸

(۳) فتح الباری: ۲/۴۵۰

(۴) ابوداؤد: ۹۸۰، ابن ماجہ: ۱۳۰۳

(۵) ترمذی: ۴۸۷

کہ حضور اکرم ﷺ عید کے لیے پیدل جایا کرتے تھے۔ (۱)
(۹) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید گاہ کو ایک راستہ سے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس ہوتے۔ (۲)

اس میں کیا حکمت ہے؟ ابن حجر رحمہ اللہ نے علما سے بیس سے زائد اقوال اس سلسلہ میں ذکر کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل اسلام کی شان و شوکت بتانے کے لیے ایسا فرمایا کہ لوگ جب دیکھیں گے کہ مسلمان ادھر کے راستہ پر بھی تھے، اب یہاں بھی ہیں تو کثرت سے مرعوب ہوں گے، ایک حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ راستہ گواہ بن جائے، جہاں جہاں سے اللہ کے لیے گزرنا ہو گا وہ راستہ چلنے والے کے حق میں گواہی دے گا۔ (واللہ اعلم)

(۱۰) ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت جبیر بن نفیر سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب عید کے دن ملاقات کرتے تو آپس میں ایک دوسرے کو یوں کہتے ”تَقَبَّلَ اللہ مِنَّا وَ مِنْكَ“ یعنی اللہ ہمارے اور تمہارے اعمال کو قبول کرے۔ (۳)

امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ادھم جو حضرت امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز کے غلام تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز کو عیدین کے موقعہ پر ”تَقَبَّلَ اللہ مِنَّا وَ مِنْكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ“ کہتے تھے اور آپ یہی جملہ ہم کو جواب میں کہتے اور اس پر نکیر نہ کرتے تھے۔

معلوم ہوا کہ عیدین کے موقعہ پر صحابہ اور ہمارے اسلاف آپس میں اس طرح

(۱) ابن ماجہ: ۱۲۸۴

(۲) بخاری: ۹۳۳، ترمذی: ۴۹۶، ابن ماجہ: ۱۲۹۱، احمد: ۸۱۰۰

(۳) فتح الباری: ۲/۴۲۶، یہ روایت حسن ہے۔

ایک دوسرے کو دعا دیتے تھے، لہذا ہمیں بھی اسی کو اختیار کرنا چاہئے یہی بڑی مبارک بادی ہے، اور کوئی عید مبارک کہتا ہے تو اس کا بھی حاصل یہی ہے؛ لیکن اسلاف کے الفاظ میں بھی برکت ہوتی ہے۔

صدقہ فطر

رمضان جب ختم ہوتا ہے اور عید کا دن آتا ہے، تو رمضان کے شکر یہ میں عید گاہ جانے سے پہلے صدقہ فطر بھی ادا کرنا ضروری ہے۔ پہلے چند حدیثیں ملاحظہ کیجئے:

(۱) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

”فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكْرِ وَالْأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ“ (۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو کو مسلمانوں میں سے ہر غلام و آزاد، مرد و عورت، بچے اور بوڑھے پر صدقہ فطر میں دینا فرض قرار دیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ لوگوں کے عید کی نماز کو نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔)

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کی چیزوں سے صدقہ فطر ہر چھوٹے اور بڑے، آزاد و غلام کی

(۱) بخاری: ۱/۲۰۴، رقم: ۱۴۳۲، مسلم: ۱/۳۱۷، رقم: ۹۸۴، و ۹۸۶، ابو داؤد: ۵/۱۶۱۱، نسائی: ۲۵۰۴، صحیح ابن خزیمہ: ۴/۸۷ وغیرہ

طرف سے نکالتے تھے، ایک صاع کھجور، ایک صاع پنیر اور ایک صاع جو، ہم اسی طرح نکالتے تھے یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گیہوں کا آدھا صاع کھجور کے ایک صاع کے برابر ہے، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں پہلے جیسا نکالتا تھا ویسا ہی نکالوں گا۔ (۱)

فوائد و مسائل

(۱) پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر کے ہر چھوٹے بڑے، غلام و آزاد پر صدقہ فطر ہے، البتہ نابالغ اولاد کی طرف سے خود ان کے مال سے یا اپنے مال سے جب کہ ان کا مال نہ ہو، باپ ادا کرے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کھجور یا جو کے حساب سے ایک صاع صدقہ فطر میں دینا چاہیے اور دوسری حدیث سے بھی اس کا علم ہوا۔

اور دوسری حدیث سے مزید یہ معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام طور پر صرف تین چیزوں سے صدقہ فطر نکالا جاتا تھا، کھجور، پنیر اور جو، مگر بعد میں جب گیہوں کا عام رواج ہو گیا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کھجور کے ایک صاع کا مقابلہ گیہوں کے آدھے صاع سے ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ گیہوں مہنگی ہے، لہذا اکثر صحابہ و تابعین نے اسی کو اختیار فرمایا، البتہ بعض صحابہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا، اور فرمایا کہ نہیں ہم گیہوں سے بھی ایک ہی صاع دیں گے، لہذا یہ اختلافی مسئلہ ہے، احناف نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل اختیار فرمایا ہے، لہذا گیہوں نصف صاع یا اس کی قیمت صدقہ فطر میں دینا چاہئے۔

(۱) بخاری: ۱۴۱۲، مسلم: ۱۶۴۱، نسائی: ۲۴۶۵، ابو داؤد: ۱۳۷۷، ترمذی: ۶۰۹، ابن

ماجدہ: ۱۸۱۹، احمد: ۱۱۴۹۶

اب رہی یہ بات کہ نصف صاع آج کے حساب سے کتنے کلو ہوتے ہیں؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ”اوزان شرعیہ“ میں اس کی تحقیق کر کے بتایا ہے کہ نصف صاع پونے دو سیر کے برابر ہوتا ہے اور اس کو اگر کلو، گرام کے حساب میں تبدیل کریں تو پونے دو کلو سے کچھ کم ہوتے ہیں، اور احتیاطاً پونے دو کلو دے دینا چاہئے، جیسا کہ میرے استاذ حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب زید مجدہ نے اپنے رسالہ ”امداد لاوزان“ میں تحقیق فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو بعض چارٹ میں صدقہ فطر کی مقدار سوا دو کلو یا ڈھائی کلو لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے، البتہ کوئی اپنی خوشی سے زیادہ دے دے، تو درست ہے؛ مگر وجوب صرف پونے دو کلو کا ہوگا۔

(۲) نیز اس پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر نماز عید کو جانے سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس نے صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ادا کیا تو وہ صدقہ مقبولہ ہے، اور جو بعد نماز ادا کرے، تو وہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔ (۱)

لہذا عہد گاہ جانے قبل صدقہ دینا چاہئے، اگر کسی نے عید گاہ جانے سے قبل ادا نہ کیا تو اس سے یہ معاف نہ ہوگا؛ بل کہ بعد میں دینا پڑے گا۔ (۲)

اگر صدقہ فطر عید سے دو تین دن پہلے ہی دے دیں تو اور اچھا ہے، کیوں کہ اس میں مساکین و فقرا کے لیے سہولت ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا پہلے سے انتظام کر سکیں گے، اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ ایک دو دن پہلے صدقہ فطر ادا کر دیتے تھے۔

(۱) ابو داؤد: ۱۳۷۱، ابن ماجہ: ۱۸۱۷

(۲) ہدایہ: ۱/۱۹۱

چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت نافع سے نقل کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں صدقہ فطر ایک دو دن پہلے دے دیا جاتا تھا۔ (۱)

فتح الباری میں ہے کہ ابن خزمیہ کی روایت میں آیا ہے کہ ایوب رضی اللہ عنہ نے نافع سے پوچھا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صدقہ فطر کب تک ادا کرتے تھے، نافع نے فرمایا کہ جب صدقہ وصول کرنے والا عامل وصولی بند کرتا اس وقت تک ادا کر دیتے، پوچھا کہ عامل کب بند کرتا تھا، بتایا کہ عید سے ایک یا دو دن پہلے۔ (۲)

اور امام مالک رحمہ اللہ کی موطا میں یہ روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما وصول کرنے والوں کے پاس صدقہ فطر عید سے دو تین دن قبل بھیج دیتے تھے۔ (۳)

(۳) صدقہ فطر ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو آزاد ہو اور حاجت اصلیہ سے زائد نصاب کا مالک ہو اور نصاب وہی ہے جو زکاة کا ہے یعنی ساڑھے سات تولے (یعنی ۸۷ گرام، ۴۷۹ ملی گرام) سونایا ساڑھے باون تولے (یعنی ۶۱۲ گرام، ۳۵ ملی گرام) چاندی ہو یا اس کے برابر روپیہ پیسہ ہو، یا زائد از ضرورت مال سامان ہو، تو اس پر صدقہ فطر واجب ہے، اگرچہ اس پر ایک سال نہ گزرا ہو، اور اگرچہ وہ مال تجارت کا بھی نہ ہو۔ (۴)

(۴) اگر کسی کے پاس زکاة کے مال کے برابر مال و اسباب ہے؛ لیکن وہ اس کی ضرورت کا ہے، زائد نہیں، تو اس پر صدقہ فطر واجب نہیں۔ (۵)

(۱) بخاری: ۱/۲۰۵

(۲) فتح الباری: ۳/۳۷۶

(۳) فتح الباری: ۳/۳۷۶

(۴) البحر الرائق: ۲/۲۷۱، درمختار مع شامی: ۲/۲۶۰

(۵) البحر الرائق: ۲/۲۷۱، درمختار مع شامی: ۲/۲۶۰

(۵) اگر کوئی قرض دار ہے تو قرض کے علاوہ جو مال ہے وہ اگر زکاۃ کے مال کے برابر ہے، تو صدقہ فطر واجب ہے، ورنہ نہیں۔ (۱)

(۶) بہتر ہے کہ عید گاہ جانے سے پہلے صدقہ دے دے، اگر پہلے نہ دیا تو بعد میں دے دے، یہ معاف نہیں، کبھی نہ کبھی اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

(۷) صدقہ فطر اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے دینا واجب ہے، بالغ اولاد کی طرف سے دینا واجب نہیں؛ بل کہ وہ خود اگر مال دار ہیں تو اس پر واجب ہے، البتہ بالغ اولاد میں کوئی پاگل ہو تو باپ اس کا بھی صدقہ فطر نکالے گا۔ (۲)
(۸) کسی نے رمضان میں صدقہ فطر دے دیا تو بھی ادا ہو گیا، دوبارہ دینا واجب نہیں۔ (۳)

(۹) جو رمضان کے روزے نہ رکھ سکا، اس پر بھی یہ صدقہ فطر واجب ہے۔ (۴)
(۱۰) صدقہ فطر میں پونے دو سیر گیہوں یا گیلہوں کا آٹا یا ستویا ستوکا آٹا دینا چاہئے، یا اتنی قیمت دینا چاہئے؛ بل کہ یہی بہتر ہے، (اس کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے)
(۱۱) صدقہ فطر ان لوگوں کو دینا چاہئے جن کو زکاۃ دینا درست ہے، یعنی فقیر، مسکین، مسافر وغیرہ، اور جو سید ہوں یا مال دار ہوں ان کو جس طرح زکاۃ دینا جائز نہیں اسی طرح ان کو صدقہ فطر دینا جائز نہیں، اسی طرح ماں باپ کو، اولاد کو میاں بیوی کو، دینا بھی جائز نہیں، ہاں! کافر کو صدقہ فطر دینا بعض کے نزدیک جائز ہے، اور بعض

(۱) البحر الرائق: ۲/۲۷۱، درمختار مع شامی: ۲/۲۶۰

(۲) البحر الرائق: ۲/۲۷۱، درمختار مع شامی: ۲/۲۶۱

(۳) البحر الرائق: ۲/۲۷۵

(۴) درمختار مع شامی: ۲/۳۶۱

کے نزدیک ناجائز ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ان کو نہ دیا جائے۔ (۱)
 (۱۲) ایک آدمی کا صدقہ فطر ایک فقیر کو دینا یا تھوڑا تھوڑا کئی فقیروں کو دینا یا کئی
 آدمیوں کا صدقہ فطر ایک ہی فقیر کو دینا سب درست ہے؛ لیکن کئی آدمیوں کا صدقہ
 مل کر اتنا نہ ہو جائے جو نصاب فطر یا نصاب زکاۃ کے برابر ہو۔ (۲)

فقط

محمد شعیب اللہ خان
 (مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)



(۱) درمختار مع شامی: ۳۶۹/۲

(۲) البحر الرائق: ۲/۲۷۵